اشاعتِ خاص

حسن البنّا شہید

ماہنامہ

ترجمان القرآن

اللہ غایتنا
الرسول زعیمنا
القرآن دستورنا
الجہاد سبیلنا
الشہادة امنیتنا

مدیر: پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ ترجمان القرآن

جلد ۱۳۴، عدد ۵-۶، ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ، مئی ۲۰۰۷ء

مدیر
پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر
مسلم سجاد

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۷۹۰
فون: ۵۴۲۵۳۵۶ - ۰۴۲
فیکس: ۵۴۳۲۱۹۴ - ۰۴۲
ای میل: tarjuman@wol.net.pk

انتظامی امور

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور - ۵۴۶۰۰
فون: ۷۵۸۷۹۱۶ - ۰۴۲
۷۰۶۵۷۶۵ - ۰۴۲
فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ - ۰۴۲
ای میل: tarjuman@tarjumanulquran.org
ویب: www.tarjumanulquran.org

زر سالانہ: ۲۵۰ روپے
۵ سال کے لیے: ۱۰۰۰ روپے
معاونِ خصوصی: ۳۰۰۰ روپے

بنگلہ دیش، بھارت ۹۰۰ روپے
ایران، مشرق وسطٰی، مشرق بعید، یورپ، افریقہ ۱۲۰۰ روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ۱۵۰۰ روپے

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن
A/c No. 1957-3, UBL, Ichhra Br. LHR

سرورق: راشد الیاس مہر

اشاعتِ خاص

بسلسلہ صد سالہ یومِ ولادت حسن البنا شہیدؒ

۱۹۰۶ء - ۲۰۰۶ء

مدیران اشاعتِ خاص

عبدالغفار عزیز

سلیم منصور خالد

اشاعتِ خاص: ۹۰ روپے
بیرونی اڈیشن: ۱۲۰ روپے

زیر اہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

۶۰ سال پہلے

نصف صدی پہلے کا 'گلوبل ولیج'

سائنس، جدید وسائل، تمدن اور موجودہ ذرائع آمدورفت نے دنیا کے مختلف ممالک کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کردیا ہے اور آپس میں اس طرح ملا دیا ہے کہ وہ تمام جغرافیائی اور قدرتی حدبندیاں ختم ہوگئی ہیں جو اب تک مختلف ممالک اور ان میں بسنے والی قوموں کو ایک دوسرے سے الگ کیے ہوئے تھیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ یہ پورا کرۂ ارض (یعنی زمین) ایک ملک بن گیا ہے اور وہ قطعات جن کو ہم پہلے الگ الگ ممالک خیال کرتے تھے، اس نئے ملک کے صوبے یا اضلاع ہیں...... مختلف ملکوں اور قوموں کے لوگ ضرورت کے وقت ایک جگہ اس طرح جمع ہوجاتے ہیں، جس طرح ایک محلے میں بسنے والے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر باہر گلی میں جمع ہوجاتے ہیں۔

اس تمدنی اور علمی ترقی اور آپس کے میل ملاپ کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ملکوں اور ملکوں میں، قوموں اور قوموں میں محبت، برادرانہ برتاؤ، خیرخواہی اور تعاون کے جذبات زیادہ سے زیادہ پیدا ہوتے اور اخلاق وانسانیت دوسرے تمام حیوانی جذبات پر غالب آجاتے۔ لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ اس کے بالکل برعکس مختلف ممالک اور قومیں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے اور ملیامیٹ کرنے پر اس طرح تلے ہوئے ہیں گویا کہ وہ بھوکے بھیڑیے ہیں جن کو جغرافیائی حدبندیوں کی آہنی سلاخوں نے اس دنیا کے چڑیا گھر کے الگ الگ حصوں میں بند کر رکھا تھا، اور اب ان سلاخوں کے ٹوٹتے ہی وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے ہیں...... آخر ایسا کیوں ہے؟ اور اس کی کیا وجہ ہے کہ قوم ہو یا فرد، جو جس قدر زیادہ متمدن، ترقی یافتہ اور ظاہر میں دیوتا صورت نظر آتا ہے، وہ اسی قدر زیادہ انسانی اوصاف سے خالی اور اپنے ہم جنسوں کے لیے کتوں سے زیادہ خطرناک اور وحشی درندہ ثابت ہو رہا ہے؟ ان کے شخصی کارناموں، اجتماعی پروگراموں اور اندرونی اور بیرونی پالیسیوں کو دیکھ کر گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید کُل جنگلی چیتے اور خونخوار درندے ہیں، جو اچھی اچھی پوشاکیں پہن کر وسائل تمدن اور حکومت کی گدیوں پر قابض ہوگئے ہیں۔

اس عالم گیر خرابی اور انسانی روگ کی جڑ تلاش کرنے کے لیے آپ تھوڑا سا غور فرمائیں گے تو آپ کو یہ صاف طور پر معلوم ہوجائے گا کہ یہ سارا فساد ان غلط افکار ونظریات اور اس بے خدا فلسفۂ زندگی کا لایا ہوا ہے جو اس وقت پوری دنیا میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک وبا کی طرح پھیل گئے ہیں، اور جن کو ہر قوم اور ہر ملک کے لیڈروں اور ان کے نظام ہائے تعلیم وتربیت نے دانستہ یا نادانستہ اپنی اپنی قوموں اور ملکوں میں پلیگ کے جرثوموں کی طرح پھیلا دیا ہے۔ (میاں طفیل محمد، ترجمان القرآن، جلد ۳۰، عدد ۶، جمادی الثانی ۱۳۶۶ھ، مئی ۱۹۴۷ء، ص ۷-۸)

ترتیب

***

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزارشات

حسن البنا شہید اشاعتِ خاص

جمال بے مثال ہو تو تعریف مشکل ہو جاتی ہے، اور جمال اعمال و کردار کا ہو، تو احاطہ مشکل تر بلکہ بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ پروردگار عالم نے بنی نوع انسان میں انبیائے کرام کے علاوہ کئی ایسے مومنین صادقین پیدا فرمائے جن کا ذکرِ جمیل مشک و عنبر کی حیثیت رکھتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ان چنیدہ ہستیوں میں ایک ہستی حسن البنا شہید ہیں۔ ان کی نصف صدی پہ محیط زندگی اور پوری صدی پر محیط اثرات و ثمرات کا مطالعہ کریں، تو محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں تجدیدِ دین ہی کے لیے پیدا کیا تھا۔ ان کی ولادت کو سو برس گزرے تو ترجمان القرآن نے ان کی شخصیت و کردار اور ان کی دعوت و اثرات کا جائزہ لینے اور انھیں مزید متعارف کروانے کا مستحسن فیصلہ کیا۔ اگرچہ حسن البنا کا نام، ان کی تحریک اور جدوجہد تحریک اسلامی کے کسی بھی کارکن کے لیے اجنبی نہیں، لیکن اس سراپا عمل و اخلاص شخصیت کے کتنے ہی پہلو ایسے ہیں، جن سے اُردو کے قارئین ابھی تک ناآشنا ہیں۔ ان کے بارے میں لکھی جانے والی کتنی ہی ایسی مؤثر تحریریں ہیں، جو صرف عرب دان حلقوں تک محدود ہیں۔ ان کے تجربات، ان کی ہمہ گیر سوچ، انھیں درپیش خطرات، ان پر اور ان کے ساتھیوں پر توڑے جانے والے مظالم، کتنے ہی ایسے واقعات ہیں جن کا احاطہ کرنے کے لیے دفتروں کے دفتر درکار ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح کے نام خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوزائیدہ اسلامی ریاست پاکستان پر گزرنے والے ہر نازک لمحے سے آگاہ تھے۔ یہ نہ صرف پاکستان سے ان کی گہری محبت کا مظہر اور اس سے وابستہ اُمیدوں کی دلیل ہے بلکہ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کی مضبوط اسلامی بنیادوں کا واضح ثبوت بھی ہے۔ حسن البنا شہید کے صاحبزادے احمد سیف الاسلام البنا سے یہ قیمتی خطوط حاصل ہوئے۔

اشاعت خاص کے لیے ہم نے عالم اسلام کے دانش وروں اور اسلامی تحریک کے قائدین کو لکھنے کی دعوت دی تھی۔ اکثر ممالک اور اکثر تحریکوں کے ذمہ داران نے اپنی خصوصی تحریریں ارسال کیں۔ امام شہید کے اہلِ خانہ اور سفر و حضر میں ان کے ساتھیوں نے ان کے معمولات اور شخصیت کے گوشے وا کیے۔

امام حسن البنا شہید کی اپنی تحریریں بھی ان کے بلند علمی مقام، قابلِ رشک فکری گہرائی، باوقار اعتدال اور حیرت انگیز تنظیمی خوبیوں کو جاننے کا بہت اہم ذریعہ ہیں۔ بدقسمتی سے ابھی تک اُردو میں ان کی صرف چند تحریریں منتقل ہوسکی ہیں۔ اُمید ہے کہ شاملِ اشاعت ان کی چند نگارشات، ان کی فکر کو جاننے اور ان کی علمی وجاہت سے متعارف ہونے کا اہم ذریعہ ثابت ہوں گی۔

اس اشاعت میں آپ کچھ قدیم تحریریں بھی پائیں گے، لیکن یہ سب تحریریں اس حوالے سے تازہ اور اہم ہیں کہ ابھی تک اُردو میں شائع نہیں ہوئیں۔ عظیم شخصیات کی یہ تحریریں قاری کو ایک نیا جذبۂ عمل بخشتی ہیں۔ اس سے پہلے امام شہید کی ڈائری اور ان کے بعض خطبات اور کتابچے ترجمہ ہوکر اُن کا بھرپور تعارف کرواچکے ہیں۔ لیکن اُمید ہے کہ مطالعے کے بعد آپ کا دل بھی گواہی دے گا کہ ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ترجمان القرآن کی اشاعتِ خاص اور اتنے ہی مزید صفحات پر مشتمل کتابِ خاص سے ایک بڑا خلا پر ہوا ہے۔ خواہش تو یہ تھی کہ کتاب میں شامل تمام مضامین بھی اشاعت خاص ہی میں شامل ہوں، لیکن وسائل کی کمی نے اس خواہش کی تکمیل نہیں کرنے دی۔ ان شاء اللہ بہت جلد یہ کتاب بھی آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔

اس اشاعت خاص کی تیاری ایک بڑی سعادت ہے۔ اس میں جن احباب کا تعاون حاصل رہا، اللہ تعالیٰ انھیں اجرِعظیم سے نوازے۔ تاہم جملہ امور میں معاونت کے لیے پروفیسر خالد محمود، حافظ محمد عبداللہ، حمیداللہ خٹک، طارق زبیری، امجد عباسی، حیدر زیدی اور خلیل الرحمٰن ہمدانی کے خصوصاً شکرگزار ہیں۔ یہ اشاعت اپنے آنے والے کل کو گزرے ہوئے کل سے بہتر بنانے کا پیغام ہے۔ اب اصل سوال یہ رہے گا کہ کیا ہم نے یہ پیغام پڑھ لیا، سمجھ لیا اور بہتر کے لیے عزم باندھ لیا؟

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ – وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

عبدالغفار عزیز

۱۲ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ

البناؒ اور احیاے اسلام: یادوں کے جھروکے

پروفیسر خورشید احمد

حسن البنا شہید سے میرے تعلق کی بنیاد بڑی منفرد ہے۔ وہ اسلامی تاریخ کی ان چند مرکزی شخصیات میں سے ہیں جن سے ملاقات نہ کرنے کی حسرت ہمیشہ رہے گی۔ مجھے اپنے بچپن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا شوکت علی اور علامہ محمد اسد کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مگر مولانا محمد علی جوہر اور علامہ محمد اقبال دو ایسی شخصیات ہیں جن کو نہ دیکھنے کا قلق رہا ہے۔ اس تسلسل میں جس تیسری شخصیت کو دیکھنے کی تمنا، خواہش اور شوق رہا، وہ حسن البنا شہید تھے۔

حسن البنا کی شخصیت میں ایک غیر معمولی سحرانگیزی (charisma) اور دل کش جاذبیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حسن البنا کے قالب میں ایک ایسی بے چین روح ہے، جو اپنے رب کی خوش نودی حاصل کرنے، اس کی مرضی و ہدایت کی روشنی میں دنیا کو بدل ڈالنے اور اسے مالک و خالق کی اطاعت میں لانے کے لیے ہر آن سرگرداں اور مضطرب ہے۔ یہ کیفیت ان کے بچپن سے لے کر جوانی اور پھر شہادت کے لمحات تک موجزن نظر آتی ہے۔ مجھے بے شمار مفکرین کو پڑھنے، استفادہ کرنے، اور بہت سے اہلِ دل سے ملنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن جو کرشماتی کیفیت حسن البنا شہید کی زندگی، ان کے روز و شب اور ان کے مکالمات و معاملات میں نظر آتی ہے، اور وہ بھی نہایت فراوانی کے ساتھ، وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ اسی لیے مجھے ایسی دل آویز شخصیت کو نہ مل سکنے پر احساس تاسف ہمیشہ رہے گا۔

اخوان کے تیسرے مرشد عام جناب عمر تلمسانی مرحوم سے لے کر موجودہ مرشد عام محمد مہدی عاکف تک سبھی سے مجھے ملنے کا شرف حاصل ہے۔ کچھ سے تو خاصی قربت بھی رہی ہے، جیسے جناب استاد مصطفیٰ مشہور اور جناب مامون الہضیبی۔ مامون الہضیبی کے والد حسن الہضیبی جو حسن البنا مرحوم کے بعد دوسرے مرشد عام تھے، ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی، البتہ خط و کتابت کی سعادت حاصل ضرور ہوئی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے دور میں انھوں نے اپنی تحریروں سے بھی نوازا۔ ان مواقع کے باوجود حسن البنا جیسے عبقری قائد سے ملنے کے شوق اور نہ مل سکنے کی حسرت اپنی جگہ موجود ہے۔ انسان کسی عظیم شخصیت سے ملاقات میں کچھ حاصل کرتا ہے یا کچھ حاصل نہیں کر پاتا، یہ دوسری بات ہے، لیکن ایسے پاک طینت اشخاص اور اہل اللہ کو دیکھنا اور ان کی مجالس میں بیٹھنا بھی روحانی تعلیم و تربیت کے زمرے میں آتا ہے۔ اس اعتراف حقیقت کے ساتھ ساتھ ایک اور اعتراف بھی شاید بے محل نہ ہو۔ مجھ جیسے عقلیت زدہ انسان پر بھی یہ کیفیت بار بار گزری ہے کہ حسن البنا شہید کو اپنے قریب پایا ہے۔ ان سے صحبت اور بالمشافہہ استفادے کے باب میں محرومی کے باوجود ان سے ایک ایسی نسبت زندگی بھر محسوس کی ہے جسے روحانی ملاقات کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ ایک روحانی تجربہ ہے یا محض اپنی خواہشات کی تسکین کہ بارہا زندگی میں ان سے قربت اور ان کے حلقۂ مریداں میں شرکت کی لذت محسوس ہوئی ہے۔ یہ اللہ کا فضل اور ان کی طلسماتی شخصیت کا کرشمہ ہے۔

○ **پہلا تعارف:** حسن البنا شہید کی داستانِ حیات، مقصدِ زندگی اور دعوتی و تحریکی خدمات کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ برادرم سعید رمضان مرحوم ہیں۔ سعید رمضان، حسن البنا شہید کے نہایت قریب اور معتمد علیہ تھے۔ حسن البنا، رسالہ الشہاب نکالتے تھے، جس کی ادارت میں سعید رمضان کا اہم کردار تھا۔ وہ نہایت ذہین، صاحب علم اور دعوت کو سمجھنے والی بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ مجھے، خرم بھائی [خرم مراد] اور راجا بھائی [ظفر اسحاق انصاری] کو ان سے ملنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا شب و روز موقع ملا۔ اس طرح ہم بڑے خوش نصیب تھے کہ ہمیں ان کے بہت ہی قریبی ساتھی اور نوجوان شاگرد کے ذریعے، جو بعد میں ان کے داماد بنے، حسن البنا کی شخصیت اور ان کی فکر، اخوان کی دعوت، اخوان کے نظام تربیت اور اجتماعی جدوجہد کے اسلوب

سے واقفیت ہوئی۔ اسی طرح امام حسن البنا کے بیٹے سیف الاسلام اور نواسے ڈاکٹر طارق رمضان بن سعید رمضان سے بھی ہمیں ان کے حالات جاننے کا موقع ملا۔

سعید رمضان دسمبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئے اور پھر فروری ۱۹۴۹ء میں امام حسن البنا کی شہادت کے بعد کچھ عرصہ کے لیے یہیں مقیم ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ عرب دنیا میں پاکستان کو متعارف کروانے کے لیے گئے اور پھر ۱۹۵۱ء کی مؤتمر عالم اسلامی کی دوسری کانفرنس میں شریک ہوئے، اور اس کے معتمد عام دوم منتخب ہوئے۔ کانفرنس میں سعید رمضان کی تقریر مسحور کن تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تقریر کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا۔ عربی میں تو وہ قادر الکلام تھے ہی، لیکن انگریزی پر مکمل دسترس نہ رکھنے کے باوجود، ان کے اظہار بیان میں تاثیر کچھ کم نہ تھی۔ فکر و جذبات کا جو مؤثر اظہار ان کی خطابت میں تھا، وہ قابل رشک تھا۔ خاص طور پر نوجوانوں کو وہ مسحور کرنے اور عمل پر اُبھارنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔

پاکستان میں ان کے قیام کے دوران میں ہی چونکہ اخوان المسلمون پر پابندی لگا دی گئی تھی اور امام حسن البنا شہید کر دیے گئے تھے، اس لیے وہ یہیں ٹھیر گئے۔ آرام باغ، کراچی میں ایک فلیٹ انھوں نے کرایے پر لے لیا تھا۔ یہ فلیٹ ہماری ملاقاتوں کا مرکز بن گیا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہوگا کہ ہم ان سے نہ ملتے ہوں۔ مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم و مغفور سے جو راجا بھائی کے والد محترم اور تحریک پاکستان کے اہم قائد تھے، ان سے سعید رمضان کا غیر معمولی تعلق خاطر تھا۔ وہ مولانا انصاری صاحب سے باپ کی طرح محبت کرتے تھے اور انصاری صاحب، سعید رمضان سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ پاکستان میں قیام کے زمانے میں انھوں نے خود کو مختلف مفید کاموں میں مشغول رکھا' اور خاص طور پر کراچی کے نوجوانوں کو اسلامی مقاصد کے لیے سرگرم عمل کرنے میں کوشاں رہے۔ انھوں نے ان کی اچھی خاصی تعداد میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ریڈیو پاکستان سے اسلام اور قرآن پر عربی تقاریر کا سلسلہ شروع کیا جو عرب دنیا میں بہت مقبول ہوا۔

○ **فکر اور قلب کا راستہ**: اخوان اور حسن البنا شہید سے ہم جس راستے سے روشناس ہوئے وہ کتابی راستہ نہیں تھا۔ مولانا مودودی، میرے والد گرامی نذیر احمد قریشی مرحوم کے گہرے دوست تھے۔ اس مناسبت سے مجھے مولانا مودودی کو دیکھنے کی سعادت تو ۱۹۳۸ء میں

حاصل ہوگئی تھی، البتہ مولانا مودودی تک رسائی ان کی کتابوں ہی کے ذریعے ممکن ہوسکی۔ اس کے برعکس حسن البنا اور اخوان تک رسائی ان افراد کے ذریعے ہوئی، جنھیں حسن البنا شہید نے تیار کیا تھا۔ دونوں کے درمیان یہ ایک بڑی وجہ امتیاز ہے کہ مولانا مودودی فکر اور دماغ کے راستے، اور حسن البنا قلب اور روح کے راستے انسانوں کی زندگیوں میں داخل اور ان کی قلب ماہیت کرنے کا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ خود میری زندگی میں بھی یہ دونوں انھی راستوں سے داخل ہوئے، اور آج تک فکر اور قلب میں سمائے ہوئے ہیں۔

مولانا مودودی تحریر و تقریر میں ممتاز، اعلیٰ درجے کے منتظم، بلند پایہ مدبر اور تحریک کے قائد تھے۔ اس طرح تحریک میں ہر حیثیت سے ان کا کردار بڑا نمایاں رہا ہے۔ یہ اوصاف اپنی جگہ بڑی مرکزیت رکھتے ہیں، تاہم مولانا محترم کی شخصیت کا سب سے زیادہ غالب پہلو، ان کی فکر، ان کی تحریر اور وہ عظیم الشان لٹریچر ہے، جس نے افراد کے دل و دماغ میں طوفان بپا کیا اور ایک پوری نسل کی زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ اسی طرح اگرچہ حسن البنا شہید کی تقاریر اور کتابیں بھی ہیں اور علمی اور عملی ہر دو اعتبار سے ان کا بڑا بلند مقام بھی ہے، لیکن ان سب اوصاف کے ساتھ حسن البنا کا نمایاں ترین وصف انسان سازی ہے۔ ان کا بلند ترین کارنامہ روح سے روح کا اتصال ہے۔ بلاشبہہ اس میں دلیل کی قوت کے ساتھ عقل کو اپیل بھی شامل ہے، لیکن ان کی شخصیت، ان کی دعوت اور ان کی تحریک کا اصل ہدف انسان کا قلب ہے۔ ان کی تقریروں کو پڑھتے وقت احساس ہوتا ہے کہ: ان کی زبان کے ساتھ ان کی روح بھی بولتی تھی۔ ان کے اس خاص اسلوب اور اثر انگیزی کو روحانی ٹیلی پیتھی (spiritual telepathy) یا خیال رسائی کہا جاسکتا ہے۔

اخوان المسلمون پر لکھا وسیع لٹریچر مجھے پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ اخوان سے وابستہ اہل قلم نے بڑی مفید ذاتی یادداشتیں تحریر کی ہیں۔ یہ یادداشتیں نہ صرف تاریخی اعتبار سے، بلکہ فکری موضوعات کے لحاظ سے بھی معاصر اسلامی ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس تحریری لوازمے سے استفادے کے باوجود حسن البنا اور اخوان کو سمجھنے کے لیے جو چیز سب سے زیادہ پُرکشش ذریعہ رہی، وہ اخوان کے قائدین کی گفتگوئیں اور ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے وہ مواقع ہیں جو مجھے حاصل ہوئے۔ اس طرح ان سے کتابی سے زیادہ قلبی رشتہ قائم ہوا۔

○ **ایک سحر انگیز شخصیت:** اس تناظر میں میرے دل و دماغ پر حسن البنا شہید کی جس چیز کا سب سے زیادہ اثر ہے، وہ ان کی مسحورکن شخصیت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایسی پاک روح ہے جسے دیکھ کر اللہ کی یاد انسان کے دل میں اُتر جائے اور ایمان میں حرارت وحلاوت محسوس ہو۔ امام حسن البنا کی آپ بیتی یا دعوتی سفر کی یادداشتوں (مُذکّرات) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسی شخصیت کے حامل انسان تھے۔ انھیں پڑھتے ہوئے یہ منظر سامنے آتا ہے کہ چھے سات سال کی عمر کے بچے کا دل دینی جذبات کا اُمنڈتا ہوا سرچشمہ ہے۔ پھر یہی بچہ ۱۷، ۱۸ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے قاہرہ اور اسکندریہ کے ریستورانوں، قہوہ خانوں اور سماجی محفلوں میں، تفریحی مقامات اور مختلف لوگوں سے مذاکرات تک میں، ہر جگہ ایک ایسی بے چین روح اور محبوب شخصیت کی صورت میں نظر آتا ہے، جو اپنے مالک سے محبت اور تعلق خاطر کی لذت سے سرشار ہے۔ مگر اس شخصیت کا اس سے بھی زیادہ خوب صورت پہلو یہ ہے کہ وہ نیکی اور پاکیزگی، کامیابی اور ابدی کامرانی کی اس لذت کو اپنی ذات تک محدود کرنے کے روایتی تصور کو نہیں اپناتی، بلکہ یہ مضطرب روح، اللہ کے بندوں کو، اللہ کے غضب سے بچانے اور رب کی بندگی میں لانے کے لیے سرگرم وکوشاں ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ۲۱ سال کے اندر مصر کا ہی نہیں، بلکہ عالم عرب کا پورا فکری نقشہ بدل دیا اور دنیا میں ایک تہلکہ سا مچا دیا۔

۱۹۲۸ء میں، اسماعیلیہ کے مقام پر منظم انداز سے دعوت کا آغاز کرنے والے حسن البنا نے ۱۹۴۹ء میں جام شہادت نوش کیا۔ ان کی شہادت کے وقت پورے مصر میں اخوان کے لاکھوں وابستگان تھے اور ۲ ہزار سے زیادہ شاخیں تھیں، جب کہ صرف قاہرہ میں ۲۰۰ تنظیمی حلقے تھے۔ امام البنا مہینے میں ۲۰، ۲۲ دن سفر پر رہتے تھے۔ شہر شہر، قریہ قریہ لوگوں سے ملتے اور ان سے مخاطب ہوتے تھے۔ کنواں خود پیاسوں کے پاس پہنچتا، رات دن کی پروا کیے بغیر، نیند اور تھکن کو خاطر میں لائے بغیر، قلب وروح کے دروازوں پر دستک دینے والے اس محسن کا نام حسن البنا تھا۔ جن دنوں وہ سفر میں نہیں ہوتے تھے، ان دنوں جہاں کہیں بھی ان کا مستقر ہوتا، وہ وہیں پر دعوتی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ کوئی مسجد، محلہ حتیٰ کہ وہ جگہیں بھی جنھیں لوگ بالعموم اہل تقویٰ کے لیے کوئی بہت اچھی جگہ نہیں سمجھتے، مثلاً کلب، عام ریستوران، اور ایسے ریستوران بھی جہاں نغمہ وسرود کی

محفلیں برپا ہوتیں، وہ وہاں جا پہنچتے۔ ان جگہوں پر بھی بلامبالغہ ان کو بڑی عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ حسن البنا نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں انھوں نے مقدور بھر شہادت حق کا فریضہ ادا نہ کیا ہو۔ وہ لوگ جو ان سے اختلاف کرتے تھے، وہ بھی ان کی روحانیت، ان کی ربانیت، ان کے اخلاص اور مقصد سے ان کی والہانہ وابستگی کی مٹھاس کو محسوس کرتے تھے اور بے اختیار احترام کرتے تھے۔ یہ کیفیت آج تک موجود ہے۔ ان کی شخصیت کا یہی وہ طلسماتی پہلو ہے، جس سے ارباب اقتدار اور عالمی سامراج خوف زدہ تھے، اور ان کو اپنے عزائم کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

سعید رمضان مرحوم نے اپنی اہلیہ جو امام شہید کی صاحبزادی ہیں، کی تربیت کے حوالے سے مجھے بتایا کہ اس گھرانے پر اللہ تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے۔ یہ خاتون عبادت، سخاوت اور وفاشعاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ سعید رمضان پر آزمایش اور بیماری کے بڑے سخت دور گزرے ہیں۔ مگر اللہ کی اس بندی نے اولاد کی بہترین تربیت کی اور شوہر کو بھی سہارا دیا۔ اس حسن تربیت کی ایک مثال ان کے صاحبزادے طارق رمضان کا اپنے والد کے قریبی دوستوں سے احترام کا رویہ ہے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ اس احترام سے پیش آئے، جو ایک اچھے مسلم معاشرے میں باپ کے ایک قریبی ساتھی کا حق سمجھا جاتا ہے۔ ضمناً عرض ہے کہ طارق رمضان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ حسن البنا، یعنی اپنے نانا پر ہے، جو فرانسیسی زبان میں ہے۔ افسوس ہے کہ ابھی تک اس کا ترجمہ شائع نہیں ہوا۔

○ **اصل کارنامہ**: ۲۰ویں صدی کے آغاز میں اُمت مسلمہ زبوں حالی اور غلامی کے جس مقام پر پہنچ چکی تھی، اس میں امت مسلمہ خاص طور پر عرب دنیا کو دوبارہ حقیقی وژن دینا حسن البنا شہید اور اخوان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس کو اپنا حقیقی مشن یاد دلانا، امت میں خود اعتمادی کی کمی کا جو بحران پیدا ہوگیا تھا، اس بحران سے نکالنا۔ پھر اس مشن کو حاصل کرنے کے لیے امنگ، پروگرام، تنظیم اور تحریک فراہم کرنا، یہ عظیم کارنامہ ہے، جس میں حسن البنا شہید کا کردار کلیدی اور فیصلہ کن ہے۔ مولانا مودودی نے جو کام برعظیم پاک و ہند میں کیا، وہی کام ایک مؤثر انداز میں حسن البنا شہید اور ان کے ساتھیوں نے عرب دنیا میں انجام دیا۔ آج عالمی اسلامی احیا کی لہر کو اس مقام تک پہنچانے کا سہرا اللہ کی توفیق اور فضل سے بنیادی طور پر انھی دو شخصیات کے سر ہے۔ بلاشبہہ اس میں علامہ محمد اقبال

کا بھی ایک اہم کردار ہے، لیکن اس کا دائرہ فکری ہے، جب کہ دعوت، تنظیم، تربیت اور لائحہ عمل انھی دو شخصیات سے منسوب ہے۔

للّٰہیت اور درویشی حسن البنا شہید کی شخصیت کے غالب ترین پہلو ہیں۔ دعوت کی تڑپ اور وہ لگن کہ جس کا اظہار انھوں نے بچپن سے لے کر شہادت تک کیا، زندگی کا حصّہ بنتا ہے۔ اسی طرح ان کے ہاں اسلام کا تصور بہت صاف اور ہمہ گیر ہے۔ ان کے نزدیک فرد، معاشرے، ریاست اور تاریخ کے لیے اسلام ہی ایک دعوت انقلاب ہے۔ گویا کہ اللہ کی بندگی کی بنیاد پر زندگی کے پورے نظام کی تعمیر اور انسان کو خلافت کا جو منصب دیا گیا ہے، اس کے تقاضوں کو ہر سطح پر، انفرادی اور اجتماعی طور پر پورا کرنا زندگی کا لائحہ عمل ہے۔

اس وژن اور تصور میں مجھے ان کے ہاں تین اور خوبیاں نمایاں نظر آتی ہیں، اوّل: بندے کا رب سے مضبوط تعلق، پھر بندوں کا بندوں سے ہمدردی، وقار، اور بے لوثی پر مبنی تعلق۔ انھوں نے اس پہلو کو بہت مرکزی حیثیت و اہمیت دی۔ دوم: اجتماعیت ہے۔ اس کے لیے انھوں نے چار اصطلاحیں استعمال کی ہیں: پہلی: مسلمان خاندان (اسرہ)، دوسری مسلمان معاشرہ (مجتمع یا سول سوسائٹی)، تیسری: مسلمان مملکت (دولۃ یا اسٹیٹ)، اور چوتھی: عالمگیر اسلامی امہ، اور اس میں انھوں نے عرب قومیت اور اسلامی قومیت کو گڈ مڈ کرنے کی ٹھوکر نہیں کھائی۔ انھوں نے جہاں عربیت اور عربی قومیت کو اسلامی قومیت کا حصّہ اور اسے قوس قزح کے رنگوں میں سے ایک رنگ قرار دیا ہے، وہیں انھوں نے عربی قومیت کو طاغوت نہیں بننے دیا، بلکہ اسے اسلامی معاشرے کا نمایاں اور روشن حصّہ بنایا ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ انھوں نے انفرادی انقلاب کو جو فرد کے اندر پیدا ہوتا ہے، اور اجتماعی انقلاب جو فرد کے ذریعے سوسائٹی میں رُو پذیر ہوتا ہے، ان کا آپس میں مضبوط بندھن قائم کیا ہے، اور اس چیز کو اداراتی سطح پر منظم کیا ہے۔

سعید رمضان نے ہمیں ایک واقعہ یہ سنایا تھا، کہ اخوان کے کسی ساتھی سے کوئی غلط کام ہوگیا، جس پر معذرت کی غرض سے وہ امام حسن البنا کے پاس ایک سوا گھنٹہ رہا، لیکن انھوں نے اس ساتھی کو یہ موقع ہی نہیں دیا کہ وہ معذرت کر سکے۔ وہ پیار اور محبت سے ساتھی کی دل جوئی کرتے رہے کہ اس کو یہ ہمت نہیں ہوسکی کہ وہ معذرت کے الفاظ زبان پر لاسکے، حالانکہ امام شہید کو

یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ ساتھی معذرت کرنے کے لیے ہی آیا ہے۔ اسی طرح بعض نوجوان ان کے پاس آتے اور خلافِ شرع چیزیں، مثلاً سونے کی انگوٹھی وغیرہ پہنے ہوتے، تو حسن البنا ان کو نہ ٹوکتے۔ لیکن تھوڑے ہی دن کی صحبت کے نتیجے میں ان کی انگوٹھی بغیر کچھ کہے اُتر جاتی تھی۔

ہمارے اخوان سے تعلق کا ایک اہم حوالہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے صرف جماعت اسلامی کو ہی نہیں، بلکہ پاکستان کو اور پاکستان کے تصور کو بھی عالم عرب میں پورے شعور کے ساتھ سمجھا اور پوری دل جمعی سے سمجھایا۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۶ء سے شروع ہوجاتا ہے، جب قائداعظم [۱۸۷۶ء-۱۹۴۸ء] اور حسن البنا شہید کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس طرح عالم عربی میں اخوان، پاکستان کے سب سے بڑے ہم نوا تھے۔ پاکستان بننے پر انھوں نے مصر بھر میں پاکستان کا جشن استقلال منایا۔ سعید رمضان نے تو قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں بہت سے مسلم ممالک خاص طور پر عرب ممالک کے طول وعرض کا دورہ کر کے پاکستان کے تصور کی وضاحت کی تھی۔

○ **اخوان کے گہرے اثرات:** مجھے کئی بار مصر جانے کا موقع ملا ہے۔ اس میں وہ زمانہ بھی شامل ہے کہ جب شدید گھٹن اور سخت آمرانہ گرفت کا دور دورہ تھا اور کسی کے لیے اف تک کرنے کی گنجایش نہیں تھی۔ ان دنوں میں بھی مجھے ہوٹلوں کے خدمت گار ملازمین (ویٹرز) تک نے اخوان اور حسن البنا کے بارے میں اپنے والہانہ جذبات سے آگاہ کیا۔

۱۹۵۴ء میں، مصر کے فوجی آمر مطلق ناصر کا دورِ عروج تھا اور ناصر کی مطلق العنانی جنون کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ کوئی فرد اس کے خلاف دبی زبان میں بھی بات نہیں کرسکتا تھا۔ اخوان پر پابندی تھی، اس کے ہزاروں کارکنان گرفتار تھے۔ دسمبر ۱۹۵۴ء میں جب میں جمعیت میں تھا، ایک روز خبریں سنتے ہوئے معلوم ہوا کہ مجاہد کبیر شیخ محمد فرغلی سمیت اخوان کے چھے رہنماؤں [عبد القادر عودہ، یوسف طلعت، ابراہیم طیب، محمود عبداللطیف، ہنداوی دویر] کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ یہ خبر ہمارے لیے گہرے صدمے کا باعث بنی۔ اس موقع پر ہم نے کراچی میں بھرپور احتجاج کیا۔

اسی زمانے میں انٹرنیشنل اسمبلی آف مسلم یوتھ (IAMY) کی ایک کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تھی، جس میں مصر کا سرکاری وفد شرکت کے لیے آیا تھا۔ اس وفد کے سربراہ مصری فوج کے ایک کرنل تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف سے ہم نے اس کانفرنس میں، اس ظلم وزیادتی کے

خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ اسی مناسبت سے ایک بڑا موثر دو ورقہ (پمفلٹ) راجا بھائی اور میں نے انگریزی میں تیار کیا تھا: WHY OPPRESSION ON MUSLIM BROTHERHOOD? [اخوان المسلمون پر ظلم کیوں؟] — جسے ہم چھپوا کر اور چھپا کر کانفرنس ہال میں لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ جوں ہی پاکستان کے وزیراعظم محمد علی بوگرا کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لیے ہوٹل میٹروپول کے پنڈال میں داخل ہوئے، اس دو ورقے کی ایک کاپی انھیں دی گئی۔ اسی لمحے مختلف جگہوں پر کھڑے جمعیت کے ساتھیوں نے بڑے منظم انداز سے تمام قطاروں میں ہر شخص تک یہ پمفلٹ پہنچا دیا۔ اس واقعے سے پوری کانفرنس میں تہلکہ سا مچ گیا۔ مصر کے سرکاری وفد کو تو گویا آگ لگ گئی، اور ادھر ہماری حکومت حرکت میں آگئی۔ میں جمعیت کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شریک تھا۔ خرم بھائی نے مصری وفد کے سربراہ کی تقریر کے دوران ہال میں کھڑے ہوکر، اسے مخاطب کر کے کہا: تمھارے ہاتھ اخوان المسلمون کے راہ نماؤں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، تم قاتلوں کے ساتھی ہو۔

اس کشیدہ صورت حال کے باوجود، مصر کے سرکاری وفد میں شامل ایک نوجوان طالب علم بڑی خاموشی سے آکر ہمیں ملا اور اس نے کہا کہ: ''میں دل و جان سے اخوان کا ہمدرد ہوں۔ آپ لوگوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر جو اقدام کیا ہے، وہ حق پر مبنی ہے۔ میں اپنے ہزاروں مظلوم ساتھیوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں''۔

دراصل عوامی سطح پر جو لوگ اخوان کے گرویدہ ہیں، وہ تو گرویدہ ہیں ہی، مگر جو اس تحریک سے باہر ہیں، میں نے ان پر بھی اخوان کا بے پناہ فکری و اخلاقی اثر دیکھا ہے۔ اعلیٰ سطح کے اجلاسوں میں، پارلیمنٹ کے اندر، وزرا اور عرب لیگ کے افسروں سے مجھے بات کرنے کے بہت سے مواقع ملے ہیں، اور جب بھی کھلے دل کے ساتھ انھوں نے آف دی ریکارڈ بات کی تو میں نے انھیں یہ کہنے پر مجبور پایا کہ: ''اخلاقی اور نظریاتی اعتبار سے اگر کوئی قابل لحاظ قوت ایسی ہے جو مصر کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف اخوان المسلمون ہے''۔

○ **باطل کے مذموم عزائم:** حسن البنا نے ایسے نامساعد حالات میں کام کیا، جب کہ: ایک طرف سامراجی طاغوت اور دوسری طرف مقامی اشرافیہ تھی (یہ مقامی اشرافیہ ہی غالب تعداد

میں، سامراجی قوتوں کی آلۂ کار رہی ہے)۔ تیسری جانب وہ مہم جُو فوجی افسران تھے جنھوں نے اقتدار کا مزا چکھ لیا تھا۔ یہ مقتدر فوجی طبقہ ایک وسیع عالمی منظر نامے میں مغربی یا کمیونسٹ روسی سامراج کا آلۂ کار بنا۔ فوجی انقلابات کا یہ سلسلہ شرق اوسط سے شروع ہوا اور ۱۹۵۸ء میں پاکستان تک آپہنچا۔ اپنی ہی قوم کو فتح کرنے کی اس فوجی لہر نے افریقہ کے نوآزاد ممالک کی بڑی تعداد کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ دراصل یہ حکمت عملی مغرب کے پیش نظر تھی، کہ جو ممالک آزاد ہورہے ہیں وہ آزاد ہوکر بھی سامراجی قوتوں کے لیے چیلنج نہ بننے پائیں، اور کسی مثبت بنیاد کے بل بوتے پر نظریاتی یا معاشی و سیاسی قوت کا نیا مرکز نہ بن سکیں، اور اپنی معاشی، تجارتی، تہذیبی اور سیاسی پالیسیوں میں تابع مہمل بن کر رہیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے اشتراکی عناصر نے اور امریکا اور اس کے حواریوں نے یہ کوشش کی کہ لوگوں کو خریدیں، معاشی مفادات کے جال میں پھنسائیں، سیاسی اور فوجی معاہدات کے ذریعے ان قوموں کو ایک نئی قسم کی غلامی میں جکڑ لیں۔ اس ہدف کے حصول کے لیے انھوں نے یہ اصول طے کیا کہ: ''فوجی قیادت ہی ہماری بہتر حلیف ہے۔ جو اپنے ملکوں میں بغاوت کرکے اقتدار پر شبخون مارے، اور ہماری مدد سے ہماری قائم مقام (proxy) بن کر ہماری مرضی پوری کرے''۔ کچھ رپورٹوں میں صاف لکھا ہے کہ مغرب زدہ گروہوں کے لیے اقتدار کی راہیں کشادہ کرنا خواہ یہ فوجی انقلاب اور استبدادی حکومت (despotic rule) کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو، مغربی اقوام کے قومی مفاد میں ہے، تاکہ مذکورہ ممالک کے عوام کو قابو میں رکھا جاسکے۔ مائلز کوپ لینڈ (Miles Copeland) جس نے عرب دنیا میں سفارتی ذمہ داریاں بھی ادا کیں اور وہ سی آئی اے کا ایجنٹ بھی تھا، اس کی یادداشتوں *The Game of Nations: The Amorality of Power Politics* (1970), اور *The Game Players Confessions* (1989) سے بھی اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔ مغربی پالیسی ساز اور سیاسی تجزیہ کار اب کھلے لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں کہ: مسلم دنیا یا تیسری دنیا میں جو فوجی انقلاب آئے یا جو سیاسی اتھل پتھل ہوتا رہا ہے، ان سب کے پیچھے کسی نہ کسی صورت میں امریکا اور اس کی ایجنسیوں کا ہاتھ تھا''۔ مشرق وسطیٰ اس سامراجی چنگل سے کبھی نہیں نکل سکا۔

شام میں اخوان المسلمون کے سربراہ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی [۱۹۱۵-۶۳ء] نے الفتح میں ایک مرتبہ لکھا تھا: [مسلم دنیا کی] سیاسی پارٹیاں ہر معاملے میں ایک دوسرے کی مخالف ہیں، مگر ایک نکتے پر ان کا اتفاق ہے، اور وہ ہے 'دین دشمنی'___ اس لیے نظامِ حکومت میں تبدیلی کے سوا اصلاح کی کوئی صورت نہیں، اور نظامِ حکومت کی تبدیلی کا دارومدار ہے معاشرے کی تبدیلی پر۔ افسوس کہ علماے کرام اس بات کو نہیں سمجھتے"۔ میں اس میں یہ اضافہ کروں گا، کہ 'دین دشمنی' کی اس روش میں فوجی قیادتوں اور سیاسی طالع آزماؤں کو عالمی سامراجی قوتوں کی بھرپور سرپرستی حاصل رہی ہے۔ صدافسوس اس بات پر کہ اپنی قوم کے مفادات سے بے وفائی کا ارتکاب کرنے میں یہ طبقہ ادنیٰ درجے کی شرم تک محسوس نہیں کرتا، اور سامراجی آقاؤں کے سامنے اپنی قومی اور ذاتی ذلت تک کو خوشی خوشی برداشت کر لیتا ہے، بلکہ اس توہین کو بھی اعزاز کی کوئی قسم تصور کرتا ہے۔

اس منظرنامے میں حسن البنا اور اخوان المسلمون نے دعوت، تنظیم اور تربیت کا کام شروع کیا۔ وہ بہ یک وقت عالمی سامراج اور سامراج کے مقامی آلۂ کاروں کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے، دین کی گمراہ کن اور معذرت خواہانہ تعبیر کرنے والوں اور معاشرے میں سماجی، معاشرتی، اور سیاسی ظلم کی تمام بنیادوں کو پوری قوت سے چیلنج کیا۔ اس کے لیے اخوان نے جو راستہ اختیار کیا، اس میں تنظیم اور صحافت کے ساتھ ساتھ سیاست میں کھلے بندوں حصہ لینا بھی شامل تھا۔ حسن البنا نے خود بھی الیکشن میں حصہ لیا، اور اگر برطانوی اور مصری حکومت ان کا راستہ نہ روکتی تو وہ بڑی عظیم اکثریت سے کامیاب ہوتے۔

ان پابندیوں اور تمام تر مشکلات کے باوجود حسن البنا نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ افراد سے رابطے کا طریقہ تھا۔ یہی وہ امتیاز ہے جس نے استبداد کے اندھے بہرے ظلم اور اپنی بات کہنے کے کھلے مواقع نہ ہونے کے باوجود گھر گھر، محلے محلے، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ اس دعوت کو پہنچا دیا۔ اسی لیے ساری پابندیوں کے باوجود آج بھی اخوان ایک اہم سیاسی اور نظریاتی قوت کے طور پر موجود ہیں، بلکہ ملک کی پارلیمنٹ میں مضبوط حزب اختلاف کا درجہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ اخوان کی تنظیم خلاف قانون ہے، اور اخوان کے وابستگان نے آزاد امیدواروں کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ اخوان کی اس طلسماتی قوت کا ثبوت ہر موقع پر نظر آتا ہے۔ اس چیز کا گہرا تعلق

حسن البنا کی شخصیت اور ان کے اس طریقۂ کار سے ہے، جس میں تنظیم پر پابندی کے باوجود خودکار پھیلاؤ اور نچلی سطح تک ان کی رسائی ممکن ہوئی۔ یہ ان کی قوت کا بڑا راز اور بہت بڑا خزانہ ہے۔

○ **اخوان کی قوت کا راز:** سعید رمضان کے ذریعے ہم نے اس راز کو سمجھنے کی کوشش کی۔ تب ہم نوجوان تھے اور اسلامی تحریکی لٹریچر کا تازہ تازہ مطالعہ کیا تھا۔ اسلام کی ہمہ گیر انقلابیت کا جذبہ پوری طرح دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا (الحمدللہ، آج بھی وہی کیفیت ہے، البتہ ماہ و سال کی رفت و گذشت کے سبب قوت کار کم رہ گئی ہے)۔ ہم یہ معلوم کر کے بہت خوش تھے کہ جو بات مولانا مودودی نے مغربی طاغوت کی روح اور فطرت کے بارے میں کہی ہے، اور جو بات مولانا نے اسلام کے انقلاب اور پورے نظام کی تبدیلی کے حوالے سے ارشاد فرمائی ہے، بالکل وہی بات حسن البنا نے بھی اپنے خطبات میں کہی ہے۔ اس طرح نصب العین اور حصولِ منزل کی جدوجہد میں ہم اور اخوان ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔

تاہم ایک پہلو میں ہمیں کچھ فرق محسوس ہوتا تھا۔ اخوت اور محبت کا ویسا کلچر ہمارے ہاں اس طرح فروغ نہیں پاسکا، جس طرح اخوان کے یہاں نظر آتا ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا مظاہرہ روزمرہ کے میل جول میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے اہل حل وعقد جب ہم سے ہاتھ ملاتے تو ان کے ہاتھ کی گرفت میں ذاتی تعلق کا اس درجہ اظہار نہیں محسوس ہوتا تھا، جیسا اخوان کے بڑے اور چھوٹے ہر بھائی سے ملتے وقت محسوس ہوتا۔ ممکن ہے اس میں ہمارے خطے کی آب و ہوا، کلچر اور رسم و رواج کا بھی اثر ہو۔ اخوان کے ہاں اللہ کی خاطر محبت کے تصور کو بڑا مرکزی مقام حاصل ہے۔ خود جماعت اسلامی کے تربیتی لٹریچر میں اس موضوع سے متعلق احادیث کا ایک مؤثر انتخاب موجود ہے، لیکن اپنائیت کے اس تصور کو وہ اہمیت اور مرکزیت اس درجے میں حاصل نہیں ہوسکی، جو اخوان کے ہاں نظر آئی۔ اللہ کی خاطر محبت ہم نے اخوان کے احباب سے سیکھی۔ یہ سیکھا کہ اللہ کی خاطر بندوں کے درمیان تعلق کی بنیاد کو کس طرح مضبوط بنایا جاسکتا ہے اور پھر جب اخوان کے لٹریچر کو پڑھا تو اس میں بھی اسی اسپرٹ کو رچا بسا پایا۔ اخوان کے جتنے بھی کارکنوں سے ہمیں ملنے کا موقع ملا، ان میں اسی جذبے اور حرارت کی فراوانی پائی۔ حسن البنا کی زندگی کا مطالعہ کیا تو ان کی زندگی کے اندر بھی یہی کیفیت موجزن دیکھی۔ غالباً 'محبت فاتح عالم' والی کیفیت اور اس سے

رونما ہونے والی مقناطیسی قوت ہے، جس کے ادراک نے ان سے اس تحریک کا نام اخوان المسلمون رکھوایا (پیش نظر رہنا چاہیے کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی 'اخوان الصفا' سے اخوان المسلمون کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ خالص قرآنی اخوت سے اس کا رشتہ ہے)۔ یہ چیز ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی تھی۔

اسی طرح ہم نے اخوان کے تربیتی نظام سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ اس زمانے میں مولانا عبدالغفار حسن [م:۲۲مارچ ۲۰۰۷] جماعت اسلامی میں شعبہ تربیت کے ذمہ دار تھے۔ درس قرآن، درس حدیث، سیرت اور لٹریچر، جماعت کے تربیتی نظام کے عناصر ترکیبی تھے۔ اجتماع ارکان میں ان چیزوں کی باقاعدگی کے ساتھ احتساب کا اہتمام بھی تھا۔ روحانیت اور ربانیت، اخوان کے دو نہایت مرکزی پہلو ہیں۔ جمعیت میں ہم نے اخوان سے یہ سیکھا تھا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں روحانی بالیدگی کے لیے شب بیداری بھی ایک مؤثر تربیتی پروگرام ہے۔ اس سے قبل جماعت اور جمعیت کے پروگراموں میں شب بیداری نہیں ہوتی تھی۔ یوں جمعیت اور جماعت میں بھی شب بیداری کا پروگرام متعارف ہوا۔

○ **نظام الاسرہ اور اس پر اختلاف**: حسن البنا نے دعوت، تنظیم اور تربیت کے آغاز ہی میں خداداد صلاحیت کی بنا پر اس خطرے کو بھانپ لیا تھا کہ آنے والے کل میں، اس راستے پر چلنے والے جاں نثاروں کو کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دعوت، تحریک اور آزمایش، لازم وملزوم ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے کہا: بہترین طریقہ یہ ہے کہ افراد کو جوڑ کر اس طرح سے چھوٹے چھوٹے گروپ بنا دو کہ ریاستی جبر کے نتیجے میں اخوان کا مرکزی نظم رہے یا نہ رہے، مگر تنظیم کا یہ بنیادی یونٹ اپنی جگہ کام کرتا رہے۔

ایسے نظریاتی حلقے کی حد ۱۰ افراد پر قائم کی، جسے 'اسرہ' کہتے تھے۔ جب ۱۰ افراد پورے ہو جاتے تو انھیں دو 'اسروں' میں تقسیم کر دیتے۔ اس طرح انھوں نے ہزاروں حلقوں کی صورت میں نظام قائم کیا۔ اس نظام اسرہ میں سب سے زیادہ دل چسپ چیز اس کا اجتماعی مطالعے کا نظام ہی نہیں تھا، بلکہ اس میں عبادات بھی مشترک تھیں اور شب بیداریاں بھی۔ میرے نزدیک 'نظام اسرہ' میں سب سے اہم چیز یہ تھی کہ اس کے ممبران ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں پورے شعور

اور وابستگی سے شرکت کریں۔ ایک دوسرے کا سہارا بنیں۔ کسی ایک ساتھی پر کوئی مصیبت آئے تو 'اسرہ' کے تمام ساتھی اس کی مدد کو پہنچیں۔ یہی اسرہ کا مرکزی اصول تھا: پاکیزہ، ہمدرد اور بے لوث برادری۔

بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ اخوان کی بقا کا بڑا انحصار اس 'نظام اسرہ' پر رہا۔ اس کے ثمرات میں سے بہت متاثر کن چیز آزمایش اور ابتلا میں ان کی استقامت تھی۔ صدر ناصر کے زمانے میں صرف مصر میں ۳۰ سے ۴۰ ہزار افراد جیلوں میں تھے اور بیش تر شدید تعذیب کا نشانہ بنائے گئے تھے۔ ان سخت آزمایشوں اور ابتلا کے ادوار سے گزرنے کے باوجود انھوں نے الحمدللہ، جس تقویٰ اور استقامت کا ثبوت دیا ہے، وہ پختہ ایمان اور اس 'نظام اسرہ' کی برکات کا عملی اظہار تھا، کہ جس نے لوگوں کو آپس میں جوڑ دیا تھا۔ اسی 'نظام اسرہ' نے قیدی ساتھیوں کے خاندانوں کی دست گیری، عملی مدد اور ہمت بندھانے میں معاونت کی ہے۔

سعید رمضان سے 'نظام اسرہ' سمجھ کر ہم نے اسلامی جمعیت طلبہ میں اس کو اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ جمعیت کی تنظیم کو جو اسکولوں، کالجوں، یونی ورسٹیوں کے کارکنوں پر مشتمل تھی، اسے علاقائی اور رہایشی بنیاد پر کام کے لیے منظم کیا، جو اسرے ہی کی ایک شکل تھی۔ اس وقت کی جمعیت کے ناظم اعلیٰ کو کچھ دیگر امور کے ساتھ اس پر بھی شدید اضطراب ہوا۔ وہ پریشان تھے کہ ہماری تحریک کے روایتی نظام میں یہ ایک نئی چیز آگئی ہے۔ بالآخر ہمیں اس نظام میں کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ اس طرح ہمارا رہایشی نظام تو باقی رہا، لیکن 'نظام اسرہ' اپنے اخوانی تصور کے مطابق ہمارے تنظیمی نظام کا حصہ نہ بن سکا۔ یوں کراچی جمعیت میں 'نظام اسرہ' محض چار پانچ سال تک ہی چلا۔ یہاں پر یہ تذکرہ بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ جب جمعیت میں 'نظام اسرہ' پر بحث اٹھی، ان دنوں مولانا مودودی جیل میں تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی (م: دسمبر ۱۹۹۷ء) کا رجحان اسرے کے حق میں نہیں تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ نوجوانوں کی محض ایک اپچ ہے اور بس۔ مگر انھوں نے کھل کر اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں ہمیں جمعیت میں بڑی آزمایش اور نازک مرحلے سے گزرنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں ہمارے ان بزرگوں پر جنھوں نے اس دور آزمایش میں نوجوانوں

کی راہ نمائی فرمائی اور جمعیت انتشار سے بچ گئی۔اس سلسلے میں محترم شیخ سلطان احمد صاحب، چودھری رحمت الٰہی صاحب اور چودھری غلام محمد صاحب کا کردار اہم تھا۔انھوں نے ہمارے اس داخلی قضیے کو سلجھایا اور یہ کہا کہ کراچی جمعیت کے اس تجربے کو ہم اسلام اور تحریک کے مزاج کے خلاف یا روایات سے متصادم نہیں پاتے۔اس طرح ہمیں تائید حاصل ہوئی،اور اس بحث پر جو مقدمہ بنا تھا وہ قبول نہیں کیا گیا۔

○ **ہجرت اور دعوت کا ثمر:** جس زمانے میں مصر میں اخوان ابتلا سے گزرے، انھوں نے اپنی ابتلا کی مدت کو قصہ زمین، برسر زمین سمجھ کر حالات کا سامنا کیا۔ بعد میں جب موقع ملا تو ان میں سے کچھ لوگ سعودی عرب، کویت یا خلیجی ممالک چلے گئے۔ کچھ افراد امریکا، جرمنی، انگلستان کی طرف جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔اسلام کے ان نہایت قیمتی سپوتوں نے مغربی دنیا میں دعوت اسلام کی بھاری ذمہ داری سرانجام دینے کے لیے بڑی ٹھوس بنیادیں استوار کیں۔آج مغربی دنیا میں اشاعت اسلام کے بیش تر سرچشموں کے پیچھے روایتی مذہبی طبقوں سے کہیں زیادہ اخوان کے ان جلاوطن کارکنوں کی پرخلوص حکمت اور مساعی کارفرما ہے۔

اخوان میں ایک اور وصف بڑا متاثر کن اور قابل رشک ہے،اور وہ ہے ان کا اللہ سے تعلق کے ساتھ ساتھ قرآن سے ربط۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اخوان اور قرآن لازم و ملزوم بن گئے ہیں۔اس باب میں میرا سب سے دل چسپ تجربہ وہ تھا، جب میں محترم میاں طفیل محمد کے ساتھ صدر حسنی مبارک سے ملنے مصر گیا تو ان لوگوں نے ہمارے لیے نہر سویز کی سیر کا انتظام کیا تھا۔ہم رات کے ۱۲ بجے سویز نہر کی سیر کے لیے نکلے اور فجر سے کچھ پہلے واپس آئے۔ وہاں ہوتا یہ ہے کہ جہاز سویز کے درمیان میں کمان تبدیل کرتا ہے۔ ایک جہاز ایک طرف سے آتا ہے اور دوسرا جہاز دوسری طرف سے۔ جب کمان تبدیل ہورہی تھی تو جس جہاز میں ہم تھے، اس کا ایک اعلیٰ کمانڈر ہم سے ملا۔جب اس سے میاں صاحب، جماعت اور میرا تعارف ہوا،تو اس نے احترام اور اپنائیت کے اظہار کے لیے آہستگی سے اپنی جیب سے قرآن نکالا اور ہمیں ہدیہ کر دیا۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ میرا تعلق اخوان سے ہے۔ حالانکہ خفیہ سروس کے لوگ ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ یہ واقعہ غیر محسوس انداز میں ہوا۔

○ **سماجی اور معاشی فکر:** معاشرتی تشکیل کی فکر اور وژن کے موضوع پر مولانا مودودی اور اخوان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا، تاہم پروگرام کے نفاذ کی تفصیلات میں کچھ امور پر ایک حد تک اختلاف رجحان کا احساس ہوتا ہے۔ اخوان کے یہاں شروع ہی سے دعوت، سیاست، خدمت اور متبادل اقتصادی بنیاد تعمیر کرنے کی فکر ساتھ ساتھ موجود رہی ہے۔ اخوان نے غربت کو ختم کرنے اور روزگار فراہم کرنے کی اسکیم ۱۹۳۳ء میں شروع کی تھی۔ اداراتی (انسٹی ٹیوشنل) مناسبت سے ان کے ہاں معاشی مسائل اور سامراج سے چھٹکارا پانے کا نظامِ کار نمایاں طور پر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے ہاں کام کا آغاز ایمان، عقیدے اور دینی وژن سے ہوتا ہے۔ پھر ہم آہستہ آہستہ مذکورہ اداراتی اور سماجی مسائل کی طرف آتے ہیں۔ البتہ شعوری طور پر، آئینی مسائل ہمارے ہاں مرکزیت کے حامل رہے ہیں، جن کو دنیا بھر کی اسلامی تحریکیں قابلِ تقلید اقدام تسلیم کرتی ہیں۔ مگر دوسری جانب معاشی اور معاشرتی مسائل پر ایک متوازن اور متناسب انداز سے ہماری توجہ مرکوز نہیں رہی، اس کمی کا مداوا کم از کم مستقبل میں ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے اس سلسلے میں جو ہاتھ پاؤں مارنے کوشش کی ہے، ان مساعی میں مجھے مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور چودھری غلام محمد [م:۱۹۷۰ء] کی خصوصی مدد اور راہ نمائی حاصل رہی ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ ایمان، عقیدے اور اخلاق کی مرکزیت اور دینی روح کے ساتھ سماجی اور معاشی میدان میں تحریک کے انقلابی پروگرام کو کلیدی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ مگر یہ کام نعروں کی سطح پر نہیں، بلکہ تسلسل اور ایک ایسے اسلامی فریم ورک کے ساتھ ہونا چاہیے، جو عصری تقاضوں کو بھی پورا کرنے کا بھرپور اہتمام کرے۔ سماجی و معاشرتی مسائل میں اخوان کی متوازن دل چسپی قابلِ رشک ہے۔ البتہ ان کے ہاں افراط و تفریط کے بعض مناظر بھی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے تو اشتراکیت فی الاسلام تک کی بات کہہ دی تھی، تاہم اسے اخوان کے مجموعی ذہن نے قبول نہیں کیا۔

اس کے برعکس جماعت اسلامی، عورتوں کے ووٹ کے حق اور خاص طور پر اجتماعی معاملات اور تحریکی نظام میں خواتین کی شرکت کے حوالے سے، اخوان سے بہت آگے تھی۔ عورتوں کے ووٹ کے حق کو اخوان نے ۱۹۵۰ء کے عشرے میں تسلیم کیا، مگر جماعت اسلامی نے شروع ہی

سے اس کو تسلیم کیا تھا، بلکہ مولانا مودودی نے تو یہاں تک لکھا کہ عورتوں کی الگ شوریٰ ہو جو معاملات پر آزادانہ انداز میں غوروفکر کرے۔ اخوان اور جماعت میں پائے جانے والے ایسے جزوی اختلاف راے کا تعلق نفاذ دین کی تفصیلات سے ہے، وژن اور تصور سے نہیں۔

○ **تشدد کے الزام کی حقیقت:** ایک طرف تاریخ میں اخوان پر ابتلا و آزمایش کے دور بار بار آئے۔ دوسری طرف خود انصاف اور قانون کا خون کر کے اقتدار پر ناجائز قبضہ کرنے اور اپنے ہی ہم وطنوں کا خون بہانے والے نام نہاد روشن خیال طبقے نے الٹا اخوان ہی کو تشدد پسند کہہ کر انھیں الزامی مہم کا نشانہ بنایا۔ افسوس کہ ہمارے یہاں لبرل طبقے کی لبرلزم کا حدود اربعہ بس اتنا ہے کہ مغرب کی اندھی تقلید کی جائے۔ انھیں جمہوریت، انسانی حقوق، قانون کی حکمرانی اور عدل وغیرہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔

اقتدار، وسائل، طاقت، قومی اقتدار، مادی وسائل، عسکری طاقت اور ذرائع ابلاغ پر قابض اس طبقے کے بارے میں ایک مرتبہ مولانا مودودی نے فرمایا تھا کہ یہ ایسے پہلوان ہیں جو مدمقابل کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس سے کشتی لڑنے کے لیے میدان میں اُترتے ہیں۔ اس طبقے نے ایک طرف اخوان کو نشانہ بنایا، تو دوسری جانب پاکستان میں مولانا مودودی کو قید کر کے یہ کہنا شروع کیا کہ اخوان، تشدد پسند ہیں اور جماعت اسلامی کا تعلق بھی اخوان سے ہے۔ اخوان سے کوئی تنظیمی تعلق نہ رکھنے کے باوجود جماعت نے اخوان کے خلاف بدنیتی پر مبنی اس پروپیگنڈے کی مخالفت کی، اور اخوان کے دفاع میں کبھی کوتاہی نہیں برتی۔ اخوان پر مظالم کے خلاف اور ان کی تائید وحمایت میں، ہم نے ہر پلیٹ فارم پر، تحریر اور تقریر میں آواز بلند کرنے کی کوشش کی ہے، مگر تصادم اور ٹکراؤ پر منتج ہونے والے ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ جماعت کو اس بارے میں ہمیشہ شرحِ صدر رہا ہے کہ مؤثر، باوقار اور نصیحت کے انداز میں بات زیادہ پُراثر ہوتی ہے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اخوان نے کبھی اپنی حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لیے طاقت یا زیر زمین روابط کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اخوان کے ہاں قوت مجتمع کرنے کی سوچ، فلسطین پر قبضے کے خواہاں یہودیوں اور یورپیوں کی سامراجی یلغار کو روکنے کا سرعنوان تھی۔ اگرچہ ایک دو مواقع پر چند غیر ذمہ دار نوجوانوں کی نامناسب انفرادی حرکتیں انھیں دلدل میں دھکیلنے کا ذریعہ بنیں، لیکن ان

کی تاریخ کے گہرے مطالعے کی بنا پر میں یہ بات برملا کہہ سکتا ہوں کہ قوت کے استعمال کے حوالے سے ان پر عائد الزامات میں بہت کچھ محض زیب داستان کی حیثیت رکھتا ہے۔

مناسب ہوگا کہ اخوان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے یہاں پر امام حسن البنا کے اس مشہور خطبے پر غور کیا جائے، جو انھوں نے ۱۹۳۸ء میں اخوان کے پانچویں اجلاس میں دیا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا: ''اخوان، فکروعمل کی سطحیت پر ریجھ جانے والے نہیں ہیں، بلکہ وہ گہری فکر اور وسیع زاویۂ نظر کے حامل ہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی چیز کی گہرائیوں میں ڈوب کر نہ دیکھیں...... وہ جانتے ہیں کہ قوت کے مدارج کیا ہیں: ان میں اولیت، عقیدہ و ایمان کی قوت کو حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد وحدت و ارتباط کی قوت کا حصول ہے، اور ان دونوں کے بعد زورِ بازو کا درجہ آتا ہے...... الاخوان، متشددانہ انقلاب کے بارے میں قطعی طور پر کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتے۔ وہ کسی حال میں اس طریق کار پر اعتماد نہیں کرتے، اور نہ اس کا نفع بخش اور نتیجہ خیز ہونا انھیں تسلیم ہے...... تاہم اگر حالات کی رفتار یہی رہے گی اور اصحابِ اقتدار اس کا علاج نہیں سوچیں گے، تو اس کا لازمی نتیجہ متشددانہ انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوگا، لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ اس میں اخوان کا ہاتھ ہوگا، بلکہ یہ حالات کے دباؤ اور اصلاح سے گریز کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ ضرورت یہ ہے کہ ہماری قومی زندگی کے سیاہ وسفید پر قابض طبقے اپنی ذمہ داری اور صورت حال کی نزاکت کو سمجھیں''۔

جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے دستور کی دفعہ ۵(۴) میں واضح طور پر اعلان کیا ہے: ''جماعت اپنے نصب العین کے حصول کی جدوجہد، خفیہ تحریکوں کی طرز پر نہیں کرے گی، بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کرے گی''۔ اس طرح جماعت نے ہمیشہ کے لیے دوسرے دروازے کو بند کر دیا۔ پھر اسی طرح جماعت اسلامی پاکستان نے ستمبر ۱۹۴۸ء کو مرکزی مجلس شوریٰ میں یہ قرارداد منظور کی تھی کہ: ''اپنے مقصد کے حصول کے لیے جماعت اسلامی ایسے ذرائع اور طریقوں کا استعمال جائز نہیں سمجھتی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے بدنظمی اور بدامنی رونما ہو۔ جماعت اسلامی، اصلاح وانقلاب کے لیے جمہوری طریقوں پر یقین رکھتی ہے، یعنی تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اذہان اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور رائے عام کو ان تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے، جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ جماعت کا کوئی کام خفیہ نہیں ہے بلکہ سب کچھ علانیہ ہے۔ جن قوانین پر ملک کا نظم ونسق

اس وقت چل رہا ہے ان کو وہ توڑنا نہیں چاہتی، بلکہ اسلامی اصولوں کے مطابق بدلنا چاہتی ہے''۔

مولانا مودودی نے ۱۹۶۳ء میں، مسجد ابراہیم، مکہ معظمہ میں عرب نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''[دنیا بھر میں] اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انھیں خفیہ تحریکیں چلانے اور اسلحے کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے، اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک کے ذریعے سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلایئے، بڑے پیمانے پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے، اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں، ان کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا، وہ ایسا پایے دار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کرسکیں گے۔ جلد بازی سے کام لے کر اگر کوئی انقلاب رونما ہو بھی جائے گا تو جس راستے سے وہ آئے گا، اسی راستے سے وہ مٹایا بھی جاسکے گا''۔ (دیکھیے: ماہ نامہ ترجمان القرآن، جون ۱۹۶۳ء)

مولانا مودودی پہلی بار ۱۹۵۶ء میں عالم عرب گئے تھے، لیکن ان سے پہلے مولانا مسعود عالم ندوی نے ۱۹۴۹ء میں بلاد عرب کا دورہ کیا تھا۔ مسعود عالم صاحب نے اپنے ایمان افروز سفرنامے دیارِ عرب میں چند ماہ میں یکم جولائی ۱۹۴۹ء کو لکھا تھا: ''جس شخص پر اخوان سے تعلق کا ادنیٰ شبہہ بھی ہوتا ہے، اسے فوراً قید کرلیا جاتا ہے۔ حیرت ہے، حکومت کی فوج اور پولیس کے سامنے، اسلام اور مصر کے دشمن قاہرہ کی سڑکوں پر اکڑتے پھرتے ہیں، لیکن مصری حکومت ان کے خلاف کچھ نہیں کرتی۔ اس کا سارا غیظ وغضب اسلام کے داعیوں پر ٹوٹتا ہے''۔ پاکستان آکر مولانا مسعود عالم ندوی نے مختلف تربیتی پروگراموں میں اخوان کے بارے میں جو تاثرات بیان کیے، ان میں اخوان سے محبت، اخوان سے قربت، اخوان سے عقیدت اور اخوان کو اپنا دست و بازو سمجھنے کا پہلو غالب تھا۔ بعدازاں خود مولانا مودودی نے کئی بار اس بات کا اظہار فرمایا کہ: ''فکری اعتبار سے جو کام ہم کر رہے ہیں، وہی کام اخوان کر رہے ہیں۔ ہمارے درمیان بنیادی نقطۂ نظر کا کوئی مسئلہ نہیں ہے''۔

○ **امام شہید کے رفقا**: یہ واقعہ بھی تاریخی نوعیت کا ہے کہ جب مصری حکومت نے

اخوان پر پابندی لگائی تھی، تو عبدالقادر عودہ شہید [۱۹۰۶ء-۱۹۵۴ء] ہائی کورٹ کے جج تھے۔ پابندی کے خلاف مقدمہ چلا، مگر عدالت نے اخوان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ جس عدالت نے فیصلہ دیا، اس کے جج عبدالقادر عودہ بھی تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ: ''مجھے تاریخ نے اخوان پر حَکَم [جج] بنایا اور بالآخر میں اخوان ہی کا ہو گیا''۔ اپنی مشہور کتاب التشریع الجنائی فی الاسلام انھوں نے اخوان کی دعوت قبول کرنے کے بعد لکھی۔

بعدازاں جب میں کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ معاشیات میں پڑھ رہا تھا، اس زمانے میں سید قطب ہمارے لیے فکروعمل کی ایک بڑی مؤثر علامت اور ہمارے ہیرو تھے۔ افسوس ہے کہ مجھے سید قطب سے کبھی ملنے کا موقع نہیں ملا، لیکن ان کی جان دار تحریروں اور علمی طور پر نہایت وقیع نگارشات سے بھرپور استفادے کی کوشش کی ہے۔ سب سے بڑھ کر حق کی راہ میں ان کی استقامت میرے لیے ہی نہیں، ہماری پوری نسل کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوئی ہے۔ سید قطب کو ناصر نے قید میں ڈالا اور اس طرح مقدمہ چلایا کہ انھیں وکیل تک نہ کرنے دیا۔ سوڈان سے دو چوٹی کے وکیل احمد امین سالک اور محمد احمد دورابی، فروری ۱۹۶۶ء میں قاہرہ پہنچے تو انھیں دھکے دے کر مصر سے نکال دیا گیا۔ اس طرح سید قطب نے تن تنہا بڑی جرأت اور استقامت سے مقدمے کا سامنا کیا۔ آخر کار ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو مفسر قرآن، مفکر اسلام، اعلیٰ پائے کے ادیب اور دانش ور سیّد قطب کو پھانسی دے دی گئی۔

اخوان کے قائدین میں، میرا سب سے زیادہ گہرا تعلق استاد مصطفیٰ مشہور سے تھا۔ وہ متعدد بار پاکستان میں ہمارے مہمان رہے، خصوصاً افغانستان کے جہاد کے زمانے میں۔ اس کے علاوہ ان سے میری ملاقاتیں انگلستان، مصر، جرمنی اور ترکی میں بھی رہیں۔ ہم نے دعوت دین کے کاموں میں تبادلۂ خیال کے لیے ایک مشاورت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کوششوں کے وہ سربراہ تھے اور میں ان کا نائب تھا۔ حسن البنا کی زندگی میں مصطفیٰ مشہور نوجوانوں کے گروپ کے سربراہ تھے۔ اسی طرح مامون الہضیبی سے بھی مصر اور یورپ میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ ان تمام مواقع پر اشتراک اور افہام وتفہیم کا پہلو غالب رہا۔ البتہ حکمت عملی میں کبھی کبھار ترجیحات کے بارے میں اختلاف راے بھی پیدا ہوا۔ جماعت کے نظام تربیت کو انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ اخوان کے قائدین کو یہ

احساس تھا کہ فکری میدان میں ہمارا [یعنی جماعت کا] کام ان سے بہتر ہے۔ ہم نے کشمیر کے مسئلے کو تمام تفصیلات کے ساتھ واضح کیا اور اخوان نے اس مسئلے پر پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا۔ اسی طرح فلسطین کے مسئلے کے سب سے مؤثر داعی اخوان تھے اور ہم نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔

○ **آرا میں اختلاف:** جب سعید رمضان یہاں پاکستان میں تھے تو ان کی خواہش تھی کہ جماعت اسلامی کی موجودگی کے باوجود پاکستان میں ایک حلقہ ایسا بھی قائم کیا جائے جو براہ راست اخوان سے متعلق ہو۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے 'الاحباب' کے نام سے تنظیم بنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ چودھری غلام محمد صاحب اور میرے سمیت، جمعیت کے رفقا نے ان سے تفصیلی بات چیت کی اور بتایا کہ ایسا کوئی بھی متبادل یا متوازی نظام یہاں قائم ہوا تو وہ اس مقصد کے لیے مجموعی طور پر مفید نہیں ہوگا۔ ہمارا یہ اختلاف نظریاتی نہیں بلکہ حکمت عملی کا تقاضا تھا۔

ایک مسئلہ متعدد بار اخوان کی طرف سے اٹھایا گیا تھا کہ ہم سب مل کر عالمی سطح پر تنظیم کا ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق قائم کریں، لیکن ہم نے اس تجویز کی تائید نہیں کی، اور ان کے سامنے یہ بات رکھی کہ موجودہ حالات میں حسب ضرورت آپس میں مل کر تبادلۂ خیالات سے آگے ہمیں نہیں بڑھنا چاہیے۔ اس کی دو وجوہ ہیں: پہلی یہ ہے کہ عالمی حالات کے پیش نظر کچھ رفاہی منصوبوں میں تعاون تو درست ہوسکتا ہے، لیکن اس سے زیادہ ربط و تعلق موجودہ عالمی اور خود مسلم ممالک کے سیاسی حالات کی وجہ سے نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں کسی جگہ تحریک اسلامی پر پابندی ہے اور ان کے خلاف ریاست قوت استعمال کر رہی ہے۔ کہیں کچھ نرمی ہے اور پناہ مل رہی ہے۔ اگر آپ ایک نظم بن جائیں گے تو بین الاقوامی ریاستی تعلقات میں مسائل پیدا ہوں گے اور حکمرانوں کو تحریک اسلامی کے خلاف کام کرنے میں زیادہ قوت حاصل ہو جائے گی اور وہ اس کے خلاف زیادہ مؤثر اقدام کریں گے۔ البتہ اگر ہر ملک میں آزاد نظم رہے اور واحد مرکزیت سے گریز کیا جائے تو یہ تحفظ کا ذریعہ ہوگا۔ اسی لیے ہم نے کوئی بین الاقوامی تنظیم نہیں بنائی۔

یہ دُور اندیشی دراصل مولانا مودودی کی بصیرت کا مظہر ہے۔ البتہ کسی مسئلے پر مشترکہ موقف اختیار کرتے ہوئے متفقہ نقطۂ نظر بیان کرنا مختلف چیز ہے۔ اس کے لیے وقتاً فوقتاً دوسرے پلیٹ فارم موجود ہیں۔ ایسے پروگراموں میں اسلامی تحریکات کے ذمہ داران نے شرکت کر کے اس مقصد کو

تقویت دی ہے، اورکوشش یہ رہی ہے کہ آپس میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی رہے۔ یہ سوچ پوری دنیا میں اسلامی تحریک کے لیے مفید رہی ہے۔

۱۹۸۲ء میں، قاہرہ میں مصر کے صدر حسنی مبارک سے ہم نے انھی کی دعوت پر ملاقات کی تھی۔اس ملاقات میں ہم نے یہ کہا تھا: ''اُمت کا مفاد اسی میں ہے کہ ریاستی قیادت اور تحریک اسلامی تصادم کے بجاے افہام وتفہیم کا راستہ اختیار کریں، اور اگر تعاون ممکن نہیں تو ایک دوسرے کی پوزیشن کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر بقاے باہمی (co-existence) کا راستہ اختیار کریں۔

۷۰ کے عشرے میں، جب لیبیا میں اخوان پر پابندی نہیں تھی، ڈاکٹر شریف جو صدر قذافی کی کابینہ میں شامل تھے اور ڈاکٹر محمد یوسف مغاریف جو لیبیا کے آڈیٹر جنرل تھے، ان حضرات کے توسط سے مجھے پیش کش کی گئی تھی کہ میں لیبیا میں معاشی مشیر بن کر آجاؤں، لیکن میں نے معذرت کی۔ پھر جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ اخوان اور لیبیا کے مطلق العنان حکمرانوں کا راستہ الگ ہے۔اسی طرح سعودی عرب کے ذمہ داران سے اخوان کے بارے میں بار بار گفتگوئیں ہوئی ہیں۔ اُردن میں شہزادہ حسن بن طلال سے کئی بار میری ملاقات میں اخوان کے معاملے پر بات ہوئی ہے۔ان تمام ملاقاتوں میں ہم نے کبھی بھی تحریک کی عزت اور وقار پر مصلحت آمیزی کا راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ نصیحت اور تلقین کا راستہ اختیار کیا۔

۱۹۹۰ء میں، جب عراق نے کویت پر قبضہ کیا تو دنیا بھر سے اسلامی تحریکوں کے قائدین نے عالم عرب کا دورہ کیا۔اس وفد میں محترم قاضی حسین احمد، ڈاکٹر نجم الدین اربکان، ڈاکٹر حسن ترابی اور اخوان المسلمون اُردن کے عبدالرحمٰن خلیفہ شامل تھے۔ مجھے بھی اس وفد میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ ہم نے عراق، اردن، سعودی عرب، اور ایران کا دورہ کیا، اور وہاں پر چوٹی کی قیادت سے ملاقاتیں کیں۔اس دورے میں عراقی سربراہ صدام حسین سے بھی ہماری ملاقات ہوئی تھی۔اس گفتگو کا محور جنگ تھا۔صدام حسین سے قاضی حسین احمد صاحب نے بڑے واضح لفظوں میں کہا تھا کہ: ''جنگ آپ پر مسلط کی جارہی ہے۔آپ کو چاہیے کہ مذکرات سے راستہ نکالیں۔ کویت پر قبضہ اصول اور حکمت دونوں اعتبار سے گھاٹے کا سودا ہے''۔ان کے نائب صدر سے ہم نے عراق میں گرفتار اخوان کے کارکنوں کی رہائی کے بارے میں بات کی، افسوس کہ انھوں نے کوئی

واضح بات نہ کی۔

○ **جہاد اور تصورِ جہاد:** عیسائی مشنریوں، جنگ جُو صہیونیوں اور علمی دیانت سے تہی دامن مستشرقین نے مسلم معاشروں کے مغرب زدہ عناصر کی مدد سے جہاد کے لفظ کو منفی پروپیگنڈے کا ہدف بنادیا تھا۔حسن البنا نے دعوت کے آغاز پر ہی یہ واضح کیا کہ جہاد کے معانی دراصل استبدادی، سامراجی اور طاغوتی قوتوں سے مقابلہ ہے۔اس طرح انھوں نے بڑے نمایاں انداز سے دعوت،فکر،تشریح،ابلاغ،عمل،دفاع وغیرہ سے متعلق تفصیل سے راہ نمائی دی۔

اسی ضمن میں مولانا مودودی کا یہ بڑا اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں جہاد کے تصور کواپنی معرکہ آرا کتاب الجہاد فی الاسلام میں نکھار کرامت کے سامنے پیش کیا۔[1] ادھر اخوان المسلمون ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی۔حسن البنا کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے جہاد کے تصور کو نکھارنے کے ساتھ ساتھ فلسطین پر یہودی قبضے سے نجات پانے کے لیے مسلم امت کواس کے لیے عملاً تیار بھی کیا۔اس طرح وہ امت جو سیاسی غلامی، معاشی محکومی، اخلاقی ابتری اور فکری مرعوبیت کے ہاتھوں شکست اور پسپائی کی علامت بن چکی تھی، اسے علامہ محمد اقبال، حسن البنا شہید اور مولانا مودودی نے ایمان، اعتماد، امنگ، اور عزم کے ساتھ راستہ بنانے کی راہ دکھائی۔

حالیہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مصر وہ پہلا ملک ہے جہاں کھل کر دین اور سیاست کی تفریق کی بات پیش کی گئی تھی۔برعظیم پاک و ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ محمد اقبال اور مولانا مودودی کے مضبوط استدلال نے یہاں پر یہ بات نہیں چلنے دی، جب کہ مصر میں علی عبدالرزاق (م: ۱۹۶۶ء) نے کھلے بندوں چیلنج کے انداز میں یہ بات کہی تھی کہ خلافت کا قیام ضروری نہیں ہے، اور دین اور سیاست کی تفریق ممکن ہے اور کچھ حالات میں مطلوب بھی۔ امام حسن البنا نے اس چیلنج کا فکری اور عملی سطح پر جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ: اسلام ایک ریاست،

۱- اس کتاب کے ابتدائی مباحث ۲ فروری سے ۱۵ جون ۱۹۲۷ء تک اخبار الجمعیۃ، دہلی میں شائع ہوئے۔ بعدازاں موضوع کی وسعت کے پیشِ نظر مولانا مودودی نے اسے مستقل کتاب کی شکل دے دی اور ۱۹۳۰ء میں دارالمصنفین، اعظم گڑھ نے اسے شائع کیا۔

ایک نظام حکومت اور ایک معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔اس طرح انھوں نے ریاست کے اسلامی تصور کو تحرک اور تحریک کا حوالہ بنا دیا۔بعد ازاں مسلم دنیا میں جتنی بھی اسلامی تحریکیں اٹھیں، خواہ وہ اخوان المسلمون یا جماعت اسلامی کے قافلے سے الگ ہو کر چلیں یا الگ سے قائم ہوئیں، ان سب کا ایک اہم ہدف اسلامی ریاست کا قیام طے پایا۔آج اسلام پر جو بھی تحقیقی، تجزیاتی یا سخت متعصبانہ مطالعات سامنے آرہے ہیں، ان میں اسلامی احیا اور اسلامی ریاست، اخوان، جماعت اسلامی، مولانا مودودی، سید قطب اور حسن البنا کا ذکر مرکزی موضوعات کے طور پر ملے گا۔

○ **حکمت عملی اور بحران:** اخوان المسلمون ایک زندہ تحریک ہے، اور ایک فعال تحریک کی حیثیت سے اسے داخلی طور پر کئی بحرانوں سے گزرنا پڑا ہے۔بعض اوقات اس کے مختلف وابستگان الگ بھی ہوئے ہیں، اور انھوں نے الگ سے اپنی راہ بنائی بھی ہے۔جب وہ الگ ہو گئے تو پھر اپنے قول وفعل کے ذمہ دار وہ خود ہیں، اخوان المسلمون یا حسن البنا ان افراد کے کسی فعل کے لیے جواب دہ نہیں ہیں۔

اخوان المسلمون کے بڑے دھارے نے بڑے تسلسل کے ساتھ، استبدادی حکومتوں کی جانب سے مسلط کردہ آزمایش کا مقابلہ کیا۔اپنے متوازن اور راست طریق کار کو انھوں نے ترک نہیں کیا اور نہ وہ کسی ردعمل کا شکار ہوئے۔یہ دراصل حسن البنا کی اس تربیت کا کرشمہ ہے جس کے تحت مختلف نامساعد حالات کے باوجود انھوں نے راستہ نکالنے والی انقلابیت کا دامن تھامے رکھا۔ بالکل یہی صورت حال مولانا مودودی کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے، جو سخت سے سخت اشتعال انگیز حالات کے باوجود واقعات سے متاثر نہیں ہوتے، بلکہ خداداد دانش اور اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اس طرح راستہ بنا لیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اخوان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ لوگ تھے جنھوں نے شدید ردعمل میں آکر اخوان سے ناتا توڑ لیا اور اپنی نادانی سے استبدادی قوتوں کو مضبوط کیا۔انجام کار ظلم کی سیاہ رات طویل ہوئی اور تبدیلی کے امکانات کی دنیا محدود ہوئی۔دوسری جانب الگ ہونے والے وہ لوگ تھے، جو سمجھتے تھے کہ ہمیں مقتدر قوتوں کے ساتھ مل کر راستہ بنانا چاہیے۔ان میں سے بعض لوگوں نے صدر ناصر اور کچھ افراد نے صدر سادات سے تعاون بھی کیا، مگر کوئی امید بر نہ آئی

بلکہ اس طرح وہ اور زیادہ بے وزن ہوئے۔ مقصد کا حصول دُور کی بات ہے، وہ خود اپنے مشن سے دور ہوتے چلے گئے۔ طاغوت کے طرف داروں سے مل کر طاغوت کو لگام دینا کارِمحال ہے۔ گویا کہ مقصد اور منزل کے بارے میں سمجھوتا تباہ کن ہوتا ہے۔

حکمت اور مصلحت، قرآن کے اصول ہیں۔ ان دونوں کا مفہوم سیرت پاک کے مطالعے سے متعین ہو جاتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر دور میں اسلامی تحریکوں کو چاہیے کہ وہ ان اصولوں کو اپنی پالیسی کا حصہ بنا کر شہادتِ حق، تطہیر افکار اور تعمیر معاشرہ کا راستہ بنائیں۔ اس راستے کا انتخاب کرتے ہوئے غلطی بھی ہوسکتی ہے، لیکن غلطی تو اس صورت میں بھی ہوسکتی ہے کہ آپ پورے معاشرے سے کٹ کر کسی جنگل بیابان میں چلے جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اجتہادی غلطی کا بھی ایک اجر ہے اور اگر اجتہاد صحیح ہے تو اس کے دو اجر ہیں۔ اسی فریم ورک کے اندر اخوان کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی، اور آیندہ آنے والوں کے لیے بھی اہم سبق ہے۔

○ **علمی میدان میں خدمات:** عام طور پر ہمارے تحریکی حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ حسن البنا شہید اور ان کے قریبی رفقا نے شاید کسی ٹھوس علمی کام کی بنیادیں استوار نہیں کیں، بلکہ یہ کام محض واعظانہ ابھار اور وقتی جوش و ولولے پر رواں دواں تھا۔ میرے خیال میں یہ تاثر سراسر معلومات کی کمی کے باعث پھیلا ہے۔ مصر میں اخوان کے علاوہ بھی علمی کام کی روایت گہری اور بڑی وسیع ہے۔ اس علمی روایت میں دونوں طبقے شامل ہیں، یعنی اسلام پر تنقید کرنے والے بھی اور اسلام کا دفاع یا اسلام پیش کرنے والے بھی۔ بلاشبہہ حسن البنا شہید نے کوئی بڑی بڑی کتابیں تصنیف نہیں کیں۔ ان کے ۲۰ رسائل اور بیش تر تقاریر ہیں۔ یہ مختصر رسائل بھی فکری گہرائی اور حکیمانہ راہ نمائی سے بھرپور ہیں، اور قرآن اور سیرت کے گہرے مطالعے اور اپنے دور کے حالات پر انطباق کے مظہر ہیں۔

ہمارے ہاں علمی کام کا زیادہ حصہ اللہ کے ایک بندے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکروکاوش کا ثمرہ ہے۔ اس کے برعکس اخوان کے ہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ ایک پوری ٹیم ہے جس نے مل کر یہ کام کیا ہے۔ اس کام کی وسعتوں کو دیکھیں تو یہ بڑا معرکے کا کام ہے۔ مثال کے طور پر عبدالقادر عودہ شہید نے اسلامی قانون پر جو کام کیا، وہ ۲۰ ویں صدی کے معتبر ترین کاموں میں سے

ایک کام ہے۔ وہ اپنے فن کے ماہر تھے اور قرآن وسنت پر ان کی نگاہ بڑی گہری تھی۔ سید قطب شہید نے تفسیر فی ظلال القرآن، العدالة الاجتماعية فی الاسلام، معالم فی الطریق وغیرہ جیسی معرکہ آرا کتب لکھیں، بلکہ ادبی اور فکری نوعیت کی بڑی قابل قدر تصنیفات بھی پیش کیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی سباعی کی ایک دو آرا سے اختلاف کے باوجود: السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی، نظام السلم والحرب فی الاسلام، المرأة بین الفقه والقانون، الاستشراق والمستشرقون، المرونة والتطور فی التشریع الاسلامی، التکافل الاجتماعی فی الاسلام، غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں اور ان کے علاوہ بھی وہ مزید درجن بھر کتب کے مصنف ہیں۔ محمد الغزالی، بہی الخولی، محمد محمود الصواف، عبدالبدیع صقر، محمد احمد ابوشقہ، ڈاکٹر سید سابق، ڈاکٹر عبدالعزیز کامل، ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ ابراہیم، ڈاکٹر محمد المبارک، ڈاکٹر سعید حویٰ، عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر جمال عطیہ، ڈاکٹر یوسف قرضاوی، ڈاکٹر توفیق شاوی، پروفیسر مصطفیٰ احمد زرقا، پروفیسر محمد قطب، پروفیسر عبدالحکیم عابدین، ڈاکٹر مالک بدری اور ان کے ہمراہ دیگر رفقا نے قائدانہ سطح کی کتب تحریر کیں۔ انھوں نے یہ کام ایک ٹیم کی طرح انجام دیا۔ اور اس قافلۂ علم و دانش میں آج بھی قیمتی اضافے ہو رہے ہیں۔ پھر خود امام حسن البنا کے والد گرامی احمد عبدالرحمٰن البنا نے الفتح الربانی (شرح مسند امام احمد) ۲۴ جلدوں پر مشتمل ایک بڑا وقیع علمی کارنامہ انجام دیا۔

اسی طرح صحافت کے میدان میں اخوان کے تجربات، ندرتِ خیال، بروقت اظہار، علمی شان اور عزم و حوصلے کو ابھارنے والا انداز بھی ایک قابل رشک پہلو رکھتا ہے۔ یہ ایک دو پرچوں کی بات نہیں، بلکہ اس میں عربی، انگریزی اور فرانسیسی میں درجنوں چھوٹے بڑے رسائل و جرائد کے نام سامنے آتے ہیں۔ پابندیاں لگتی رہیں، مگر نام، اسلوب اور مقام بدل کر حق کی گواہی دینے کا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی گئی۔ پھر علمی اور تحقیقی مجلوں کو دیکھتے ہیں تو مختلف عرب ریاستوں اور یونی ورسٹیوں کے جرائد تک میں اخوانی علم کلام کی گونج سنائی دیتی ہے، کہیں دھیمے انداز میں اور کہیں پُرزور انداز میں۔ یہ سب کام ایمانی حلاوت، اجتماعی وابستگی، روحانی جذبے اور مؤثر تربیت کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں۔

○ **آج کا منظر نامہ اور تقاضے:** تحریک احیاے اسلام کے مخالفین نے جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہوئے جہاد اور اسلامی ریاست کو ہدف تنقید بنایا ہے، اور ان دونوں چیزوں کو دہشت گردی سے جوڑ دیا ہے۔ درحقیقت اس مغربی جارحیت کا مرکزی نکتہ اسلام کا وہ تصور ہے کہ جس کی وجہ سے امت کا اجتماعی ذہن مغرب کی طاغوتی بالادستی اور اس کی ذہنی، فکری، معاشی اور تہذیبی حاکمیت کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اہل مغرب یہ چاہتے ہیں کہ ان کی من مانی اور دھونس کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ہر کوئی، ہر معاملے میں انھی کے فکر، خیال، اقدام اور عمل کو قبول کرے اور ایک خادم کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر تیار ہو۔ مغرب کے عزائم کے برعکس مسلمانوں کی تصورِ جہاد سے وابستگی لازوال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس امت کی طرف سے ہر نوعیت کے ظلم کے خلاف مزاحمت رک نہیں سکتی۔

اس جارحانہ پروپیگنڈے اور حالات وواقعات کے منفی بہاؤ کو دیکھتے ہوئے بسا اوقات لوگوں پر مایوسی کے آثار نظر آتے ہیں۔ بلاشبہہ بے جا خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے، لیکن خواہ مخواہ کی مایوسی بھی غلط ہے۔ دشمن کے پروپیگنڈے سے خائف نہیں ہونا چاہیے، مگر کھلی آنکھوں اور کشادہ ذہن کے ساتھ معاملات کا تجزیہ کرنے کا عمل بھی ترک نہیں کرنا چاہیے۔

موجودہ عہد میں جس وسعت اور جس شدت کے ساتھ مولانا مودودی، حسن البنا شہید، اور سید قطب شہید کے خلاف یہود ونصاریٰ اور ہنود پروپیگنڈا کر رہے ہیں، اس کی فکری، مذہبی اور عملی بنیادوں کا ادراک کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں سید قطب اور مولانا مودودی کی فکر کو درست پس منظر میں پیش کرنا نہایت ضروری ہے۔ جذباتی اور علامتی وابستگی سے بڑھ کر اسے شعوری اور نظریاتی تناظر میں سمجھنے اور پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا مودودی اسلامی تحریکوں کے سامنے آج ایک بڑا چیلنج یہ بھی ہے کہ صف بندی گہرے شعور کے ساتھ کی جائے اور مسلمان نوجوانوں کو دردمندی سے سنبھالا جائے۔ اگر کوئی مسلمان نوجوان شدید دباؤ کے نتیجے میں ردعمل کے راستے پر جاتا ہے تو مجھے ڈر ہے کہ پھر وہ مغرب کے تعصب اور ظلم وستم کے جواب میں اور زیادہ تشدد کی طرف ہی جائے گا۔ اصولاً یہ راستہ نہ درست ہے اور نہ مطلوب۔ اگر یہ نوجوان سید قطب اور سید مودودی کے اصل فکری نظام (پیراڈائم) کو

سمجھ لے گا تو ظلم کے خلاف دلیل کی قوت، کردار کی شان اور دعوت وحکمت کی طاقت کے ساتھ تو ضرور اٹھے گا، لیکن ایک ظلم کی جگہ وہ کبھی دوسرے ظلم کا حصہ نہیں بنے گا۔ یہ اسی وقت ہوگا جب وہ اس نظامِ فکر اور نظمِ تنظیم سے وابستہ ہوگا۔ اس طریقۂ کار کے لیے وقت لگے گا، محنت کرنا ہوگی، اور صبر وہمت سے کام کرنا پڑے گا۔

میں تشدد کے فروغ کی کسی بھی شکل کو حقیقی اسلامی تحریک اور اسلامی احیا کے لیے ایک تباہ کن خطرہ سمجھتا ہوں، تاہم کشمیر، فلسطین، چیچنیا میں آزادی کی تحریکوں، اور عراق وافغانستان پر غیر ملکی تسلط کی نوعیت دوسری ہے۔ اسلام، انسانیت کے لیے نظامِ رحمت ہے، اور نبی کریمؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔ اسلام کے علَم بردار یہ بات قبول نہیں کر سکتے کہ ایک ظالم کے ظلم کی سزا دوسرے بے گناہ لوگوں کو دی جائے۔ اس لیے جب مزاحمت کا راستہ اختیار کرنے کا مرحلہ آئے تو وہ بھی، رحمت عالمؐ کے پیش کردہ نمونۂ عمل کو سامنے رکھ کر اختیار کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اختیار کردہ راستہ سرور عالمؐ کا راستہ نہیں ہوسکتا، چاہے اس کے لیے کیسے ہی خوش نما دعوے اور دلائل پیش کیے جائیں۔ جان لینا چاہیے کہ جہاد اور انتقامی تشدد کے درمیان بڑا فرق ہے۔ ہمیں دشمن کے کھیل کا حصہ نہیں بننا، مگر خاموشی سے بھی خود ہمارے اور اسلام کے بارے میں ایک غلط تصور پیدا ہوگا۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ انسانیت کو خیر کی طرف بلائیں اور شھداء علی الناس کی ذمہ داری ادا کریں۔ ہم سب کو فکر کرنی چاہیے کہ اسلام کی دعوت، تربیت، شناخت اور تحریک اسلامی کا امتیازی کردار مجروح نہ ہونے پائے۔

یہی حسن البنا شہید اور مولانا مودودی کی دعوت اور ان کا پیغام ہے۔

***

قارئین کی توجہ کے لیے

ماہنامہ ترجمان القرآن کی یہ اشاعت خاص، مئی، جون ۲۰۰۷ء کا مشترکہ شمارہ ہے۔ اس کی قیمت ۹۰ روپے اور بیرونی ایڈیشن کی ۱۲۰ روپے ہے۔ سالانہ خریداروں کو اضافی ادایگی کے بغیر دی جارہی ہے۔ جولائی ۲۰۰۷ء کا شمارہ ان شاءاللہ بروقت شائع کیا جائے گا۔ ادارہ

اشاعت خاص کے علاوہ متعلقہ تحریروں پر مشتمل

قیمتی مجموعہ مقالات

حسن البنا شہید

—— ایک مطالعہ

- استاذ عمر تلمسانی
- پروفیسر غفور احمد
- عبدالرحمٰن البنا
- احمد سیف الاسلام البنا
- مولانا مسعود عالم ندوی
- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
- پروفیسر خورشید احمد
- صالح عشماوی
- ڈاکٹر طیب زین العابدین
- ڈاکٹر عوض بن محمد قرنی
- ڈاکٹر نورالدین طراف
- ڈاکٹر محمد عمارہ
- حافظ محمد ادریس
- جمال احمد سید
- ڈاکٹر علی عبدالحلیم محمود
- زینب الغزالی
- احسان اللہ ہندراکس
- ڈاکٹر محمود جامع
- ڈاکٹر فارش احمد نور
- محمد جلال بک
- ڈاکٹر توفیق یوسف
- ڈاکٹر فتحی یکن
- ڈاکٹر احسان حتحوت
- مجاہد محمد صواف
- تظیم خلیلو
- قاضی عبدالقادر
- محمد ایوب منیر
- امل عزالدین
- فرید احمد پراچہ
- گل زادہ شیرپاؤ

تفصیلات کا اعلان جلد کیا جائے گا- یہ کتاب قارئین ترجمان القرآن کو خصوصی رعایت پر فراہم کی جائے گی

اللہ

کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے!

- اللہ ہی ہے
- جس آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا
- اور بادلوں سے پانی اتارا
- پھر اس سے مختلف قسم کے پھل تمھارے رزق کے لیے پیدا کیے
- اور کشتی کو تمھاری نفع رسانی میں لگا دیا
  تا کہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے
- اور اس نے دریاؤں کو بھی تمھاری نفع رسانی میں لگا دیا
- اور سورج اور چاند کو بھی تمھاری نفع رسانی میں لگا دیا
- دونوں ایک ہی انداز پر گردش میں ہیں
- اور دن اور رات کو بھی تمھاری نفع رسانی میں لگا دیا

جس نے وہ سب کچھ تمھیں دیا جو تم نے مانگا

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے

بے شک انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

[ابراھیم ۱۴: ۳۲-۳۴]

طالب اشتہار: عبدالعزیز نیازی

مردِ حق آگاہ

قاضی حسین احمد

کسی بھی تحریک کا مؤسس اپنے نظریات اور تحریک کا سب سے بہتر تعارف ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے مقاصد سے جس قدر مخلص ہوگا اس پر، اس کے ساتھیوں پر، اور اس کی تحریک پر ان مقاصد کی چھاپ اُتنی ہی گہری ہوگی۔ امام حسن البنا شہید کی تمام تر جدوجہد کا اصل مقصد رب کی رضا کا حصول اور اللہ کے رنگ میں انفرادی و اجتماعی طور پر رنگ جانا تھا۔ ان کی پوری زندگی میں یہی پہلو سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔

قرآن کریم اور سنت نبویؐ سے براہِ راست ربط و تعلق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے مثل محبت اور وابستگی نے اخوان کو دعوت و تحریک کے مستقل مکتب کی حیثیت دے دی ہے۔ اخوان کا معروف شعار: اللہ ہمارا مقصود ہے، قرآن ہمارا دستور ہے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے راہ نما ہیں، جہاد ہمارا راستہ ہے، اور اللہ کے راستے میں موت ہماری سب سے بڑی آرزو ہے ــــــ اس روحانیت کا جامع خلاصہ ہے۔ اسی شعار کو بنیاد بنا کر انھوں نے اصلاحِ نفس، اصلاحِ اہل خانہ، اصلاحِ معاشرہ اور تعمیر ملت کی مثالی جدوجہد کی۔

امام حسن البنا شہید نے اپنے ساتھیوں کی تربیت میں جہاد اور قربانی کو بہت اہمیت دی۔ انھوں نے اخوان کے کارکنان کو ہر طرح کے مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ فاروق کے مظالم ہوں یا جمال عبدالناصر کی بے وفائی اور ظلم و تشدد، انور سادات کا جبر ہو یا حسنی مبارک کے غیر قانونی اقدامات، بیرونی سازشیں ہوں یا اندرونی حالات کی سنگینی، اخوان

ان تمام آزمایشوں میں سخت جان نکلے۔ انھیں ختم کرنے کی کوشش کرنے والے ایک ایک کر کے ختم ہوگئے، لیکن انھیں شہید، اسیر یا ملک بدر کر کے کبھی ختم نہ کیا جا سکا۔ یوں اخوان المسلمون کی تحریک کا دائرہ نہ صرف پورے عالمِ عرب پر محیط ہوگیا بلکہ اس کے اثرات پورے عالمِ اسلام میں پھیل گئے۔

صہیونی طاقتوں کی خواہش اور کوشش تھی کہ مسلم دنیا بالخصوص مصر سے اسلامی روح کا خاتمہ کردیا جائے۔ مصر پر خصوصی توجہ اس لیے تھی کہ مصر، فلسطین پر صہیونی قبضے کے خلاف مزاحمت کی بنیادی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصر ہی سے اسرائیلی وجود کے خلاف عملی مزاحمت سامنے آئی تھی۔ اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے بہت سی کاوشوں کا نقطۂ آغاز مصر ہی قرار پایا۔ فلسطین پر یہودی قبضے کو تسلیم کروانے کے لیے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ ہو یا عالمِ اسلام کے خلاف دیگر ثقافتی، دفاعی، جاسوسی اور اقتصادی سازشیں، ان کی تنفیذ میں بنیادی خدمت عالمِ اسلام کے حکمرانوں بالخصوص فلسطین کے پڑوسی ممالک سے لی گئی۔ سازشی عناصر اور ان کے خدمت گار جانتے تھے کہ اس راہ کی بنیادی رکاوٹ اسلامی تحریکیں اور معاشرے کے متدین عناصر ہیں۔ اس رکاوٹ کے ازالے کے لیے اندرونی و بیرونی قوتوں نے ہر ممکن ہتھکنڈا آزمایا۔ جھوٹے الزامات لگے، مہیب پروپیگنڈا ہوا، اور اندرونی و بیرونی فتنوں کو ہوا دی گئی۔ ملک بدری، اسیری اور پھر گولیاں اور پھانسی کے پھندے، اور ظلم و جور کے تمام ہتھکنڈے آزمائے گئے لیکن اللہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور جہاد فی سبیل اللہ کی محبت سے سرشار اور کتاب اللہ کے نور سے منور چراغوں کو بجھایا نہ جا سکا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چشمۂ فیض سے سیراب کھیتی، ہر آن اپنی بہار دکھاتی اور يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (الفتح: ۴۸:۲۹) ''کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں'' کا مصداق بنی رہی۔

وہ کارواں جو امام حسن البنا اور ان کے چند مخلص ساتھیوں کی جدوجہد سے شروع ہوا تھا، تمام تر چرکے سہنے کے باوجود آج کہیں حماس کی صورت ناقابلِ شکست ہے، کہیں اخوان المسلمون کی پے درپے کامیابیوں کی صورت مخالفین کو لرزہ براندام کیے ہوئے ہے۔ کہیں الجزائر کے ۸۰ فی صد راے دہندگان کے نقارے کی صورت سنائی دیتا ہے۔ عالمِ عرب ہی نہیں، جہاں جہاں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی جمع ہیں، اخوان غلبۂ اسلام کی اس جدوجہد کے دست و بازو بنے

ہوئے ہیں۔ اُمت کی اُمیدوں کے ترجمان ہیں، اور اس یقین سے سرشار ہیں کہ حق کو بالآخر غالب ہونا ہے اور باطل کو مغلوب۔

مسلسل قربانیوں اور ہمہ وقت جدوجہد سے اسلامی تحریکوں نے پوری دنیا پر یہ حقیقت آشکار کر دی ہے کہ قربانیاں اور مشکلات کبھی کسی تحریک کے خاتمے کا باعث نہیں ہوتیں۔ قربانیوں نے ہمیشہ تحریک کو مزید تقویت و زندگی بخشی ہے۔ جہاد کی فصل جتنی کٹتی ہے اتنی ہی مزید پھلتی پھولتی ہے۔ ہاں، قربانیوں سے اجتناب، مشکلات کا خوف اور خطرات کے اندیشہ ہائے دُور دراز، تحرک کے بجائے تساہل و تکاسل ضرور ایسا وقت لاتے ہیں کہ پھر تحریک تحریک نہ رہے، تعفن زدہ تالاب بن جائے۔ اقبال نے بھی اپنے اشعار سے یہی پیغام دیا اور حسن البنا کی شہادت سے اخوان اور اسلامی تحریک کو ملنے والی حیاتِ تازہ سے بھی یہی پیغام ملا:

ساحل افتادہ گفت' گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر مے روم، گر نہ روم نیستم!

(پڑے ہوئے ساحل نے کہا کہ: اگرچہ میں بڑی دیر زندہ رہا ہوں، لیکن افسوس! مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا کہ میں کیا ہوں۔ اپنی جان سے گزرنے والی موج تیزی سے لپکی اور اس نے کہا، اگر میں حرکت میں ہوں تو زندہ ہوں، اگر نہیں ہوں تو نہیں ہوں، گویا زندگی حرکت اور جدوجہد کا نام ہے۔)

یہی مطلب مرزا بیدل کے ایک شعر میں اس طرح ادا ہوا ہے:

ما زندہ ازانیم کہ آرام نہ گیرم
موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست

(ہم اس لیے زندہ ہیں کہ رکتے نہیں ہیں۔ ہم ایسی موج ہیں کہ ہمارا ٹھیرنا ہماری موت ہے۔)

سید قطب کے الفاظ میں کہ: ''شہید کے ہزاروں خطاب اور ہزاروں کتابیں بھی اخوان کے دلوں میں تحریک و دعوت کے وہ الاؤ روشن نہیں کر سکتے تھے جو ان کے پاکیزہ خون سے منور ہونے والے چراغوں نے دہکا دیے تھے''۔ اپنے مقصد سے مضبوط وابستگی اور نیت و عمل میں

کامل اخلاص نے حسن البنا کو اُمت کی اُمیدوں کا مرکز بنا دیا۔ وہ خود بھی ایک مؤثر قوتِ محرکہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت کے گرد علماے کرام اور عظیم مفکرین کی ایک کثیر تعداد جمع کر دی۔ امام نے زیادہ کتابیں تو نہیں لکھیں لیکن ان کے الفاظ: اصنف الرجال (میں مردان کار تصنیف کرتا ہوں)۔ ایسی حقیقت بن گئے کہ سید قطب، سید سابق، عبدالفتاح ابوغدہ، محمد الغزالی، علامہ یوسف القرضاوی، استاذ عبدالمعز عبدالستار، استاذ مصطفیٰ مشہور، استاذ کمال الدین سنانیری اور اسی پایے کے لاتعداد جلیل القدر علماے کرام ان کے حلقۂ عمل میں شامل ہوگئے۔ ان بزرگ علماے کرام کی روحانی تربیت کر کے انھوں نے عالم اسلام کو ایک ایسے مبارک گروہ کا تحفہ دیا جو علم و عمل اور تقویٰ وللّٰہیت کا نمونہ تھا، اور جنھوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت اور قرآن کی تعلیمات کو اپنی شخصیت میں جذب کرلیا تھا۔ اس مبارک گروہ سے آج عالم اسلام میں زندگی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ قرآن کریم میں مومنین کی جو صفات بیان ہوئی ہیں اور اللہ کے ولیوں کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں، ان بزرگ شخصیتوں میں ہم نے اس کا پرتو دیکھا ہے۔ یہ وہ چلتی پھرتی کتابیں ہیں جو امام حسن البنا شہید نے تصنیف کی ہیں اور ان سے آج پورا عالم روشن ہے۔

اخوان المسلمون کے ساتھ طالب علمی کے زمانے ہی سے میرا تعلق اتنا گہرا تھا کہ جب میں اپنی زندگی کے ان چند واقعات کو یاد کرتا ہوں جب میں شدید صدمے اور حزن سے دوچار ہوا، تو ان میں سے ایک عبدالقادر عودہ شہید اور ان کے ساتھیوں کی سزاے موت کا واقعہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے علاقے کے ایک چھوٹے سے قصبے کے ریلوے اسٹیشن کی مسجد میں اس روز کتنی دیر تک آنسو بہاتا رہا اور رو رو کر اپنے رب کے سامنے اپنے درد و حزن کا اظہار کرتا رہا۔ اس کے بعد لحہ بہ لحہ ہم سید قطب اور اخوان کے دوسرے راہ نماؤں پر ہونے والے مظالم کی روداد سنتے اور پڑھتے رہے، اور اس پورے عرصے میں براہ راست ملاقات نہ ہونے کے باوجود ہمارے دل ان کے ساتھ جڑے رہے، بلکہ یہ رودادیں ہماری تربیت کا ذریعہ بنیں۔ انھی دنوں ہم ذہناً اس تعذیب کو سہنے اور اس کی سختیوں کو برداشت کرنے کی تیاری کرتے رہے جن سے ہمارے اخوانی بھائی گزرے تھے۔

۷۳-۱۹۷۲ء میں پہلی بار میں نے سفرحج کیا۔ اس سال منیٰ میں اخوان کا باقاعدہ کیمپ

لگا تھا۔ ان دنوں پشاور شہر کی جماعت اسلامی کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ قومی یا عالمی سطح پر میرا تعارف نہیں تھا۔ ایک عام کارکن کی حیثیت سے میں تھوڑی دیر کے لیے ان اللہ والوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ استاد حسن الہضیبی طویل قید سے [ناصر کے زمانے میں] رہائی کے بعد کیمپ میں شریک تھے۔ انتہائی ضعف کی حالت میں جب انھیں اپنی کرسی پر بٹھایا گیا تو اخوان کے دکھی دلوں کے زخم تازہ ہوگئے، اور سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ جب تھوڑا قرار آیا تو رونے پر قابو پا کر بلند آواز سے سب نے مل کر ذکر شروع کر دیا: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاسْتَغْفِرُاللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَ اَتُوْبُ اِلَیْهِ۔ دیر تک اللہ والے یہ ورد کرتے رہے۔ بعد میں کیمپ میں کئی اخوانی ساتھیوں کے علاوہ اردن کے اخوانی راہ نما استاذ عبدالرحمٰن خلیفہ سے بھی پہلی ملاقات ہوئی۔

اسی سال حج کے بعد میں نے عالم اسلام کا سفر کیا۔ مصر بھی گیا لیکن اخوان کے دورِ ابتلا کی وجہ سے وہاں اس کا موقع نہیں ملا کہ اخوان کے کسی راہ نما سے ملاقات کا شرف حاصل کر سکوں۔ البتہ قاہرہ اور سکندریہ کے گلی کوچوں میں امام حسن البنا اور ان کے شہید ساتھیوں کے آثار کی تلاش میں رہا۔ اس سفر کے دوران لبنان اور شام کے بعض اخوانی راہ نماؤں سے ابتدائی ملاقاتیں رہیں۔

زمانہ طالب علمی سے ہی امام حسن البنا اور سید مودودی کی محبت یکساں طور پر میرے دل میں موجود رہی ہے۔ امام حسن البنا اور مولانا مودودی کے درمیان ملاقات یا کسی قسم کے رابطے کے کوئی شواہد موجود نہیں ہیں، مگر دونوں کی شخصیت، فکر اور تحریک میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب قرآن و سنت کی مشترکہ بنیاد ہے۔ اخوان المسلمون نے ہمیشہ جماعت اسلامی کو برعظیم پاک و ہند کی تحریکِ اخوان ہی سمجھا، اور ہم نے ہمیشہ اخوان المسلمون کو عالمِ عرب میں جماعت اسلامی ہی کی قائم مقام تحریک کے طور پر دیکھا ہے۔ یہ حیرت انگیز تعلق خاطر اور افکار کی یکسانیت عصرِ حاضر میں وحدت اُمت کی مضبوط ترین اساس ہے۔

اخوان کی قیادت اور ہم نے مل کر فرقہ بندی، ذات پات، لسانیت یا علاقائیت سے بالاتر ہو کر دینی و ملّی مشترکات پر اُمت کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اس ضمن میں اخوان المسلمون کے متعدد ذمہ داران سے تبادلۂ خیالات کا موقع بھی ملا ہے۔ اخوان کے سابق مرشد عام مصطفیٰ مشہور سے اکثر و بیشتر ملاقاتیں رہیں۔ وہ کئی بار پشاور میں ہمارے مہمان رہے۔ وہ مکمل طور پر فنا فی اللہ،

اخلاص وجذبے سے معمور، اخوت سے سرشار اور دانا وبینا انسان تھے۔ یہی عالم بالترتیب تیسرے، چوتھے اور پانچویں مرشد عام عمر تلمسانی، محمد حامد ابوالنصر اور مامون الہضیبی کا تھا۔ معروف محدث اور بزرگ عالمِ دین عبدالفتاح ابوغدہ (مرحوم) میرے بڑے بھائی مولانا محمد عبدالقدوس (مرحوم) کے قریبی دوست اور ساتھی تھے۔ وہ علم وتقویٰ اور تحریکی شعور کا خوب صورت مرقع تھے۔ ان سے ملاقات علمی ذوق وشوق میں ترقی اور تحریکی وابستگی میں پختگی اور یک سوئی کا سبب بنتی تھی۔

اخوان کے بزرگ راہ نماؤں سے قریبی ملاقاتوں اور کسب فیض کا موقع اس وقت ملا جب جہادافغانستان [۱۹۷۸ء-۹۲ء] میں اخوان المسلمون نے باقاعدہ دل چسپی لینی شروع کی اور پشاور میں میرا غریب خانہ افغانوں اور اسلامی تحریکوں کا مرکز بن گیا۔ اخوان المسلمون کے کئی راہ نما اس دوران ہمارے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ سابق مرشد عام استاذ مصطفیٰ مشہور، استاذ کمال الدین سنانیری اور نائب مرشد عام ڈاکٹر احمد الملط کی میزبانی کا شرف مجھے حاصل ہوا، اوران کے ساتھ سفر کرنے کا بھی موقع ملا۔ انھی دنوں سفر میں استاذ عبدالمعز عبدالستار کا ساتھ نصیب ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے براہ راست امام حسن البنا شہید سے فیض حاصل کیا تھا۔ جوانی ہی میں امام شہید نے ان کے دل مٹھی میں لے لیے تھے اور اُن کے گہرے روحانی نقوش ان کی شخصیتوں پر ثبت ہو گئے تھے۔ میں نے ان کی خلوت وجلوت کا مشاہدہ کیا ہے۔ ان لوگوں پر اللہ کا رنگ (صبغۃ اللّٰہ) مکمل طور پر چڑھا ہوا تھا۔ ان کی باتیں ذکر کی باتیں تھیں، ان کی خاموشی اللہ کی یاد میں خاموشی تھی، اوران کی معیت میں ایک گہرا روحانی سکون محسوس ہوتا تھا۔

استاذ کمال الدین سنانیری تقریباً ۱۵ دن ہمارے گھر میں مہمان رہے۔ میں نے اپنی تحریکی زندگی میں ان جیسا للّٰہیت سے سرشار انسان کم ہی دیکھا ہوگا۔ غیرمحسوس طور پر ایک دن چھوڑ کر روزے سے رہتے تھے لیکن گھر کے لوگوں کے سوا کسی کو بھی ان کے روزے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ جب لطیف پیرائے میں کھانے پینے سے معذرت کرتے تو معلوم ہوتا کہ روزے سے ہیں۔ استاذ کمال الدین مرشدعام کے خصوصی نمایندے کی حیثیت سے افغان مجاہدین کی خدمت اور افغان قائدین میں مصالحت ویک جہتی کی خاطر آئے تھے، اوراپنی تمام تر توجہ اسی ایک مقصد کے حصول پر مرکوز رکھی۔ میں نے انھیں کبھی فارغ نہیں دیکھا۔ جب بھی فرصت کا کوئی لمحہ میسر آتا، وہ

جیب سے قرآن کریم نکالتے اور تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔ بدقسمتی سے مصر واپسی پر اس فنافی اللہ، ربانی شخصیت کو سرکاری گماشتوں نے اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا، اور دنیا سے جاتے ہوئے بھی وہ اپنے مرشدعام امام حسن البنا شہید سے مشابہ ٹھیرے۔ استاذ مصطفیٰ مشہور ہر فارغ لمحے میں کتاب اللہ کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔ استاذ عبدالمعز عبدالستار کے روحانی اثر کو میں آج ہزاروں میل کی طویل مسافت کے باوجود محسوس کرتا ہوں۔

اسی لیے میں نے آغاز میں عرض کیا کہ تحریک کا حقیقی تعارف اس سے وابستہ افراد کے اخلاق و کردار سے ہوتا ہے، اور تحریک کا بانی اپنی تحریک اور تحریکی افراد پر اپنے گہرے نقوش مرتب کرتا ہے۔ امام شہید کی روحانی کشش اس قدر شدید تھی کہ جس کا بھی ان کے ساتھ تعارف ہوا، اس کا دل ان کے ساتھ جڑ گیا۔ ان کے قریبی ساتھیوں میں ان کی تربیت کی وجہ سے ایسی جاذبیت پیدا ہوگئی تھی کہ عالم اسلام کے ہزاروں لاکھوں نوجوانوں کے دلوں میں ان کی محبت کے دیرپا نقوش ثبت ہوگئے ہیں۔

ترجمان القرآن کی اس 'اشاعت خاص' میں اخوان المسلمون کے بانی، اور مرشد ربانی کی فکر، شخصیت اور کردار و اثرات کا مطالعہ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے ــــــ یہ نہ صرف اسلامی تحریک کی بنیادی ضرورت تھی بلکہ امام حسن البنا شہید کا ہم سب پر حق بھی تھا۔ میں اس اہم علمی و تحریکی خدمت پر اس کی تیاری میں حصہ لینے والے تمام ساتھیوں کے لیے قبولیت کی دعا کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ اس میں شامل تحریریں ہمیں ایک تازہ جذبۂ عمل سے سرشار کریں۔ آمین!

❊❊❊

زمین میں جتنے درخت ہیں
اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں
اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں
تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی
بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے (لقمٰن ۳۱:۲۷)

اخوان اور اس کی قیادت

سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مصر میں شیخ حسن البنا شہید نے جس وقت احیاے اسلام کے لیے کام کرنا شروع کیا تھا، قریب قریب وہی زمانہ تھا، جب اس برعظیم پاک و ہند میں بھی ٹھیک اسی مقصد کے لیے کام شروع کیا گیا۔ دونوں کے درمیان شاید ایک دو برس کا فرق ہو، لیکن زمانہ تقریباً یکساں ہے۔ سالہا سال تک ان سے ہم اور ہم سے وہ بے خبر رہے۔ حالاں کہ ایک ہی راستے پر چل رہے تھے۔ ایک مدت دراز کے بعد جا کر ہمیں پتا چلا کہ مصر میں اخوان کی تحریک انھی مقاصد کے لیے چل رہی ہے، اور اسی طرح سے سالہا سال بعد ان کو بھی یہ معلوم ہوا کہ برعظیم پاک و ہند میں اسی طرح کی ایک تحریک کام کر رہی ہے۔ اب یہ خدا کی مشیت ہے کہ وہاں پہلے اس کے مرشد اوّل شہید ہوئے پھر مرشد ثانی بھی اپنے رب کے حضور پہنچ گئے، اور یہاں اس کام کو جس نے شروع کیا تھا وہ دونوں کا غم سہنے کے لیے آج بھی زندہ ہے۔

اخوان کی تحریک کی قدر و قیمت کا اندازہ اس ملک میں بہت کم لوگوں کو ہے۔ مگر جاننے والے جانتے تھے کہ عرب ممالک میں خصوصاً اور دنیا کے دوسرے ممالک میں عموماً احیاے اسلام کے لیے جو کام ہوا، مسلمانوں میں دینی، اخلاقی بیداری پیدا کرنے کی جو خدمت انجام دی گئی اور عوام و خواص کو حقیقی اسلام سے روشناس کرانے اور خلوص کے ساتھ اسے سربلند کرنے کی جو کوشش

دوسرے مرشد عام حسن الہضیبی کے انتقال کے موقع پر منعقد ہونے والے تعزیتی اجلاس سے خطاب، نمازِ مغرب کے باعث تقریر مکمل نہ ہوسکی، جسے بعد ازاں مولانا مودودی نے لکھ کر مکمل کیا، اور ہفت روزہ آئین میں شائع ہوئی۔

کی گئی، وہ زیادہ تر اخوان ہی کی اس تحریک کا ثمرہ ہے، جسے شیخ حسن البنا نے شروع کیا، اور شیخ عبدالقادر عودہ شہید، سید قطب شہید اور حسن الہضیبی مرحوم نے پروان چڑھایا۔

عرب ممالک میں آپ عراق سے مراکش تک چلے جائیں، ہر جگہ آپ یہی دیکھیں گے کہ جن لوگوں کو بھی اسلام سے گہرا اور قلبی تعلق ہے، وہ زیادہ تر اخوان ہی کے آدمی ہیں یا ان کی تحریک سے متاثر ہیں۔ اسی طرح امریکا اور یورپ میں بھی آپ دیکھیں گے کہ جو عرب نوجوان اسلامی جذبے سے سرشار ہیں، وہ اکثر وبیش تر اخوانی ہیں۔ حتیٰ کے اخوانیت ایک طرح سے اسلامیت کا نشان بن گئی ہے۔ کوئی آدمی تعلیم یافتہ ہو اور پھر دین دار بھی ہو تو لوگ آپ سے آپ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ضرور اخوان میں سے ہے، یا کم سے کم اس تحریک سے متاثر ہے۔ حتیٰ کہ جب اسلام دشمنی کا روگ بعض عرب ممالک کو لاحق ہوا تو ہر اس نوجوان کے پیچھے سی آئی ڈی لگ جاتی تھی، جو نماز پڑھتا نظر آتا تھا۔ یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس فتنے کے دور میں اخوان کی تحریک بر وقت برپا ہوگئی اور یہ تحریک نہ اٹھی ہوتی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ عرب ممالک لادینیت، قوم پرستی اور سوشلزم کے طوفان میں کس حد تک پہنچ چکے ہوتے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۲۵، ۳۰ سال پہلے عرب ممالک میں جو لوگ بھی اسلامی جذبے سے عاری تھے اور جن پر سیکولرزم اور قوم پرستی کا شیطان مسلط تھا، وہ سب انڈین نیشنل کانگریس کے حامی اور تصور پاکستان کے مخالف تھے۔ صرف اخوان ہی کا گروہ ایسا تھا جو پاکستان کا حامی تھا۔ آج بھی وہاں وہی پاکستان کے سب سے زیادہ خیر خواہ ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب اخوان پر پے در پے مظالم ہوئے تو یہاں [پاکستان میں] ان سے ہمدردی کرنے والے بہت کم تھے اور دشمن کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ان پر الزام لگانے والے اور تہمتیں گھڑنے والے بہت زیادہ پائے گئے۔ حتیٰ کہ جب انصاف کی مٹی پلید کر کے اخوان کو بدترین سزائیں دی گئیں اور ان کے بہترین آدمیوں کو پھانسی پر چڑھایا گیا تو یہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جنھوں نے اس پر احسنت و مرحبا کی صدائیں بلند کیں۔ افسوس کہ لوگوں کو دوست اور دشمن کی تمیز بھی نہیں رہی۔ بے شعوری میں یہ احساس تک نہیں کیا گیا کہ ہم اپنے دوستوں کو برا کہہ رہے ہیں اور دشمنوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔

ہم خلوص دل سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شیخ حسن الہضیبی کو اپنے دامن رحمت میں جگہ دے، ان کو بلند مرتبے عطا فرمائے، ان کی قربانیوں اور خدمات کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ جن لوگوں نے ان پر ظلم ڈھائے اور ۲۰ سال تک مسلسل ظلم وستم ڈھاتے رہے، اللہ تعالیٰ اپنے عدل کے مطابق ان سے انتقام لے اور جس صبر و استقامت کے ساتھ مرحوم نے دین کی راہ میں ہر تکلیف کو برداشت کیا اور اسلامی تحریک کی خدمت قید کی حالت میں بھی کرتے رہے، اس کا اجر جزیل انھیں عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ ان اخوان کو بھی بلند مرتبے عطا فرمائے، جنھوں نے فلسطین میں یہودیوں کے خلاف جنگ کی اور ایسی بہادری کے ساتھ لڑے کہ یہودی مصر اور دوسری عرب ریاستوں کی باقاعدہ افواج سے بڑھ کر اخوانیوں سے ڈرتے تھے۔ ان میں سے جو اس لڑائی میں شہید ہوئے، اللہ ان کی شہادت قبول فرمائے اور جو اس لڑائی میں لڑے اور زندہ بچے اللہ تعالیٰ ان کو مجاہد اور غازی ہونے کا اجر عطا فرمائے۔

یا اللہ! شیخ حسن البنا کو بلند مرتبے عطا فرما۔ ان کو اپنے مقربین میں جگہ دے۔ ہم گواہ ہیں کہ یہ وہی تھے جنھوں نے احیاے اسلام کی اس تحریک کو اٹھایا۔ لاکھوں نوجوانوں کی زندگیاں تبدیل کیں اور اس میں وہ روحِ جہاد پھونکی، جس کی بدولت اس وقت تک بھی ہر طرح کے ظلم وستم کے باوجود مصر کی سرزمین سے اسلامی تحریک کے اثرات نہیں مٹائے جاسکے۔

یا اللہ! ان لوگوں کی قربانیوں کو بھی قبول فرما جن کو پھانسیوں پر چڑھایا گیا۔ شیخ عبدالقادر عودہ اور سید قطب شہید کے دوسرے ساتھیوں کو وہ اجر دے جو تو نے اپنی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔

یا اللہ! ان لوگوں کو بھی بلند مرتبے عطا فرما جنھوں نے ظالموں کی جیلوں میں ہر طرح کی سختیاں برداشت کیں اور ایسے بدترین مظالم سہے جن کے تصور سے بھی انسان کا ضمیر کانپ اٹھتا ہے، لیکن ان کے قدموں میں کبھی لغزش نہ آئی اور ان میں سے کسی نے ظالموں کے آگے سر نہیں جھکایا، حالاں کہ ان کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ تیرے دین حق کی سربلندی چاہتے تھے۔ (ہفت روزہ آئین، لاہور، شخصیات، ص ۳۰۷-۳۱۰)

○

مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی کے بارے میں مولانا مودودی نے فرمایا تھا کہ وہ: ''اخوان المسلمون کے بانی شیخ حسن البنا کے ذاتی دوست تھے۔ انھوں نے اخوان کی دعوت کے بارے میں کہا تھا کہ جہاں میرا کام ختم ہوتا ہے وہاں سے اخوان کا کام شروع ہوتا ہے۔ اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد اخوان نے رضا کار بھرتی کر کے یہودیوں کے خلاف جہاد شروع کیا، تو مفتی صاحب ان کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ جب ۱۹۵۴ء میں اخوان پر ابتلا کا دور آیا تو انھوں نے اخوان کے ساتھ صدر ناصر کے سلوک پر شدید احتجاج کیا تھا۔ پھر جب [۱۹۵۴ء میں] اخوان کے نام ور قائدین کو پھانسی کی سزا کا حکم دیا گیا تو انھوں نے اسے ذاتی طور پر تار دیے تھے کہ سزا نافذ نہ کی جائے۔ ۱۹۶۶ء میں سید قطب اور ان کے ساتھیوں کی شہادت پر بھی انھوں نے شدید احتجاج کیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اخوان کا جذبۂ جہاد ان کے ابتلا کا باعث بنا، کیونکہ اسرائیل اور یہودیوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی اصل مخالف قوت دنیاے عرب میں کون سی ہے۔ اس لیے امریکا اور [اشتراکی] روس دونوں کی خواہش یہ تھی کہ اسلام کی اس اُبھرتی ہوئی طاقت کو کچل ڈالا جائے۔ افسوس کہ یہ مقصد تو کفار کا تھا، مگر پورا مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔ (رفیق ڈوگر ہفت روزہ استقلال، لاہور، ۱۴ جولائی ۱۹۷۵ء۔ مولانا مودودی کے انٹرویو، دوم، ص ۲۸۶-۲۸۷)

٭٭٭

فنا فی اللہ انسان، امام البنا

میاں طفیل محمد○

○ **سوال: محترم میاں صاحب، آپ نے پہلی بار امام حسن البنا کا نام کب اور کیسے سنا؟**

● **جواب: میاں طفیل محمد صاحب:** یہ ۱۹۴۹ء کے اوائل کی بات ہے، جب میں، مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے ہمراہ ملتان جیل میں قید تھا، اسی زمانے میں ان کی شہادت ہوئی۔ اسی وقت ہمیں ان کے بارے میں یہ معلومات حاصل ہوئی تھیں کہ سر بازار ان کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا ہے۔ اُس وقت تک ہمارے اور ان کے درمیان براہ راست معلومات اور رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

○ **اخوان المسلمون کے جماعت سے پہلے رابطے کے بارے میں آپ کچھ بیان فرمائیں۔**

● ہمیں خود تو معلوم نہیں تھا کہ اخوان کو کس زمانے میں ہمارے بارے میں معلومات ملیں،

○ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے دست راست اور ان کے بعد امیر جماعت اسلامی پاکستان (۱۹۷۲-۸۷ء) ۹۲ برس کی عمر میں خدا کے دین کی جدوجہد کے لیے دعاگو ہیں اور اگرچہ یادداشت کافی متاثر ہو چکی ہے لیکن مقدور بھر تحریکی سرگرمیوں اور اُمت کے احوال سے باخبر رہتے ہیں۔ وہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور کے چیئرمین ہیں۔ امام حسن البنا پر ترجمان القرآن کی اشاعت خاص کے لیے یہ انٹرویو: عبدالغفار عزیز، پروفیسر خالد محمود اور حافظ محمد عبداللہ نے رمضان المبارک سے چند روز پہلے ۱۴۲۷ ہجری، ۲۲ ستمبر ۲۰۰۶ء کو ریکارڈ کیا اور سلیم منصور خالد نے مرتب کر کے ۸ فروری ۲۰۰۷ء کو محترم میاں طفیل محمد کو سنایا۔

البتہ کویت کے ایک تاجر جو امام البنا کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے' جناب عبدالعزیز المطوع [م: ۱۹۹۶ء] نے ہمیں بتایا کہ: ''۴۲-۱۹۴۱ء کے زمانے میں بمبئی میں میرا کاروبار تھا اور میں بمبئی ہی میں زیادہ وقت گزارتا تھا۔ اسی زمانے میں، ترجمان القرآن بھی پڑھتا تھا' اور اس کے مضامین کو عربی میں ترجمہ کر کے مرشد عام حسن البنا کو قاہرہ بھیجا کرتا تھا''۔ تاہم حسن البنا کے بارے میں تو ان کی شہادت کے موقعے پر ہی پاکستان کے لوگوں کو زیادہ تر معلومات حاصل ہوئیں اور مولانا مودودی کو بھی اسی زمانے میں زیادہ تفصیلات ملی تھیں۔

○ کیا عبدالعزیز مطوع اُردو جانتے تھے؟

● بمبئی میں ان کا کاروبار تھا اور وہ اُردو جانتے تھے۔

○ عبدالعزیز مطوع کا اس دور میں براہ راست جماعت یا آپ یا مولانا مودودی سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا؟

● نہیں اس زمانے میں براہ راست رابطہ نہیں ہوا تھا۔

○ مولانا محترم سے عبدالعزیز المطوع کی ملاقات ہوئی ہے؟

● ۱۹۴۷ء کے بعد کے زمانے میں ملاقات رہی۔ عبدالعزیز مطوع اور ان کے چھوٹے بھائی عبداللہ علی مطوع [م: ۲۰۰۶ء] بڑے مخیّر انسان تھے۔ عبداللہ علی مطوع مولانا مودودی کی تعزیت کے لیے ۱۹۷۹ء میں لاہور تشریف بھی لائے تھے۔ ان سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز انھوں نے اپنی چیک بک میرے سپرد کرتے ہوئے کہا: ''یہ آپ کے حوالے ہے۔ آپ جو چاہیں ان کا استعمال کریں''۔

میں نے ان سے کہا: ''میں آپ سے کچھ اور تو نہیں کہتا ہوں۔ البتہ منصورہ میں ہمارے دفاتر کے ہمسایے میں شائی فلم سٹوڈیو ہمارے سر پر سوار ہے' اس سے ہمیں بہت زیادہ تکلیف ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ اس کو بیچنا بھی چاہتے ہیں۔ اگر اس سلسلے میں آپ کوئی مدد کر سکیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا''۔ انھوں نے جواب میں کہا: ''اس کا سودا کر لیں اور جتنا اس کا عوضانہ ہو وہ مجھے بتا دیں''۔ چنانچہ ۵۷ لاکھ روپے میں متعلقہ ٹرسٹ نے شائی اسٹوڈیو کی یہ بلڈنگ خرید لی' اس کی بیش تر ادایگی عبدالعزیز مطوع اور عبداللہ علی المطوع نے کی۔ اس اسٹوڈیو کے بڑے ہال

میں منصورہ ہسپتال، پروجیکشن ہال میں منصورہ آڈیٹوریم، جب کہ لیبارٹری میں ادارہ معارف اسلامی کا دفتر اور ایک بڑی لائبریری قائم کی گئی۔

○ امام البنا کی شہادت کے بعد' اخوان سے رابطہ کیسے ہوا؟

● قیامِ پاکستان کے بعد جماعت کے شعبہ عربی کے سربراہ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے جب عرب ممالک کا کئی ماہ کا دورہ [۲۸ اپریل-۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء] کیا تھا، اس وقت انھوں نے حسن البنا اور اخوان المسلمون کے بارے معلومات حاصل کی تھیں اور عرب کے جو اصحاب علم وفہم تھے، ان کے ساتھ رابطہ بھی قائم ہوا تھا۔ مسعود عالم ندوی صاحب نے اپنی کتاب دیار عرب میں چند ماہ میں ان مشاہدات اور روابط کا ذکر کیا ہے۔

○ مصر میں اخوان پر توڑے جانے والے مظالم کے باعث حسن البنا شہید کے داماد سعید رمضان جب پاکستان آئے تھے ان سے آپ کی کوئی ملاقات ہوئی ؟

● جی ہاں' سعید رمضان مرحوم [م: ۱۹۹۵ء] سے ملاقاتیں رہی ہیں۔

○ مولانا مودودی سے سعید رمضان کی ملاقات ہوئی تھی؟

● بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ مولانا ان سے محبت کرتے اور عقیدت رکھتے تھے۔

○ آپ نے اخوان پر مظالم کے خاتمے کے لیے حکومت مصر کے ساتھ رابطہ کرکے اس آزمایش سے کچھ نکالنے کے لیے کاوش کی تھی ؟

● میں نے ازخود مصری حکومت سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، بلکہ حکومت مصر نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ یہاں پاکستان میں مصر کے سفیر نے مجھ سے متعدد ملاقاتیں کیں۔

○ یہ کب کا ذکر ہے ؟

● یہ ۱۹۸۲ء کا زمانہ تھا۔ اسلام آباد میں مصر کے سفیر صاحب نے مجھ سے ملاقات کے دوران میں کہا: ''ہماری حکومت چاہتی ہے کہ آپ مصر کا دورہ کریں۔ آپ کو ہم وزیر کے درجے کا پروٹوکول دیں گے۔ ہماری کوشش ہے کہ اخوان کے ساتھ رابطے کی کوئی صورت پیدا ہو''۔ حسنی مبارک صاحب ہی اس وقت مصر کے صدر تھے۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

''اس خدمت کے لیے میں تیار ہوں''۔ چنانچہ میرے ہمراہ پروفیسر برہان الدین ربانی صاحب، پروفیسر خورشید احمد صاحب اور خلیل احمد حامدی صاحب پر مشتمل وفد مصر گیا۔ مصری حکام نے کھلے دل سے ہماری میزبانی کی۔

اس قیام کے دوران میں صدر حسنی مبارک سے بھی ہماری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا: ''آپ اخوان کے قائد عمر تلمسانی سے ملیں اور ان کو اس بات کے لیے آمادہ کریں کہ وہ تصادم کے بجائے کوئی راستہ نکالیں اور اس طرح ایک دوسرے کو گرانے کی یہ صورت ختم ہو''۔ چنانچہ میں نے اخوان کے تیسرے مرشد عام عمر تلمسانی سے ملاقاتیں کیں، اور ان سے کہا: ''بھائی' یہ جو صورت ہے' یہ نہ آپ کے لیے مفید ہے اور نہ ان کے لیے مفید ہے۔ کوئی ایسا راستہ نکالنا چاہیے کہ وہ بھی کچھ ڈھیلے پڑیں اور آپ بھی کچھ اپنی سختی کو کم کریں، تا کہ دعوتی سرگرمیوں کے لیے بہتر صورت پیدا ہو سکے''۔ اس مذاکراتی عمل کے نتیجے میں کوئی براہ راست ملاقات عمر تلمسانی اور حسنی مبارک کے درمیان تو نہیں ہوئی، تاہم ہمارے ذریعے غائبانہ طور پر اُن دونوں کی بات، ایک دوسرے تک پہنچی۔

اپنی ملاقات میں' مَیں نے صدر حسنی مبارک سے کہا: ''معاملات کو مثبت رخ دینے کے لیے آپ اخوان کو اخبار نکالنے کی اجازت دے دیں''۔ حسنی مبارک اس پر راضی ہو گئے اور کہا: ''وہ اس پرچے میں زیادہ سختی نہ کریں، ہم بھی کوئی ایسی بات نہیں کریں گے۔ وہ کوئی اخبار نکال کر کام شروع کر دیں''۔ چنانچہ اس طرح سے انھوں نے اخوان کو اخبار نکالنے کی اجازت دے دی۔ اسی سفر کے دوران میں عمر تلمسانی کے علاوہ مصطفیٰ مشہور سے قاہرہ میں میری ملاقاتیں ہوئیں۔ عمر تلمسانی کے بعد حامد ابوالنصر مرشد عام بنے تھے' وہ بھی ان ملاقاتوں میں موجود تھے۔

○ مصر میں آپ کے مذاکرات میں اخبار نکالنے کے علاوہ دیگر کون سے نکات زیر بحث آئے؟

● بس ہم نے ان کو یہی سمجھایا، بھائی' وہ بھی کچھ نرم پڑیں اور آپ بھی کچھ نرم پڑیں۔ اس طرح سے کہ اخوان کو بھی کام کرنے کی آسانی ملے اور حکومت بھی اپنے مظالم سے باز آئے۔

○ اخوان کے گرفتار کارکنوں کی رہائی کا معاملہ بھی یقیناً زیر غور آیا ہوگا؟

● بات عمومی نوعیت کی تھی' کہ رویوں میں تبدیلی آنا چاہیے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے زیرحراست افراد پر گفتگو نہیں ہوئی۔

○ کیا یہ معاملات کسی معاہدے کی صورت میں طے ہوئے تھے؟

● تحریری تو نہیں، لیکن باہم اعتماد کے ساتھ یہ چیزیں طے ہوئی تھیں۔ بات یہ ہے کہ اخوان نے تو ہمیشہ سے مذاکرات کے عمل کو خوش آمدید کہا ہے۔ ظلم تو حکومت کی طرف سے ہوتا آیا ہے۔ اسلامی تحریکوں کا یہ اصول کہ ہم پرامن جدوجہد کریں گے اور یہ فہم و شعور کہ ہم پُرامن رہیں گے میرا خیال ہے کہ اسلامی تحریکوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔

○ اس کے بعد صدر حسنی مبارک یا حکومت مصر کے ساتھ آپ کاکوئی رابطہ نہیں ہوا؟

● نہیں اس کے بعد کم از کم میرا کوئی رابطہ مصری حکومت سے نہیں ہوا۔

○ برہان الدین ربانی صاحب کو وفد میں آپ نے شریک کیا تھا؟

● جہاں تک یاد پڑتا ہے کہ مصری حکومت ہی نے ان کو بھی دعوت دی تھی۔

○ کتنے دن آپ مصر میں مصروف رہے؟

● غالباً پانچ چھے دن رہے تھے، جس کے بعد میں اور خلیل صاحب تو کینیا چلے گئے جب کہ خورشید صاحب واپس پاکستان آ گئے۔ کینیا میں ہم ۱۲' ۱۳ دن تک رہے' جہاں عبداللہ علی مطوع صاحب نے کئی مساجد تعمیر کرائی تھیں۔ ہم نے وہ مساجد اور ان کے دیگر رفاہی پراجیکٹ دیکھے۔

○ پُرامن جدوجہد اور مسلح جدوجہد میں آپ کیا فرق دیکھتے ہیں۔ دونوں کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

● مولانا مودودی اور امام البنا نے دعوتِ دین اور اقامتِ دین کے لیے جو راستہ ہمیں دکھایا ہے' وہ یہی ہے کہ پرامن اور بغیر تشدد کے تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ خفیہ طریقوں سے آگے بڑھنے کے بجائے کھلے عام سرگرمیاں کی جائیں۔ افہام وتفہیم کا راستہ ہی

درحقیقت کامیابی کا راستہ ہے اور اسی سے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ بن سکتا ہے۔تشدد اور مسلح کارروائیوں کے ذریعے سے کام خراب تو ہوسکتا ہے، بنتا نہیں ہے۔تشدد کے واقعات کو مدمقابل قوتیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں اور اندھادھند ظلم و زیادتی کرتی ہیں۔ جب کہ تشدد کا راستہ اختیار کرنے والوں کے ہاتھ میں سوائے تباہی اور انتشار کے کچھ نہیں آتا۔

○ فلسطین میں اخوان کے جہاد کے حوالے سے کوئی بات آپ فرمائیں گے؟

● اخوان نے جہاد فلسطین میں بہت زبردست کردار ادا کیا ہے۔ بڑی قربانیاں ہیں ان کی، بہت سارے لوگ شہید ہوئے اور جگہ جگہ سے انھوں نے جہاد میں حصہ لینے کے لیے رضاکار بھیجے۔اس اعلیٰ درجے کی تنظیم کو جو عرب ممالک میں مقبولیت حاصل ہوگئی تھی، اسی وجہ سے مغربی سامراج کے آلہ کار، کمیونسٹ، عرب قوم پرست اور پھر وہاں کا فوجی ڈکٹیٹر جمال ناصر، وغیرہ ان کے دشمن بن گئے تھے۔ ناصر نے اخوان کے کارکنوں، جن میں مرد، نوجوان اور خواتین شامل ہیں، ان پر بے انتہا ظلم کیا۔انھوں نے جتنی سختیاں برداشت کی ہیں، میرا خیال ہے کہ تاریخ میں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔نہ اس قدر بڑے پیمانے پر ایسی صورت حال سے کسی کو سابقہ پیش آیا اور نہ کسی نے اتنی تکالیف اور مشکلات برداشت کیں۔ بلاشبہہ اخوان نے راہ عزیمت کی تاریخ میں کمال درجے کی مثال قائم کی۔

ان تمام مظالم کے باوجود اخوان کی قیادت اور اس کے کارکنوں نے کوئی کمزوری نہیں دکھائی۔ان سے وابستہ مردوں،عورتوں اور نوجوانوں نے ان تکلیفوں اور اذیتوں کا بڑی جرأت اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ زمین میں گاڑ کر ان بے گناہوں پر کتے تک چھوڑے گئے۔حکمرانوں کے مظالم کبھی کسی تحریک اور فکر کو ختم نہیں کرسکتے۔آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اور ان سے پیش تر انبیا پر بھی ظلم ہوئے ہیں اور وہ جواب میں اتنے ہی زیادہ مضبوط ہوئے ہیں۔

یہاں بھی آپ دیکھیں، الحمدللہ زیادہ مضبوط تو جماعت اسلامی ہی ہوئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اور مسلمانوں کو یہ قوت اور ہمت عطا فرمائی ہے کہ یہ ایسی صورت حال کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس باقی تحریکیں چند دن کے لیے اٹھتی ہیں، زور دکھاتی ہیں اور اس کے بعد ختم ہوجاتی

ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اخوان جب سے شروع ہوئے مسلسل چل رہے ہیں۔ مولانا مودودی نے بھی جو تحریک شروع کی ہے الحمدللہ وہ بھی مسلسل آگے ہی بڑھ رہی ہے، پیچھے نہیں ہٹ رہی۔

○ مصر میں جب اخوان پر حکومت نے ہر راستہ بند کردیا تو ایک گروہ اخوان کے مرکزی دھارے سے الگ ہو کر ردعمل میں مسلح راستے پر چل پڑا کہ: حکمران طبقے ویسے بھی ہمیں مار رہے ہیں تو کیوں نہ انھیں مار کر مریں ؟

● بلاشبہہ سیاسی، علاقائی اور مذہبی جماعتوں کے اندر کچھ تشدد پسند لوگ اپنی جگہ بنا لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سختی کا جواب سختی میں ہے اور اسی راستے کام آگے بڑھے گا۔ حالانکہ آنکھیں بند کر کے یہ نتیجہ نکالنا کوئی درست طرزِ عمل نہیں ہے۔ ایک تعمیری اور اصلاحی تحریک کو دراصل اپنے اصل ہدف، اپنے کام کے پھیلاؤ اور اس معاشرے کے احوال و ظروف کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا چاہیے۔

○ امام البنا کی شخصیت ، زندگی اور تحریک کا جائزہ لیں تو آپ کے ذہن میں ان کا کیا خاکہ بنتا ہے ؟

● مولانا سید ابوالاعلیٰ کی طرح مرشد عام حسن البنا شہید بھی درحقیقت ایک فنا فی اللہ انسان تھے۔ ان کا جو بھی دعوتی، تحریکی اور اجتماعی کام تھا، اس میں تشدد کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا۔ اپنی زندگی میں انھوں نے کبھی بھی اپنے ساتھیوں کو اس راستے پر نہیں ڈالا۔ وہ کھلے عام دعوت، تزکیے، خدمت اور رائے عامہ ہموار کرنے کے راستے پر گام زن رہے۔ تاہم جہاد فلسطین اور نہر سویز پر سے برطانیہ کے قبضے کو ختم کرانے کے لیے انھوں نے کھلے عام اعلان کر کے رضا کاروں کی تنظیم اور فکری تربیت کا کام کیا تھا، جسے مغربی مصنفین اور سیاسی قائدین نے اپنے غاصبانہ قبضے کے برعکس دوسرا نام دیا۔ اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مولانا مودودی اور حسن البنا، مسلم ممالک کے اندر ایسی کسی کارروائی کے طرف دار نہیں تھے جو تشدد اور انارکی کی طرف لے جاتی ہو۔

○ اخوان کے نظام تربیت کے بارے میں آپ کی کیا راے ہے؟

● اخوان کے طریق تربیت میں ایک طرح سے صوفیانہ اثرات بھی موجود رہے ہیں۔

ان کے برعکس مولانا مودودی کا طریقہ یہ رہا ہے کہ انسان کے فہم کو درست کیا جائے۔ ایمان اور جواب دہی کے احساس کی حقیقت کو انسان اپنے اندر جذب کر لے اور کسی حالت میں بھی اس سے نہ ہٹنے پائے۔ سختی میں بھی اور نرمی میں بھی، کسی بھی حالت میں زیادتی نہ کی جائے۔

○ مولانا نے کبھی یہ ہدایت فرمائی کہ اخوان کا لٹریچر اردو میں آنا چاہیے، یا اس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں ؟

● مولانا مودودی نے اخوان سے وابستہ حضرات کی تحریروں کے ترجمے کی حوصلہ افزائی فرمائی، اور بعض کتب کے ترجمے بھی کرائے، مثلاً عبدالقادر عودہ شہید کی معروف کتاب التشریع الجنائی فی الاسلام (اسلام کا قانونِ فوج داری) کے ترجمے کے لیے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب سے کہا اور پھر متعدد کتابوں کے ترجمے خلیل احمد حامدی مرحوم اور پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے کیے، جنھیں مولانا مودودی نے اپنے ماہ نامے ترجمان القرآن میں بڑے تسلسل سے شائع کیا۔ مولانا مودودی خود ایک معلم تھے، اس لیے انھوں نے لوگوں کو سکھایا ہے۔ مولانا مودودی فرمایا کرتے تھے میں نے جو کچھ پایا ہے قرآن ہی سے پایا ہے اور قرآن کو جب میں نے آنکھیں کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ انسان کی بنیادی رہنمائی کے لیے سب کچھ اسی میں موجود ہے۔ مولانا مودودی کا استاد قرآن مجید تھا اور شارح صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک تھی۔

○ آپ نے شروع میں فرمایا ہے کہ عبدالعزیز المطوع ترجمان القرآن کے مضامین ترجمہ کر کے حسن البنا شہید کو بھیجتے تھے۔گویا کہ امام حسن البنا، مولانا مودودی اور جماعت کی فکر سے واقف ہوئے ہوں گے اور استفادہ بھی کیا ہوگا؟

● حسن البنا شہید بہت مخلص، فنا فی الدعوت اور فنا فی التحریک انسان تھے۔ یقیناً ان کو ایسی جو بھی معلومات ملی ہوں گی، انھوں نے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔

○ آپ مصر اور دیگر مسلم ممالک میں اسلامی تحریکوں کا کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟

● مصر اور عرب دنیا میں یہودیوں اور ان کے سرپرست عیسائی حکمرانوں نے اودھم مچا رکھا

ہے اور تمام کفار اور ظالم قوتیں ان کی پشت پر ہیں۔

○ اللّٰہ تعالیٰ اس مساعی کو قبول فرمائے۔ الحمد للّٰہ دنیا بھر میں اسلامی تحریکوں سے وابستہ حضرات آپ کی اس مساعی کے معترف اور احسان مند ہیں' اور اللّٰہ تعالیٰ سے اس کی قبولیت کے لیے دعاگو ہیں۔

● میں نے مولانا مودودی کی رہنمائی میں اپنا سارا وقت جماعت کے تنظیمی' دعوتی اور تربیتی کام کو آگے بڑھانے کے لیے صرف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے نہ کوئی بہت زیادہ مطالعہ کرسکا ہوں اور نہ کوئی دوسرا کام کیا۔ بس اسی کام کو مضبوط کرنے، بڑھانے اور اسی پر توجہ دینے میں لگا رہا ہوں۔ میرے پاس کوئی خاص قابلیت بھی نہیں ہے۔ بس' مولانا مودودی مرحوم و مغفور نے صرف ایک مرتبہ کہا: ''دعوت' تنظیم اور تربیت کا یہ کارِ عظیم تمھارے سپرد کر رہا ہوں' اس کے اوپر اپنی تمام توجہات کو مرکوز کیے رکھو''۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے مولانا مودودی کو کبھی پریشان نہیں کیا، غمگین نہیں کیا، الحمدللہ کبھی کمزوری نہیں دکھائی اور حتی المقدور ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی ہے۔ بلاکسرنفسی مجھے اعتراف ہے کہ نہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے اور نہ میرے اندر کوئی خاص فہم و فراست ہے۔ میں جتنا قرآن وسنت کے مطالعے کے بعد اور جو کچھ مولانا مودودی سے سمجھا ہوں اسی کو مضبوط کرنے اور اسی کو پھیلانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

یہ ۱۹۸۷ء کی بات ہے میں اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کرتا تھا کہ اب میرے اندر کام کرنے کی زیادہ طاقت نہیں رہی، جماعت کے چند مخلص ساتھیوں نے مجھ سے کہا: ''جس طرح مولانا مودودی نے اپنی زندگی میں ہی ذمہ داریاں منتقل کردی تھیں، اس طرح کسی کو آگے لانے کی کوشش کریں''۔ میں نے ارکان جماعت سے درخواست کی کہ دوبارہ مجھے منتخب نہ کیا جائے' ارکانِ جماعت نے قاضی صاحب کو امیر جماعت منتخب کرلیا جو میرے ساتھ سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

○ اس ضعیفی کی حالت میں بھی آپ کے جو معمولات ہیں، جو فکری یک سوئی ہے، تحریک کے ساتھ جس درجہ وابستگی ہے اور

پھر صحت کی خرابی کے باوجود نماز کی جس طرح سے پابندی ہے۔ فرمائیے آپ کو کیا چیز مدد دیتی ہے؟

● اور کچھ نہیں صرف احساسِ فرض ہی ہے جی! میں کہتا ہوں کہ تادم آخر اس طرح سے اپنا کام کرتا رہوں۔ اب میری دعا زیادہ یہی ہوتی ہے کہ یا اللہ چند روز بعد آنے والا صیامِ رمضان مجھے نصیب کر اور مجھے قیامِ رمضان کی توفیق دے، پھر اس کے بعد جو بھی آپ کا فیصلہ ہو...... میں یہی دعا کرتا رہتا ہوں، یا اللہ اس رمضان میں مجھے پوری طرح سے حاضری کی توفیق عطا کر، صیام رمضان کی بھی اور قیام رمضان کی بھی۔ یہ روزے میں خیریت سے پورے کرلوں، یا اللہ اس کے بعد جو آپ کا فیصلہ ہو سو ہو۔

○ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں، آپ کے معمولات میں اور عبادات میں برکت دے اور اسے قبول فرمائے۔

● میں اپنے رب سے یہی دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ تو میری آنکھوں کو اتنی بصارت دے کہ میں مسجد خود چلا جایا کروں، دوسروں کو میں یہ تکلیف نہ دوں کہ وہ مجھے مسجد میں لے جایا کریں۔ یا اللہ، مجھے خود مسجد آنے جانے کے قابل بنادے۔

○ سبحان اللہ، یہ سب بچے بھی آپ کی آنکھیں ہیں۔

● جی الحمدللہ، میرے اوپر اللہ تعالیٰ نے اتنا فضل کیا ہے اور میں کہتا ہوں کہ شاید ہی کسی کے اوپر ایسا کرم ہو، کوئی حد نہیں اس کے فضل اور احسان کی۔ میری آٹھ بیٹیاں ہیں اور چار بیٹے ہیں۔ خدا کے فضل سے سب نیک ہیں، تابع فرمان ہیں، خدمت گزار ہیں، محبت کرنے والے ہیں اور کبھی کسی نے اُف تک نہیں کی ہے۔

○ اللہ تعالیٰ ان سب کو آپ کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ یہ سب آپ کی طرح اسلامی تحریک کی تقویت کا باعث بنیں۔

● دنیا کے معیار کے حوالے سے اگر یہ کہوں کہ ایک پیسہ بھی میرے پاس نہیں ہے اور ایک پیسہ بھی کمانے کے قابل میں نہیں ہوں۔ لیکن میرے لیے یہ امر نہ کسی حسرت کا باعث ہے اور نہ کسی محرومی کا ذریعہ، بلکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے مجھے سب کچھ دیا ہوا ہے۔ یہ ایمان کی دولت،

یہ مکان اور یہ ساری نعمتیں، الحمدللہ، الحمدللہ۔

○ جماعت اسلامی کے ساتھ وابستگی کے اس ۶۵ برس کے پورے زمانے میں آپ کی سب سے قیمتی یاد اور قیمتی اثاثہ کیا ہے؟

● جی سچی بات یہ ہے کہ ایمان کی دولت کے بعد میں مولانا مودودی کی رفاقت سے زیادہ کس چیز کو قیمتی کہوں؟ دین کی راہ پر چلتے ہوئے مولانا مودودی نے ساری عمر کبھی ایک منٹ کے لیے بھی مجھ سے کسی خفگی یا کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ محبت سے پیش آئے اور ہمیشہ بھائی کی حیثیت سے میرے ساتھ حسن سلوک کیا کہ جیسے میں ان کا رفیق کار ہوں، کوئی شاگرد اور ماتحت نہیں ہوں۔ اپنے ایک عزیز رفیق کی حیثیت سے ہی ہمیشہ انھوں نے میرے ساتھ معاملہ کیا۔ میں نے مولانا مودودی کو اخلاق میں، کردار میں، گفتار میں، احسان میں اور سلوک میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کرنے والا ایک اُمتی ہی پایا ہے۔

○ اس وقت ساری عالمی شیطانی قوتوں کا اصل ہدف بالخصوص اسلامی تحریک اور بالعموم عالم اسلام کے نوجوان ہیں، اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟

● بس جی، انھیں قرآن، سنت اور سیرت طیبہ سے جوڑا جائے۔ میرے فہم کی حد تک اس مقصد کے لیے ان کو مولانا مودودی کا لٹریچر پڑھایا اور اس سے وابستہ کیا جائے۔ اس کے لیے جو بھی ذرائع ہیں ان کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا جائے، بلکہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بیت المال کی کچھ مدات میں کفایت کر کے وسائل خرچ کرنے چاہییں۔ یہ لٹریچر انھیں ایمان، قرآن، سنت، اسوۂ نبویؐ، امت مسلمہ اور اُمت کے مفاد سے جوڑ دے گا۔

○ کیا شیطانی قوتیں اور ان کے آلہ کار کامیاب ہوجائیں گے؟

● یہ کیسے ممکن ہے۔ اسلام نے تو غالب آنا ہے، ان شاءاللہ اسلام ہی غالب آئے گا۔

○ اخوان اور عرب دنیا میں اسلامی تحریک سے رابطے یا کسی اور پہلو پر آپ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے؟

● مولانا مسعود عالم ندوی بڑے مخلص، بڑے جاں نثار اور بڑے فاضل انسان تھے۔

علما میں ان سے زیادہ مخلص، مولانا کا مداح، مددگار میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ اسی طرح محمد عاصم الحداد مرحوم نے مولانا مودودی کی کتب کے ترجمے کے لیے بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ پھر خلیل احمد حامدی صاحب نے اپنی ساری زندگی اس کام میں لگادی۔ عملاً ان تین افراد نے عالمِ عرب میں اسلامی تحریک سے تعلق کو تقویت دی، علمی رابطے بڑھائے اور دعوت دین کی سرگرمیوں میں بنیادی نوعیت کا کام کیا، اور ان کے ساتھ ہمارے چوتھے ساتھی چودھری غلام محمد مرحوم کی خدمات بڑی ہی گراں مایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان احباب کی خدمات کو قبول فرمائے۔

○ میاں صاحب کوئی اور بات جو آپ اسلامی تحریکوں کے حوالے سے فرمانا چاہیں ؟

● اس وقت فوری طور پر میرے ذہن میں کوئی بات نہیں آرہی، البتہ پروفیسر خورشید احمد تحریک اسلامی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ میں ترجمان القرآن پورا اوّل سے لے کر آخر تک حرف بہ حرف سنتا ہوں۔ ماشاء اللہ، خورشید صاحب اشارات بڑی محنت سے، جرأت سے اور کسی خوف کو خاطر میں لائے بغیر لکھتے ہیں۔ صحت پتا نہیں کیسی ہے، خورشید صاحب کی؟ میں رات دن ان کی صحت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزاے خیر عطا فرمائے، صحت اور طاقت دے، اپنے دین کی خدمت کے لیے زندہ سلامت رکھے۔

***

شہید بیٹے، خدا حافظ!

احمد عبدالرحمٰن البناؒ

حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ، فرزندِ رسولؐ ابراہیم کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، بچے کو منگوایا گیا، آپؐ نے بیٹے کی میت کو سینے سے لگایا۔ میں نے دیکھا کہ آں حضورؐ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں، اور آپؐ نے فرمایا: ''آنکھیں روتی ہیں، دل غمگین ہے، لیکن ہم اس بات کے علاوہ کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالتے کہ جو ہمارے رب عزوجل کو راضی کرتی ہو، واللہ اے ابراہیم! ہم تمھارے فراق پر بہت غم زدہ ہیں: انا للّٰہ و انا الیہ رٰجعون

میرے لختِ جگر حسن! مجھے آج تمھارے ساتھ بیتے دو واقعات یاد آرہے ہیں۔ ایک تب کہ جب تو ابھی چھے ماہ کا شیر خوار بچہ تھا۔ ایک رات جب میں بہت دیر سے گھر لوٹا تو دیکھا کہ تم اپنی والدہ کے پہلو میں گہری نیند سوئے ہوئے ہو۔ میں نے تمھیں دیکھا تو محبت کی ایک لہر میرے دل میں اتر گئی، لیکن اگلے ہی لمحے میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک

ؒ احمد عبدالرحمٰن البنا، امام حسن البنا کے والد۔ ۱۸۸۲ء میں شمشیرہ نامی قصبے میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں قرآن کریم حفظ کیا اور گھڑی سازی کا کام سیکھا۔ دینی دارالعلوم اسکندریہ سے تعلیم مکمل کی اور محمودیہ منتقل ہوگئے۔ گھڑی سازی اور حصول علم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں قاہرہ منتقل ہوگئے، جہاں علما ازہر سے رابطہ رہا۔ آپ نے ۲۴ جلدوں پر مشتمل مسند امام احمد کے علاوہ مسند امام شافعی کی ترتیب، تنقیح اور تشریح کا عظیم علمی کارنامہ انجام دیا۔ ۷۶ سال کی عمر میں نومبر ۱۹۵۸ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ترجمہ: عبدالغفار عزیز

لمبا سانپ کنڈلی مارے تمارے سر کے پاس بیٹھا ہے، اس نے اپنا پھن پورا پھیلایا ہوا ہے، اور اس کے اور تمھارے سر کے درمیان فاصلہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ مجھے لگا میرا دل حلق میں آن اٹکا ہے۔ میں فوراً اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا، اور اس کی بارگاہ میں استدعا کی کہ دل کو قرار آئے۔ بے اختیار میری زبان پر سانپ کے ڈنک اور اذیت سے محفوظ رہنے کی دعا جاری ہوگئی۔ دعا ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ سانپ نے سر جھکایا اور چپکے سے اپنی راہ لی۔ میرے پیارے بیٹے، اللہ نے اپنے اذنِ خاص سے اور تمھارے لیے کیے ہوئے اپنے کسی اہم فیصلے کی خاطر تمھیں بچالیا۔

میرے لختِ جگر! آج مجھے دوسرا منظر وہ یاد آرہا ہے جب تیرا لاشہ میرے سپرد کیا گیا تھا۔ میں نے رات کی تاریکی میں خون میں نہائی تیری میت اٹھائی، تو تیرا جسم گولیوں سے چھلنی تھا اور تیری روح پرواز کرچکی تھی۔ جنگل کا سانپ تو تجھے تکلیف پہنچانے سے ڈر گیا، لیکن صد افسوس کہ انسانی سانپ تیری لاش کو ڈستے رہے۔ اس المناک لمحے میں صرف اللہ وحدہ کی قدرت ہی نے ہماری ڈھارس بندھائی، وگرنہ ہم کبھی یہ صدمہ برداشت نہ کرپاتے۔

میری جان! میں نے تمھارے پیارے چہرے سے چادر ہٹائی تو مجھے نور کی کرنیں لپکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ تیرے چہرے پر شہادت کی آسودگی ہی آسودگی تھی۔ تب آنکھیں نم ہوگئیں، دل زخمی اور غمگین تھا، لیکن ہم نے اللہ کو راضی کرنے والے کلمے انا للّٰہ و انا الیہ رٰجعون کے علاوہ کچھ نہ کہا۔

پیارے بیٹے! پھر میں نے تمھیں غسل دیا، کفن پہنایا اور اکیلے نے تمھاری نماز جنازہ ادا کی۔ پھر میں اس عالم میں تمھارا جنازہ لے کر نکلا کہ گویا میرے نصف جسم نے اپنے ہی نصف وجود کی میت اٹھائی ہوئی ہو۔ میں اس کے علاوہ مزید کچھ نہ کہہ سکا وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِo (المومن ۴۰:۴۴) ''اور اپنا معاملہ میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں، وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے''۔ بیٹے! مبارک ہو کہ تم تو اپنی وہ مراد پاگئے، جسے پانے کے لیے تم سجدوں میں دعائیں کیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جنت میں داخل ہوجانے والا کوئی انسان دنیا میں واپس جانا پسند نہیں کرے گا، خواہ اسے اس کے بدلے پوری روے زمین کے خزانے مل رہے

ہوں۔ لیکن شہید کو شہادت کے بدلے اتنی تکریم ملے گی کہ وہ خواہش کرے گا کہ اسے دس بار بھی دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تو وہ چلا جائے اور بار بار شہادت سے سرفراز ہو کر آئے۔

میرے پروردگار، اپنے بندے حسن کی خوب تکریم فرما، اس کے درجات بلند فرما، جنت کو اس کا مستقر اور ٹھکانا بنا۔ ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ فرما اور اس کے بعد کسی فتنے میں مبتلا نہ فرما۔ ہماری بھی بخشش فرما اور اس کی بھی بخشش فرما۔ اس کی یہ آرزو پوری فرما کہ اسے تیرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت نصیب ہو: مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ○ (النساء ۴: ۶۹) ''وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاؑ اور صدیقین اور شہدا اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں''۔

ایها الاخوان، رہے آپ سب احباب کہ جنھوں نے میرے بیٹے کو خوب پہچان کر اسے اپنا قائد چنا، تو آپ کے لیے اس کی یاد منانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسی راہ پر اپنا سفر جاری رکھو۔ اس کے نقوشِ پا کو مٹنے نہ دو۔ اسلام کے آداب و احکام کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ اخوت کی رشتوں میں مضبوطی سے جڑے رہو اور اپنے اعمال اور اپنی نیتوں کو اللہ ہی کے لیے خالص رکھو۔

ایها الاخوان، میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ تم سب میرے شہید بیٹے کی سچی تصویر بن جاؤ، لوگوں سے کسی اجر کی تمنا نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا خوف دل میں نہ بیٹھنے دو اور دل میں یہ خیال تک نہ آنے دو کہ تم نے کسی کو شر یا تکلیف پہنچائی ہے: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ (حٰم السجدہ ۴۱: ۳۳) ''اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی، جس نے اللہ کی طرف بلایا''۔

○

ترمذی میں حضرت ایوب بن موسیٰ نے اپنے والد اور دادا کے حوالے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد روایت کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ: ''کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اچھی تربیت

سے بہتر کوئی چیز نہیں عطا کی''۔ شادی کے بعد میری بھی یہ آرزو اور تمنا تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے صالح اولاد، عطا کرے، میں اس کی بہترین تربیت کروں اور ان کے ذریعے ایک ایسی بہترین نسل چھوڑ جاؤں جو سب کے لیے صدقہ جاریہ بن جائے اور ابدی خیر و بقا کا ذریعہ ہو۔ پروردگار نے یہ دُعا قبول فرمائی۔ میری آرزو پوری ہوئی، مجھے پیارا سا بیٹا عطا ہوا اور میں نے اس کا نام حسن البنا رکھا۔

پروردگار کی رحمت بچپن ہی سے میرے بیٹے پر سایہ فگن رہی۔ باری تعالیٰ نے اسے ہر تکلیف و اذیت سے محفوظ رکھا۔ ہم 'محمودیہ' میں رہایش پذیر تھے کہ ہمارے گھر کی چھت گر گئی۔ حسن اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی ساتھ اسی چھت کے نیچے کھیل رہا تھا۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جہاں یہ دونوں کھیل رہے تھے، وہاں سیڑھیاں تھیں۔ چھت کا ملبہ سیڑھیوں کی محراب پر آ کر ٹک گیا۔ لیکن باہر کسی کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے ملبہ ہٹانا شروع کیا۔ تو دیکھا کہ الحمدللہ، حسن اور اس کا بھائی اللہ کے فضل سے بالکل صحیح سالم ہیں۔

اسی طرح مجھے یاد ہے کہ ایک بار حسن کو خوفناک کتوں نے گھیر لیا۔ اس نے خوف زدہ ہو کر قریبی برساتی نالے 'الرشیدیہ' میں چھلانگ لگا دی۔ اس وقت نالے میں دریاے نیل کی طغیانی کے باعث پانی کا تیز دھارا تھا۔ حسن ڈبکیاں کھانے لگا، لیکن اچانک اذنِ الٰہی سے پانی کی ایک لہر نے اسے کنارے پر لا پھینکا۔ قریب سے گزرنے والی ایک دیہاتی خاتون نے اسے اٹھا لیا، اس طرح سراسر اللہ کے فضل و احسان سے اس کی جان بچ گئی۔

حسن بچپن ہی سے غیر معمولی دکھائی دیتا تھا۔ ابھی اس نے ہوش نہیں سنبھالا تھا کہ وہ کائنات کے بارے میں ہم سے سوالات پوچھا کرتا تھا: ''یہ چاند کیا ہے؟ اسے کس نے اتنا خوبصورت بنایا ہے؟'' میں نے اس کی غیر معمولی ذِیرکی کے پیشِ نظر اسے قرآن کریم حفظ کروایا۔ سنت نبوی کی تعلیم دی اور اخلاق عالیہ کا خوگر بنایا۔ پھر جب میں نے اسے دمنہور کے مدرسہ المعلمین میں داخل کروایا تو وہ حیرت ناک طریقے سے سب پر سبقت لے گیا۔ وہ اپنے تمام تعلیمی مراحل میں سب بچوں سے آگے رہا۔ الحمدللہ اس کی پوری تربیت، ذوق عبادت، صالحیت اور زہد کے اعلیٰ معیار پر پوری اتری۔

جامعہ ازہر کے دارالعلوم میں داخلے کے لیے پہلے چار سال کا ایک نصاب پڑھایا جاتا

ہے۔اسے پڑھنے کے باوجود بہت سے لوگ داخلے کے انٹرویو میں ناکام ہو جاتے ہیں۔حسن نے اس چارسالہ تمہیدی پڑھائی کے بغیر ہی انٹرویو دیا اور کامیاب رہا۔داخلے کے بعد وہ قاہرہ منتقل ہوا تو اتنے بڑے شہر میں اس کا نہ کوئی دوست تھا اور نہ کوئی عزیز۔اس نے وہاں جاکر اپنا ابتدائی قیام جامعہ ازہر کی مسجد میں کیا۔دار العلوم میں تعلیم مکمل ہوئی تو پہلی پوزیشن کا اعزاز پایا۔وزارت معارف نے شان دار نتیجے پر اسے مزید تعلیم کے لیے یورپ بھیجنے کی پیش کش کی، لیکن اس نے انکار کر دیا۔شاید اللہ تعالیٰ نے اس کا انتخاب کسی کارِجلیل کے لیے کیا ہوا تھا۔دریں اثناء اسماعیلیہ کے اسکول میں بطور مدرس اس کی تعیناتی ہوگئی، وہیں اس نے اپنی فکر کی آبیاری کی اور الاخوان المسلمون کی بنیاد رکھی۔

پھر میرے بیٹے کے افکار کی بازگشت پوری دنیا میں سنائی دی۔اس کی دعوت عالم اسلام کی چہار اطراف میں پھیل گئی۔اس کے پیغام نے تمام اصحاب فکر وشعور کو متاثر کیا۔اس کے مکتب فکر نے ازہر سمیت تمام کالجوں اور یونی ورسٹیوں کو ایک تنظیم کی لڑی میں پرو دیا۔اللہ تعالیٰ نے اس سے بیسویں صدی میں تجدید دین کی خدمت لی،اس کی فکر سے روشن چراغوں نے ہر جگہ، ہر گھر میں حق کا نور پھیلا دیا، اللہ نے اس کے ذریعے اخوت کی شکستہ عمارت کو دوبارہ استوار کیا اور افراد وقبائل کو دوبارہ روحانی محبت سے سرشار کر دیا: لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ○ (الانفال ۸: ۶۳) ''تم روے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے، یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے''۔(مجلة الدعوة ،۱۳ فروری ۱۹۵۱ء۔ مشمولہ: حسن البنا الداعية الامام و المجدد الشهيد، انور الجندی، ص ۱۵-۱۷)

✻✻✻

حق کی صدا تمھیں پکارتی ہے، اللہ کی کتاب تمھیں بلا رہی ہے۔اللہ کے بعد کسی اور کی بات کا کوئی وزن نہیں۔بندے کے لیے اللہ کے علاوہ کوئی جاے پناہ نہیں۔آزمایش میں ثابت قدمی اختیار کرو اور کٹھن گھڑی میں صبر اختیار کرو۔حسن البنا شہید

61

اسلامی قیادت کا ماڈل

قیادت کرنا انسان کا مقدر ہے۔ انسانیت کا شرف و اعجاز منصبِ خلافت پر اس کی سرفرازی سے وابستہ ہے۔ فی الارض خلیفة ، للمتقین اماماً ، للناس اماماً، وسارعوا، وسابقوا ـــــ یہ وہ الفاظ ہیں جو باری تعالیٰ نے کتابِ ہدایت میں' جو کتابِ قیادت بھی ہے' فرمائے ہیں۔

اس تصورِ قیادت کی ترجمانی انبیا و رسل' صلحا و علما ہی نہیں' بلکہ ہر مومن کے کردار کا خاصا ہے۔ قیادت و امامت کی اسلامی روایت انسانی تاریخ کا اہم ترین ورثہ ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تشکیل پانے والے قیادت کے رویوں نے اس کے معیار کو نئے اُفق دیے اور فن و کمال کے نئے زاویے وا کیے۔

اس کے اجزاے ترکیبی انتہائی سادہ ہیں:

- اس کی بنیاد علم پر ہے ـــــ یعنی پہلے جاننا اور بھرپور طریقے سے پرکھنا۔
- اس کی اٹھان ایمان پر ہے ـــــ یعنی عشق کی انتہا سے گزر کر قربان ہو جانا۔
- اس کا اظہار اتباع کی روح میں ڈوبا ہونا ہے ـــــ یعنی قیادت کی بنیاد حکم دینے میں نہیں بلکہ پہلے خود حکم ماننے میں ہے۔
- پاکیزگی اخلاق کے آئینے میں قیادت کا کردار سورج کی روشنی کی طرح ماحول کو منور کر دیتا ہے۔ وہ خدمت پر مسلسل مامور رہتے ہوئے اِدھر ڈوبتا ہے' اُدھر نکلتا ہے۔
- اس کا معیار وہ منہاج ہے جو بحیثیت مجموعی اس کی تشکیل دی ہوئی اجتماعیت کو خوب سے خوب تر کی جانب لے جاتا ہے۔
- اس کا نتیجہ وہ اصلاح ہے جو افراد' خاندان' معاشرے' ریاست اور پوری دنیا میں پھیلتی نظر آتی ہے۔

ـــــ اسلامی قیادت رضاے الٰہی سے شروع ہوتی ہے اور نصرتِ الٰہی پر منتج ہوتی ہے۔

ـــــ کرۂ ارض کی تاریخ ایسی لازوال قیادت کی پھر متلاشی ہے ـــــ!

سنابل العلم



قلب کی زبان سے

اگر آپ وہ حیات طیبہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے تو اس کو پانے کی صورت یہی ہے کہ اسے خدا سے مانگیں۔ مگر یاد رکھیے، خدا سے مانگنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دعا کے کچھ مقرر الفاظ یاد کرلیں اور اسے اپنی زبان سے دہرایا کریں۔ اس سے مانگنے کی زبان آپ کا قلب ہے۔ خدا آپ کے الفاظ نہیں دیکھتا وہ خود آپ کو دیکھتا ہے۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دے دے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے۔ آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دینداری میں پڑا رہنے دے۔ آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔

جو مانگے وہ کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ یاد رکھیے، یہ مالکِ کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا! میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے سارے خزانے کے ساتھ آپ کے قریب آکر آواز دیتا ہے، ”کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں“۔

مگر جنھیں لینا ہے، وہ سو رہے ہوں، تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

حسن البنا پر ربانی اکرام و دنیاوی الزام

محمد مہدی عاکف°

○ سوال: امام حسن البنا کی ولادت کے سو سال پورے ہونے پر آپ امام کے ساتھ گزرے ہوئے ایام کے بارے میں کچھ کہنا پسند کریں گے؟

● جواب: مجھے اس محبوب اور معزز ہستی کے ساتھ آٹھ سالہ رفاقت کا اعزاز حاصل ہے۔ اگرچہ میں اس وقت نوعمر تھا لیکن ۱۹۴۲ء میں جب میں نے ہوش سنبھالا اور تحریک کے ساتھ وابستہ طلبہ کے ساتھ مل کر مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی تھی، جب ہم طلبہ ہر جمعرات کو محترم امام کا وہ خصوصی لیکچر سننے کے لیے جایا کرتے تھے، جو وہ طلبہ کے لیے ارشاد فرماتے تھے، اور پھر ہم ان سے ملنے کا موقع پاتے تھے۔ امام نے نہایت ہی سادہ، آسان اور دل نشین اسلوب میں ہمیں زندگی کے مقصد سے روشناس کیا۔ آپ نے ہمیں اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کا تحفہ دیا، آپ کی پیاری پیاری نصیحتوں کی بدولت آج بھی ہمارے دل آپ کی محبت سے لبریز ہیں۔

آپ کے ہر جملے اور ہر عمل میں ہمارے لیے درس تھا۔ آپ نے ہمیں نظم و نسق، جہدِ مسلسل، وقت کی پابندی اور اس کی قدر و قیمت اور اسلامی اخلاقیات کی تعلیم دی۔ ان کے یہ ناقابلِ فراموش الفاظ آج تک میرے ذہن میں تازہ ہے: ''میں آپ کو علم، ثقافت اور اخلاق کے میدان میں صرف برتر اور ماہر ہی نہیں، بلکہ دوسروں سے ممتاز اور ممتاز تر دیکھنا چاہتا ہوں''۔

° مرشد عام اخوان المسلمون، مصر۔ ترجمہ: فصیح اللہ عبدالباقی

آپ ہم میں سے کم و بیش ہر فرد کو پوری تفصیل کے ساتھ جانتے تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ میرے بارے میں آپ کو یہ بات تک معلوم تھی کہ ہم دس بہن بھائی ہیں اور آپ کے علم میں یہ بھی تھا کہ میرے والد صاحب بڑے سخت مزاج ہیں، جو رات آٹھ بجے کے بعد اپنے بچوں کو گھر سے باہر رہنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ آٹھ بجنے سے پہلے ہی آپ مجھے بڑی شفقت سے متنبہ فرمایا کرتے تھے، تاکہ میرے والد صاحب مجھ پر ناراض نہ ہوں۔ آپ بڑے عمدہ اور صائب الرائے انسان تھے۔ چنانچہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ ہم طلبہ کے لیے دوران طالب علمی کون سی چیزیں لازمی ہیں۔ آپ ٹوٹ کر ہم سے پیار کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں فزیکل ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ کا طالب علم تھا تو آپ نے مجھے بلایا اور مسافر طلبہ کے لیے ایک گھر کا بندوبست کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ الحمدللہ آپ کی خواہش کے عین مطابق میں نے دو گھر کرائے پر حاصل کر کے اخوان کے مسافر طلبہ کے لیے قیام گاہ کا انتظام کیا۔ چنانچہ قاہرہ شہر میں یہ دارالاقامہ ہر لحاظ سے ایک مثالی تربیتی مرکز بن گیا، جس میں ہم، مقیم طلبہ کی تعلیم و تربیت اور ورزش وغیرہ کا باقاعدہ انتظام کیا کرتے تھے۔

اخوانی نوجوان رہایش کے لیے مناسب اور صاف ستھرا مکان پسند کیا کرتے تھے، تاکہ پڑھائی اور اسباق کی دہرائی میں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ استاد حسن البنا ایک سیدھے سادے اور بے تکلف انسان تھے۔ آپ کا رعب اور ہیبت آپ سے دوری کا نہیں بلکہ آپ سے قرب و محبت کا باعث ہوا کرتا تھا۔

○ امام البنا کے کس رویے نے آپ کو از حد متاثر کیا ہے؟

● فلسطین کے حوالے سے ان کا قوی اور جری موقف آپ کی زندگی کا ایک ممتاز اور نمایاں باب ہے۔ آپ ہمیشہ جہاد فلسطین کا تذکرہ فرماتے تھے اور اپنے فلسطینی بھائیوں کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ فلسطین کے ساتھ آپ کے گہرے تعلق نے ہمیں از حد متاثر کیا۔ اسی طرح ابتدائی ایام میں یونی ورسٹی میں اخوان کے پرجوش نوجوان ساتھی، کمیونسٹوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ لیکن امام البنا ہمیں ہمیشہ اس رویہ سے منع فرماتے اور کہتے کہ: ''پہلے مارکس کے نظریات کا مطالعہ کر کے اس کو ذہن نشین کریں، اس کے بعد دلیل کی بنیاد پر اس

کے مقابلے کے لیے میدان عمل میں آئیں''۔ چنانچہ اس عمل پہ عجب صورت سامنے آئی کہ اشتراکیت کا مطالعہ کر کے ہمیں کمیونسٹوں سے زیادہ کارل مارکس کے افکار سے واقفیت ہوگئی۔ اس سلسلے میں آپ ہمیشہ ہم جوانوں کو اس بات کی وصیت فرمایا کرتے تھے کہ: ''فکر کا مقابلہ فکر ہی کر سکتی ہے''۔ اس لیے ہم نے سنجیدگی کے ساتھ مختلف افکار کا مطالعہ کیا، جس کے نتیجے میں ہم اس قابل ہوئے کہ اخوان کی فکر کو ایک ممتاز اور کامیاب اسلوب کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھ سکیں۔

○ **بعض حلقوں نے امام البنا پر اعتراض کیا کہ وہ دوسری مصری پارٹیوں کے بارے میں منفی رائے رکھتے تھے۔ اس اعتراض کی حقیقت کیا ہے ؟**

● اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت کی سیاسی جماعتوں پر امام اعتماد نہیں کیا کرتے تھے۔ بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کی اکثر سیاسی پارٹیاں یا تو برائے نام تھیں یا پھر فساد زدہ 'وفد پارٹی' سے علیحدہ ہوئی تھیں، اور اسی کے نظریات کی حامل تھیں۔ ان کے علاوہ سیاسی جماعتیں نہ تو کوئی واضح پروگرام اور طریق کار رکھتی تھیں اور نہ کسی متعین ہدف کی حامل تھیں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود آپ ہم جوانوں کو عباس محمود عقاد، محمود شاکر اور محب الدین الخطیب وغیرہ کی مجالس میں بیٹھنے اور ان سے استفادہ کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اگرچہ بسا اوقات ایسے بھی ہوتا کہ محمود شاکر اور عقاد ہمیں گالیاں دیا کرتے تھے، لیکن ہم یہ سب سن کر ان کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتے، ان کو مدلل جوابات دیا کرتے تھے اور بعض پہلوؤں سے اپنے کمزور دلائل کو مطالعے سے بہتر بناتے تھے۔

○ **بعض معترضین اخوان پر شدت پسندی کا الزام عائد کرتے ہیں اور خازن دار☆ کے واقعے کو بطور مثال پیش کرتے ہیں؟**

● یہ لوگ درحقیقت اخوان کی دعوت سے بے خبر ہیں، امام حسن البنا کوئی ڈھکی چھپی شخصیت نہیں، بلکہ آپ کی شان دار تاریخ، متوازن طریق کار اور واضح لائحہ عمل سب کے سامنے

☆ مصری جج جسٹس احمد خازن دار ۲۲ مارچ ۱۹۴۸ء کو قتل ہوگئے تھے۔ اس سے پہلے انھوں نے اخوان کے متعدد افراد کو کڑی سزاؤں کا فیصلہ سنایا تھا۔

ہے۔ افراد سازی، گھریلو تربیت اور پھر معاشرے کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ایک ایسا پروگرام ہے جس کو آپ نے سوچ سمجھ کر ایک منطقی تسلسل کے مطابق وضع کیا۔

جہاں تک خازن دار کے واقعے کا تعلق ہے، تو امام حسن البنا نے اس قتل کی شدید مذمت کی تھی اور اس سے اخوان کی براءت کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اخوان کسی بھی قسم کے تشدد پر یقین نہیں رکھتے بلکہ تبدیلی اور انقلاب کے لیے مضبوط اور واضح موقف کے ساتھ وہ حکومتی اداروں میں بڑی حد تک صلح آمیز تبدیلی پر یقین رکھتے ہیں۔

○ امام حسن البنا کو قتل کرنے سے پہلے بہت سارے اخوانی رہنما پابند سلاسل کر دیے گئے، جب کہ خود انھیں نہیں گرفتار کیا گیا۔ اس واقعے کے حوالے سے آپ کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟

● یہ ایک واضح عالمی سازش تھی جس میں امریکہ سمیت انگریز اور فرانس شریک تھے۔ ۱۹۴۸ء کے جہاد فلسطین (جس میں اخوانی مجاہدین نے عظیم کارنامے انجام دیے) سے واپسی پر نقراشی پاشا نے اخوان المسلمون کو کالعدم قرار دے دیا، تاکہ وہ صہیونیوں کے ساتھ صلح کے معاہدے کا اعلان کرسکیں۔ واضح رہے کہ اخوان کے جتنے مجاہدین بھی فلسطین میں جہاد کے لیے گئے تھے، انھوں نے صرف اور صرف صہیونیوں کے خلاف کارروائیاں کی تھیں، کسی بھی مصری یا فلسطینی باشندے کو انھوں نے کوئی گزند نہیں پہنچائی۔

نقراشی نے اخوان کو تحلیل کر کے اخوان کے ہزاروں کارکنوں کو گرفتار کرلیا، اس وقت اگر اخوان مزاحمت کرنا چاہتے تو بھرپور مزاحمت کر سکتے تھے، لیکن روز اوّل سے ہی تشدد اور قتل اخوان کا طریق کار نہیں ہے، اور نہ اخوان، حکومت کے خلاف بغاوت یا تختہ الٹنے کا کوئی ارادہ رکھتے تھے۔ بلکہ جب اخوان کو کالعدم قرار دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ جہاد کے دوران حاصل کیا جانے والا اسلحہ ہمارے حوالے کردو تو بلاتامل انھوں نے اپنا اسلحہ حکومت کے سپرد کر دیا۔ اس دوستانہ تعاون کے فوراً بعد حکومت نے مجاہدین کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا۔

○ جماعت کب اور کیسے دوبارہ بحال کی گئی؟

● ۱۹۵۱ء میں جماعت نے دوبارہ منظم طریقے سے بلکہ پہلے سے کئی گنا بڑھ کر اپنی

سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ استاد حسن الہضیبی جماعت کے نئے مرشد عام منتخب ہوئے۔ اب مصر بھر میں اخوان کو ایک منظم قوت کے طور پر مانا جانے لگا اور مصر کے اطراف و اکناف میں اخوان کی شاخیں قائم ہوگئیں اور انھوں نے تربیتی، علمی، ثقافتی، سیاسی، سماجی غرض سارے میدانوں میں منصوبہ بندی کے ساتھ اپنی سرگرمیاں بحال کر دیں۔

○ جولائی ۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد حالات نے کیا رخ اختیار کیا؟

● یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے جس پر گفتگو تفصیل کی متقاضی ہے۔ اس وقت ملک کی سیاسی صورت حال بدترین تھی۔ پوری قوم بادشاہ اور حکمران ٹولے کے بے سروپا تصرفات اور قومی مفادات کے منافی اقدامات سے تنگ آ کر سراپا احتجاج بن چکی تھی۔ فوج کا موقف بھی حکومت کے خلاف تھا۔ چنانچہ فوج نے حکمرانوں کے خلاف فوجی بیرکوں میں محمد نجیب کی قیادت میں ایک نظام تشکیل دیا، انھی دنوں غیرملکی قوتوں کے ساتھ نہر سویز کی مشہور لڑائی بھی رونما ہوئی، جس میں مصری قوم نے انگریزی فوج اور ان کے حامیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوکر بیرونی تسلط یکسر مسترد کرنے کا اعلان کیا۔ جس کے نتیجے میں ۲۶ جنوری کو قاہرہ کو جلانے کی مذموم سازش عمل میں لائی گئی۔ لیکن اس کے باوجود انگریزوں اور حکومتی فساد کے خلاف مزاحمت کو خاموش نہ کیا جاسکا۔ یہاں تک کہ مصطفیٰ نحاس پاشا کو حکومت چھوڑنا پڑی۔ بعدازاں ۲۳ جولائی کو فوجی انقلاب عمل میں آیا، جس میں اخوان نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

انقلاب کی کامیابی میں پوری مصری قوم کی اس خواہش کو بنیادی اہمیت حاصل تھی، جو حکمران طبقے سے تنگ آ کر کسی تبدیلی کی خواہش مند تھی۔ آغاز میں انقلابی قیادت اور اخوان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ بعد میں فوج نے متفقہ پروگرام کی دفعات کو پس پشت ڈالنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس وقت کے مرشد عام استاد حسن الہضیبی نے انقلابی کونسل کی توجہ ان چھے متفقہ نکات کی طرف مبذول کرائی، جس میں احترام آزادی، دستور کی پاسداری، اسلامی نظام کا نفاذ اور احترام آدمیت شامل تھے۔ لیکن انھوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، بلکہ اسی مطالبہ کو اخوان کے ساتھ اختلافات کی بنیاد بنا کر ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور بالآخر جنوری ۱۹۵۴ء کو وہ دن بھی آ پہنچا جب ایک بار پھر اخوان کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ اخوان کے ہزاروں لوگوں کو مختلف جیلوں

میں پابند سلاسل کر دیا گیا۔ یہ حالت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ جلد ہی انقلابی کونسل کی قیادت اختلافات کا شکار ہوگئی اور جنرل نجیب کو معزول کر دیا گیا۔ بعد ازاں شاہ سعود کی وساطت سے اخوان اور انقلابی کونسل کے درمیان کسی حد تک ایک مفاہمت ہوگئی اور مارچ ۱۹۵۴ء سے اخوان نے دوبارہ اپنی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ لیکن چند دن گزرے تھے کہ اسکندریہ کے قریب منشیہ نامی جگہ پر عبدالناصر پر قاتلانہ حملے کا ڈراما رچایا گیا اور اس کو اخوان کے سر تھوپا گیا۔ ایک بار پھر اخوان کے ہزاروں لوگ جیلوں میں بند کر دیے گئے، ان پر فوجی اور سول عدالتوں میں مقدمات چلائے گئے، جس کے نتیجے میں اخوان کی چھے عظیم شخصیات، عبدالقادر عودہ، محمد فرغلی، ابراہیم طیب، یوسف طلعت، محمود عبداللطیف اور ہنداوی دویر کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا، انا للّٰہ و انا الیہ رٰجعون!

○ حسن البنا کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آخرت کی کامیابی کا درس دینے کے بجائے دنیا پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی، جوکہ غیر مذہبی رویہ ہے؟

● یہ اعتراض ناسمجھی پر مبنی ہے۔ یہ دنیا، آخرت سے جڑی ہوئی ہے اور کسی لحاظ سے بھی جدا نہیں ہے۔ ہم اس دنیا میں کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرتے جس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی یا ناراض نہ ہوتا ہو۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ لوگ کہتے ہیں: امام حسن البنا شہید ہوگئے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان کی فکر اور ان کی برپا کی ہوئی تحریک ابھی تک زندہ ہے، ہر جگہ ان کے شاگرد موجود ہیں۔ یہ درحقیقت اس دعوت کی سچائی، خوب صورتی، اس کی عظمت اور ان کی دعوت پر لوگوں کے یقین کی روشن دلیل ہے۔ ہم چالیس کے عشرے میں جب یونی ورسٹی میں پڑھتے تھے، اگرچہ اس وقت ہماری تعداد بھی کم تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم نے اس پروگرام، اس منہج اور طریق کار کی پوری طرح حفاظت کی ___ اسلام کو امام حسن البنا نے بڑے واضح، سادہ اور عام فہم انداز میں ایک مکمل ضابطہ حیات کے طور پر پیش فرمایا جو زندگی کے تمام شعبوں، ثقافتی، علمی، فقہی، تربیتی، فنی اور کھیل پر محیط ہے۔ اس لیے اگرچہ آج وہ ہم سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ان کی فکر، ان کے مستقبل کے لائحہ عمل اور پروگرام کو لے کر آگے بڑھنے والے الحمدللہ دنیا کے ہر کونے میں موجود ہیں۔

***

عظیم داعیِ اسلام، امام حسن البنا

سید ابوالحسن علی ندوی

جب مصر کا سفر [۱۹۵۱ء] پیش آیا، تو مجھے اس کی شدید خواہش تھی کہ اخوان کی تحریک کا مطالعہ کروں، اور اس کے متعلق براہ راست معلومات حاصل کروں۔ شیخ [حسن البنا شہیدؒ] کے پرانے رفیقوں، ان کے معتمدین اور ان کے تربیت یافتہ نوجوانوں سے ملاقات کروں اور اس عظیم الشان دعوت کی کامیابی کے اسباب معلوم کروں۔ ۱۹۴۹ء میں شیخ کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا، لیکن میری خوش قسمتی سے اس وقت شیخ کے تمام پرانے رفقا و شرکا اور ان کے تلامذہ و حلقۂ احباب کے خواص موجود تھے۔ میری عربی تصنیف ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین جو میرے سفرِ مصر سے چند ہی مہینے قبل شائع ہوئی تھی، اخوان کے حلقے میں کثرت سے پڑھی گئی تھی اور اخوان نے اپنی روایتی فراخ دلی اور بے تعصبی سے اس کو اپنے مخصوص تبلیغی لٹریچر میں جگہ دی تھی۔ یہ کتاب میرا ذریعۂ تعارف تھی۔ پھر ہندی مسلمان ہونا اور ایک معروف ادارے سے تعلق رکھنا اخوان کے لیے (جو عالم اسلام کی وحدت اور تعارف و تعاون کے سب سے بڑے داعی ہیں) کافی وجہ کشش تھی۔

جہاں تک شیخ کے متعلق تاریخی و شخصی معلومات کا تعلق تھا' اس کے لیے سب سے مستند اور قابلِ اعتماد ذریعہ ان کے والد محترم شیخ احمد عبدالرحمٰن البنا کی ذات تھی، جنھوں نے ازراہ شفقتِ بزرگانہ اپنے قابلِ فخر و ذریعۂ نجات فرزند کے متعلق تمام ضروری و جزوی معلومات فراہم کیں۔ ان کے علاوہ شیخ کے رفیق درس و شریک کار اور اخوان کے مربی استاد بہی الخولی نے بحیثیت ایک دوست، رفیق، مشاہد و معاصر کے اپنے مشاہدات معلومات اور تاثرات سنائے۔ ان دونوں بزرگوں کے علاوہ

ان چند نوجوانوں سے بھی ملاقات ہوئی، جو شیخ کے معتمد خاص اور دست راست رہ چکے تھے۔ ان اصحاب سے شیخ کی زندگی اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مستند معلومات حاصل ہوئیں اور ایسا محسوس ہوا کہ ان حضرات سے ملنے کے بعد شیخ کی زیارت سے کلی طور پر محرومی نہیں رہی۔

ان اصحاب سے جو کچھ سنا اور خود شیخ [حسن البنا] کے جو اثرات دیکھے، اس سے اس بات کا یقین پیدا ہوا کہ ان کی شخصیت تاریخ کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھی جن کو اللہ تعالیٰ کسی تحریک و دعوت کو چلانے اور کسی عہد میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے پیدا فرماتا ہے اور اس کو قیادت کی وسیع اور متنوع صلاحیتیں عطا فرماتا ہے۔ وسیع و روشن دماغ، گرم و پُرمحبت و دردمند دل، فصیح و بلیغ زبان، تسخیر کر لینے والے اخلاق، دلآویز شخصیت، یہ ان کے عناصر ترکیبی تھے۔ میں جب اقبال کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو بے ساختہ شیخ حسن البنا کی شخصیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے انھی کو دیکھ کر کہا ہے ؎

نگاہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

بدقسمتی سے جس زمانے میں میرا قیام مصر میں تھا، اخوان کی تحریک خلاف قانون تھی اور ان کے اجتماعات نہیں ہوسکتے تھے۔ لیکن اس اعتماد کی بنا پر جو ان کے ذمہ داروں کو میری ذات پر پیدا ہوگیا تھا، مجھے ان کی مخصوص مجلسوں میں شرکت کی عزت حاصل ہوئی۔ مجھے ان کے حالات و خیالات سننے اور اپنے ناچیز خیالات پیش کرنے کا موقع ملا۔ ایک مخصوص مجلس میں جس میں اخوان کی مجلس انتظامی (مکتب الارشاد) کے ارکان اور دل و دماغ شریک تھے، مجھے منضبط طور پر اپنے خیالات اور تجربات پیش کرنے کا موقع ملا۔ اخوان نے ان کی جس درجہ پذیرائی کی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اس کو علیحدہ رسالے کی شکل میں شائع کیا اور جب تک اخوان کی تحریک دوبارہ خلاف قانون قرار نہیں دی گئی، اس کے تین اڈیشن شائع ہوئے۔ اس رسالے کا نام ہے: ارید ان اتحدث الی الاخوان☆ (اخوان سے دو دو باتیں)۔ مجھے کسی دینی و سیاسی جماعت کے متعلق اتنی

☆ اس کے پہلے اڈیشن پر شیخ محمد الغزالی نے، اور دوسرے اڈیشن پر استاذ حسن الہضیبی مرشد عام نے مقدمہ لکھا۔ یہ بات بھی جماعتوں کی تاریخ میں خاص ندرت اور اہمیت رکھتی ہے کہ ایک ایسی کتاب پر جو تنقید و مشورے سے خالی نہیں، جماعت کا سب سے بڑا ذمہ دار مقدمہ لکھے۔ (ابوالحسن علی)

فراخ دلی اور عالی ظرفی کا تجربہ نہیں ہوسکا۔

اسی زمانۂ قیام میں مجھے شیخ محمد الغزالی کی معیت میں (جو اخوانی لٹریچر کے سب سے بڑے مصنف ہیں) مصر کے قصبات اور دیہاتوں میں بار ہا جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ اخوان کے دینی جوش و خروش، مہمان نوازی اور اسلام دوستی، محبت و اخلاص اور بے تعصبی و وسیع النظری کے ایسے مناظر دیکھے، جو ساری عمر یاد رہیں گے، اور جن سے شیخ حسن البنا کی تربیت و تاثیر اور ان کی مردم گری، اور سیرت سازی کا اندازہ ہوا، اور معلوم ہوا کہ اس شعلۂ جوالہ نے کتنی ایمانی حرارت پیدا کر دی ہے۔ اس تحریک کے مطالعے اور جو لوگ اس سے متعلق تھے، ان کو قریب سے دیکھنے کے بعد، میں خاص طور پر جن پہلوؤں سے متاثر ہوا وہ حسب ذیل ہیں:

۱- اس تحریک نے ایک ایسی قوم اور سوسائٹی میں جو مغربی تہذیب اور تمدنِ جدید کی خرابیوں سے پورے طور پر متاثر ہو چکی تھی اور اس سے پہلے ترکی سلطنت اور شخصی حکومت کے اثرات سے متاثر رہ کر طبقۂ 'مترفین' میں شامل ہو چکی تھی، ایسی قوت عمل، جذبۂ سرفروشی، سادگی و جفاکشی پیدا کر دی، جس کی نظیر اس زمانے میں ملنی مشکل ہے اور خود اس کے ایک رہنما اور قائد (شیخ بہی الخولی) کے الفاظ میں ایک نرم و نازک قوم الشعب الرخو الرقیق میں اس نے ایک نئی زندگی پیدا کر دی، اور گویا اقبال کے اس تخیل اور تمنا کو پورا کیا ؏ کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ان کی اس قوت عمل، جذبۂ سرفروشی اور عقابی شان دیکھنے کے لیے استاد کامل الشریف کی کتاب الاخوان المسلمون فی حرب فلسطین کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

۲- دوسری چیز جس نے مجھے متاثر کیا وہ اخوان کی محبت و گرم جوشی اور ان کے آپس کے تعلقات ہیں۔ اتنا مستحکم رشتہء اخلاق و مودت اور احساس اخوت و رفاقت میں نے کم دعوتوں اور جماعتوں میں دیکھا ہے۔ اخوان کی تحریک نے ایک ایسی عالم گیر برادری پیدا کر دی، جس کا ہر فرد دوسرے فرد کو اپنا حقیقی بھائی سمجھتا ہے اور بغیر کسی جماعتی عصبیت و حمیت جاہلیہ کے، اس کی مدد اور حمایت کے لیے تیار رہتا ہے۔ کسی مصری اخبار نے ایک مرتبہ طنز کے طور پر لکھا تھا (اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ انتہائی اعتراف ہے) کہ اگر شیخ حسن البنا کو اسکندریہ میں چھینک آجائے تو اسوان (مصر کی جنوبی سرحد) میں یرحمک اللّٰہ کی صدائیں بلند ہوں۔ نہ صرف اپنے مرشد عام بلکہ ہر

رفیق جماعت کے لیے ان کا یہی جذبہ اور طرزِ عمل ہے۔ وہ عام طور پر ایک دوسرے سے تعارف انھی الفاظ میں کراتے ہیں: اخوک فی اللّٰہ فلان۔ ان کے طرزِ عمل اور سلوک سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس اخوت فی اللّٰہ پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اس پر عمل کی کوشش کرتے ہیں۔

۳- تیسرا پہلو جس نے مجھے بہت متاثر کیا یہ ہے کہ اس تحریک کا زندگی سے قریبی تعلق ہے۔ وہ زندگی سے بچ کر نہیں نکلتی بلکہ اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے مسائل اور مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے، عوام سے اور عملی زندگی سے اس کا تعلق ہے۔ اس نے عوام کی زندگی میں دخل دیا ہے، اس کی خرابیوں کی اصلاح کی ہے اور قدم قدم پر اس کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی کامیابی، مقبولیت اور تاثیر میں اس کو بڑا دخل ہے۔

۴- اس کا چوتھا روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے دینی و علمی اختلافات سے بچ کر اپنا کام کیا۔ یہ چیز اس کے کمزور پہلوؤں میں بھی شمار کی جاسکتی ہے، مگر عالمِ اسلام کے موجودہ دینی و اخلاقی زوال، الحاد و زندقہ کے حملے اور مسلمانوں کے ذہنی انتشار کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ ایک اسلامی دعوت کے لیے خوش قسمتی سمجھی جائے گی کہ وہ اپنا وقت اور قوت خالص اصلاحی و تعمیری کام اور اساسی دعوت کے فروغ میں لگائے۔

۵- اخوان کی تحریک کا سب سے کامیاب اور روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے مصر (اور اس کی پیروی میں ممالک عربیہ) کے بڑھتے ہوئے الحاد و لادینیت کے دھارے کو روکا اور دین کے استخفاف و بے وقعتی اور ذہنی ارتداد و بغاوت کا جو رجحان روز افزوں تھا اس پر اثر انداز ہوئی۔ جو لوگ مصر کی صحافت و ادب سے واقف ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ اس ملک میں دین کے خلاف ایک منظّم سازش اور کوشش تھی۔ مصر کے ادیبوں، صحافیوں، مصنفین اور باحثین، سب نے دین کے خلاف ایک محاذ بنا رکھا تھا اور انقلاب فرانس کے علَم برداروں کی طرح وہ پوری مصری اسلامی سوسائٹی کو اپنے 'ترقی پسند' ادب، اپنے 'شک آفریں خیالات وتحقیقات' اپنے طنز و تمسخر سے ڈائنامیٹ کر رہے تھے اور یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (الانعام ۶:۱۱۲) کے مصداق تھے۔ اس متحدہ محاذ کے خلاف کسی دینی جماعت، حتیٰ کہ ازہر تک میں آواز بلند کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اخوان کے مخالفین کو بھی اعتراف ہے کہ اخوان کی تحریک

نے اس مورچے کو کمزور اور خوف زدہ کر دیا۔ الحاد کی علانیہ دعوت دینے اور دین کے استخفاف کی جرأت بڑے بڑے زعماے ادب کو نہ رہی، اخوان نے غیور نوجوانوں اور صاحب حمیت مسلمانوں کا ایک ایسا لشکر پیدا کر دیا کہ ملحدین کو اپنے ملحدانہ خیالات اور تصنیفات کی اشاعت، اور اخبارات و رسائل کو دین و اسلامی تہذیب کے ساتھ تمسخر و استہزا کی جسارت باقی نہ رہی۔ پھر اس کے ساتھ اس نے اسلام پسند ادیبوں، ناقدین اور اہل قلم اور ماہرین فن کی ایسی جماعت پیدا کی جو علمی و فنی طور پر، ان ملاحدہ کا مقابلہ کرسکیں اور اسلامی ادب کو پیش کریں۔

اخوان کا یہ کارنامہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ کوئی شخص جس کے دل میں نور ایمان ہے اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ راقم کے سامنے چونکہ ان ممالک کی سابقہ زندگی، اور موجودہ دینی و فکری انقلاب ہے اور اس کو اپنے طویل قیام کی بنا پر اس کا مشاہدہ و تجربہ ہو چکا ہے کہ اخوان نے جدید نسل کے دل و دماغ کو کس طرح متاثر کیا ہے اور دین و شعائر دین کے اظہار و اعلان کی کیسی جرأت پیدا کر دی ہے، اور جو لوگ دینی عقائد و حقائق کے اظہار میں شرمندگی اور حقارت محسوس کرتے تھے اب کس طرح علانیہ منظرعام پر دینی فرائض و شعائر کو ادا کرتے ہیں، اور احساس کہتری کے بجاے برتری کا احساس رکھتے ہیں۔ ان ذاتی مشاہدات و تجربات کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں میری زبان سے ایک تقریر میں اخوان کے متعلق بے ساختہ یہ لفظ نکل گئے کہ: لا یحبہم الا مؤمن ولا یبغضہم الا منافق (اخوان سے اسی کو محبت ہوگی جس کے دل میں ایمان ہے، اور اسی کو نفرت ہوگی جس کے دل میں نفاق ہے)۔

تاریخ اسلام میں جن جرائم اور سفاکیوں نے ملت اسلامیہ کو عظیم ترین نقصان پہنچایا، اور تاریخ کا دھارا بدل دیا، ان میں ایک شیخ حسن البنا کا مجرمانہ قتل ہے، جس نے کم سے کم مشرق وسطیٰ کو ایک مفید ترین شخصیت سے محروم اور صالح دینی انقلاب سے عرصے تک کے لیے بہت دور کر دیا۔

اگر اخوان کچھ عرصہ اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیتے اور اپنا اصلاحی و دعوتی کام پوری قوت سے جاری رکھتے تو ممالک عربیہ میں ایک اسلامی انقلاب برپا ہوجاتا اور ایک نئی زندگی پیدا ہوجاتی۔ (کاروانِ زندگی، جلد اوّل، ص ۳۷۶-۳۸۲)

٭٭٭

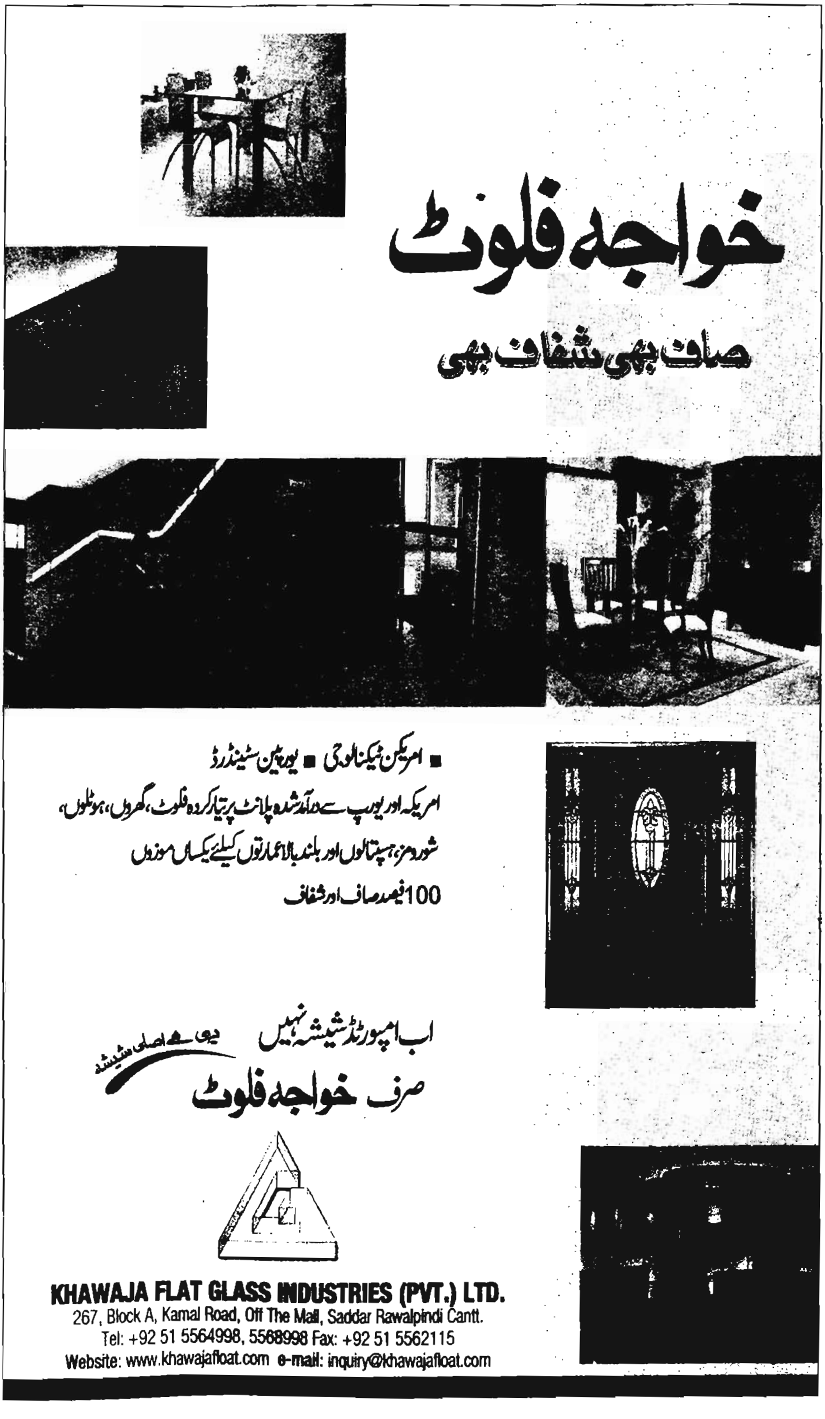
نبیِ اعظم ﷺ نے فرمایا

"لوگوں کو بشارت دو متنفر نہ کرو۔
دین سے قریب کرو دُور نہ بھگاؤ"۔

"لوگ بڑا غضب کرتے ہیں کہ اسلام کے پروگرام کی ساری تفصیل چھوڑ کر اس کی سخت سزاؤں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام پہلے عام لوگوں میں ایمان پیدا کرتا ہے۔ پھر عوام کے اخلاق کو پاکیزہ بناتا ہے، پھر تمام تدابیر سے ایک ایسی مضبوط رائے عام تیار کرتا ہے جس میں بھلائیاں پھولیں پھلیں اور برائیاں پنپ نہ سکیں۔ پھر وہ ایسا معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام قائم کرتا ہے، جس میں بدی کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے۔ وہ اُن تمام دروازوں کو بند کرتا ہے جن سے فواحش و جرائم نشوونما پاتے ہیں۔ اِس کے بعد ڈنڈا وہ آخری چیز ہے جس سے ایک پاک معاشرے میں سر اٹھانے والی ناپاکی کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ اب اُس سے بڑا ظالم اور کون ہوسکتا ہے جو ایسے برحق نظام کو بدنام کرنے کے لیے آخری چیز کو پہلی چیز قرار دیتا ہے اور بیچ کی سب چیزوں کو نگل جاتا ہے"۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ "تصریحات"۔ صفحہ ۳۲۶)

جماعت اسلامی کراچی


خواجہ فلوٹ
صاف بھی شفاف بھی
■ امریکن ٹیکنالوجی ■ یورپین سٹینڈرڈ
امریکہ اور یورپ سے درآمد شدہ پلانٹ پر تیار کردہ فلوٹ، گھروں، ہوٹلوں،
شورومز، ہسپتالوں اور بلند بالا عمارتوں کیلئے یکساں موزوں
100 فیصد صاف اور شفاف
اب امپورٹڈ شیشہ نہیں
یہی ہے اصلی شیشہ
صرف خواجہ فلوٹ
KHAWAJA FLAT GLASS INDUSTRIES (PVT.) LTD.
267, Block A, Kamal Road, Off The Mall, Saddar Rawalpindi Cantt.
Tel: +92 51 5564998, 5568998 Fax: +92 51 5562115
Website: www.khawajafloat.com e-mail: inquiry@khawajafloat.com

اُمت کا معمار

سید قطب ٥

بعض اتفاقیہ واقعات یوں لگتے ہیں کہ جیسے وہ ایک محکم تدبیر کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئے ہوں، جیسے وہ کتابِ مسطور اور صفحاتِ تقدیر پر ازل سے ثبت ہوں ___ حسن 'البنا' اتفاق ہی ہے۔ ان کا لقب 'البنا' یعنی معمار تھا لیکن کون کہتا ہے کہ یہ ایک اتفاق ہے۔ اس انسان کے حوالے سے یہ لقب ایک عظیم حقیقت ہے۔ تعمیر بلکہ شان دار اور عدیم المثال تعمیر اس شخصیت کا اصل عنوان ہے۔

تاریخ اسلام نے لاتعداد داعی دیکھے ہیں لیکن دعوت و تشہیر ایک چیز ہے اور تعمیر بالکل دوسری۔ ہر داعی معمار نہیں ہوسکتا اور ہر معمار بھی یہ عبقریت اور عظمت نہیں پا سکتا۔ یہ عظیم الشان عمارت جسے 'اخوان المسلمون' کہتے ہیں اسی تعمیر و عبقریت کا ایک مظہر ہے۔ یہ لوگ محض کوئی ایسا گروہ نہیں ہیں، کہ خطیب نے ان کے جذبات کو گرما دیا ہو، ان کے احساسات بیدار کر دیے ہوں اور وہ کسی سطحی سوچ کے تحت کسی عارضی ہدف کے گرد جمع ہوگئے ہوں۔ اخوان وہ عمارت ہیں کہ تعمیر کی خوبی و استحکام اس کے ایک ایک زاویے سے اجاگر ہوتی ہے۔ اسرہ جات، شعبہ جات

---

٥ شہرۂ آفاق تفسیر فی ظلال القرآن کے مؤلف' اسلامی تحریک اور تجدید و احیاے دین کے حوالے سے متعدد کتابوں کے مصنف۔ کچھ عرصے کے لیے وزارتِ تعلیم سے بھی منسلک رہے۔ امریکا میں دورانِ تعلیم امام حسن البنا کی شہادت کا واقعہ انھیں اخوان کی دعوت کے قریب لایا۔ ۱۹۵۴ء میں آپ پر مقدمہ چلایا گیا اور ۱۵ سال قید کی سزا سنائی گئی' تاہم ۱۰ سال بعد انھیں رہائی ملی۔ لیکن ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو جمال عبدالناصر نے انھیں پھانسی دے کر شہید کر دیا ___ ترجمہ: عبدالغفار عزیز

،علاقہ جات، تنظیمی مراکز، تاسیسی مجلس اور مکتب ارشاد، ہر خشت اپنی مثال آپ ہے۔

یہ تو ہوئی اس کی ظاہری شکل وصورت لیکن معمار کی اصل عبقریت صرف ظاہری شکل سے نہیں، جماعت کے داخلی نظام اور فکر کی ہمہ گیریت سے اجاگر ہوتی ہے۔ پورا نظامِ کامل نہایت باریک بینی اور محکم انداز سے تشکیل دیا گیا ہے۔ تنظیم وترقی کا اصل شکوہ اس کی روحانی تعمیر سے واضح ہوتا ہے، جس میں اسرہ جات، کتیبوں اور شعبہ جات کے افراد باہم جڑے ہوئے ہیں۔ ان کا اکٹھا مطالعہ کرنا، مشترکہ نماز وعبادات، مشترکہ احساسات، مشترکہ ہدایات، مشترکہ سفر، مشترکہ تربیت گاہیں اور پھر بالآخر مشترکہ اطاعت اور یکساں سوچ، اس سب کچھ نے دین کی خاطر برپا اس جماعت کو، دلوں میں پرورش پانے والے ایسے عقیدے اور ایمان کی صورت دے دی ہے، جو احکام وتعلیمات اور تنظیمی ضوابط سے پہلے ہی نفوس کو متحرک کر دیتا ہے۔

حسن البنا کی عبقریت اپنے ساتھیوں کی انفرادی اور اجتماعی توانائیوں کو بہتر طور پر استعمال کرنے سے ظاہر ہوتی تھی۔ انھیں ایسی مسلسل ومفید سرگرمیوں میں کھپا دینے میں تھی کہ جن کے بعد وہ اوقات کو فارغ جان کر اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں نہ مارتے پھریں۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ صرف لوگوں کے دینی احساسات وجذبات ابھار دینا کافی نہیں ہوتا۔ اگر ایک داعی اپنی ساری سرگرمی اسی ایک نکتے پر مرتکز کر دے، تو وہ نوجوانوں کو مخصوص دینی ہوس کا شکار تو کر دیتا ہے، لیکن کسی تعمیری سرگرمی میں نہیں کھپاتا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عقیدے کی علمی تاویلات کا مطالعہ کافی نہیں ہوتا۔ اگر داعی صرف انھی میں کھو جائے تو وہ بالآخر تمام روحانی سرچشموں کو خشک کر دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ وہ اس روحانیت سے محروم رہتا ہے، جو علمی مطالعے کو حرارت وگداز اور زرخیزی عطا کرتی ہے۔ اسی طرح وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ صرف وجدان کو اپیل کرنا اور مطالعے کا اہتمام کرنا بھی توانائیوں کا پورا استعمال نہیں ہے۔ عمل کی طاقت، جسمانی توانائی، اکتساب وعطا، قتال وانفاق ــــــ غرض کتنے پہلو ہیں جو اُدھورے اور تشنۂ تکمیل رہیں گے۔

انھوں نے ان تمام پہلوؤں پر سوچ بچار کی، یا یوں کہیے کہ انھیں ان تمام پہلوؤں کے احاطے کی توفیق نصیب ہوئی۔ انھوں نے جماعتی دائرے میں شامل ہونے والے ہر مسلمان بھائی کو ان تمام میدانوں میں متحرک کر دیا۔ یہ سب جماعتی نظام کی برکات تھیں۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں

کی تمام فطری توانائیوں کو تعمیر و عمل میں کھپا دیا۔ کتیبہ جات، تربیت گاہیں، اخوانی تنظیمیں اور کمپنیاں، داعیوں کا نظام، جہاد اور شہادتی کارروائیوں کے لیے افراد کی تیاری (تاکہ وہ جہاد فلسطین میں عملاً شریک ہوسکیں)۔ غرض ہر پہلو اس نظام کے عظیم و بے مثال ہونے کا عملی ثبوت تھا۔

حسن البنا کی عبقریت کا ایک اور پہلو مختلف النوع شخصیات و نفوس کو اکٹھا کر لینے میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ قدسی نفوس مختلف علاقوں سے آئے تھے۔ مختلف معاشرتی پس منظر رکھتے تھے، مختلف ذہنی استعداد کے مالک تھے، لیکن سب ایک ہی متناسب لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ یوں جیسے مختلف نغماتی صداؤں سے ایک خوب صورت دھن ترتیب پا جائے، سب کی ایک ہی پہچان، سب کا ایک ہی رجحان۔ چوتھائی صدی کے اندر اندر یہ سب مختلف الخیال، مختلف الاعمار افراد ایک اکائی کی حیثیت اختیار کر گئے۔

اس پورے تناظر میں جائزہ لیں کہ 'البنا' یعنی معمار کا لقب ایک اتفاقی امر تھا یا یہ کہ یہ سب اس بلند و اعلیٰ امرالٰہی کا پرتو تھا، جس کی کتابِ مسطور میں، سب کچھ ایک لامتناہی جمال و ترتیب سے لکھا ہوا ہے، خواہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ اتفاقی امر ہو یا تقدیر کے اعلیٰ ترین مراتب۔

یہ جدوجہد اپنے عروج پہ تھی کہ حسن البنا اپنے رب کے حضور پیش ہو جاتے ہیں۔ رب کے حضور حاضری سے انھوں نے اپنی عمارت کی بنیادیں مزید مستحکم و محفوظ کر دیں۔ اللہ نے ان کی شہادت اس طور چاہی کہ عظیم ارادۂ الٰہی کی تکمیل ہو جائے۔ ان کی شہادت تعمیر ہی کا ایک مرحلہ دکھائی دیتا ہے۔ اس سے عمارت کی بنیادیں مزید گہری ہوگئیں، در و دیوار مزید مضبوط ہوئے۔ شہید کے ہزاروں خطاب اور ہزاروں کتابیں بھی اخوان کے دلوں میں تحریک و دعوت کے وہ الاؤ روشن نہیں کر سکتے تھے جو ان کے پاکیزہ خون سے منور ہونے والے چراغوں نے دہکا دیے تھے۔ ان کی بات سچ ثابت ہوئی کہ ہماری باتیں موم سے بنے مجسمے ہیں، یہاں تک کہ جب ہم ان کی خاطر اپنی جان سے گزر جاتے ہیں تو ان میں روح دوڑنے لگتی ہے اور ان کے لیے حیات جاودانی لکھ دی جاتی ہے۔

جب بونے ڈکٹیٹر حکمرانوں نے اخوان کو آہن و آتش سے کچلنا چاہا، تب تک وقت بیت چکا تھا۔ تب حسن البنا کے ہاتھوں اٹھائی گئی بنیادیں منہدم کرنا، کسی کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔

اخوان کے شجر طیب کی جڑیں اکھاڑنا کسی کے بس میں نہ رہا تھا۔ اخوان ایک ایسے نظریے اور فکر کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، جسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ جبر اور آہن و آتش کی یلغار، کبھی افکار و نظریات کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ حسن البنا کی عبقریت سربلند رہی۔ بونے جابر مٹ گئے، اخوان کو دوام نصیب ہوا۔ اگرچہ کئی بار ایسا ضرور ہوا، کہ بعض کمزور نفوس وسوسوں کا شکار ہو گئے، لیکن یہ نفوس خود کو بیمار رکھنے پر مصر تھے لہٰذا ناکام ہوئے۔ وہ یا تو سرسبز شجر عظیم سے، خشک پتوں کی طرح جھڑ گئے، یا بالآخر ان کی بیمار سوچ خود ہی سمٹ کر رہ گئی اور منظم و متحرک صفوں میں کوئی خلل نہ آسکا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ دشمنانِ اخوان نے شجر عظیم کی کسی ایک شاخ کو یہ گمان کرتے ہوئے اپنی گرفت میں لے لیا کہ یہی شاخ اصل شجر ہے، اگر اسے کاٹنے یا اکھاڑنے میں کامیاب ہو گئے تو پورا درخت کٹ جائے گا یا اکھڑ جائے گا۔ لیکن جب شاخ پر دباؤ عروج پر پہنچا تو وہ کسی ایسی خشک لکڑی کی طرح دشمنوں کے ہاتھ آ گئی، جس کے ساتھ نہ کوئی پتا تھا نہ اس میں کوئی تازگی تھی، نہ ثمر اور نہ رونق حیات ___ یہی 'معمار' کی عبقریت تھی جو اس کے اٹھ جانے کے بعد بھی فیض دے رہی تھی۔

آج بھی اخوان کو وہ تمام آزمایشیں گھیرے ہوئے ہیں جو ماضی میں گھیرے ہوئے تھیں۔ لیکن آج وہ پہلے سے زیادہ مضبوط، پہلے سے زیادہ مستحکم اور پہلے سے زیادہ منظم ہیں۔ آج وہ دلوں میں راسخ ایک نظریہ بھی ہیں، تاریخ کا ایک سنہرا باب بھی، روشن مستقبل کے امین بھی ہیں اور ایک طرزِ زندگی بھی، اور اس سب کچھ سے زیادہ یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہیں کہ جسے کوئی مغلوب نہیں کر سکتا۔ وہ شہدا کا خون ہیں کہ جسے کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔

جو بھی اس عمارت کے بارے میں بری نیت رکھتا ہے، وہ یاد رکھے کہ اس سے پہلے ان کے پیش رو شاہ فاروق کی سرکشی جسے برطانیہ و امریکا کی ہلہ شیری بھی حاصل تھی، طغیانی اس عمارت کا ایک پتھر بھی اپنی جگہ سے نہیں اکھاڑ سکی۔ اس میں کوئی دراڑ نہیں ڈال سکی۔ مستقبل بھی اسی عقیدے و نظریے کا ہوگا جس پر اخوان کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ نصرت اسی معاشرتی نظام کی حلیف ہوگی جو اس راسخ عقیدے سے پھوٹتا ہے۔ آج ہر مسلم سرزمین سے اسی ایک پرچمِ بلند تلے جمع ہونے کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، جسے کبھی استعمار نے چاک چاک کر دیا تھا۔ استعمار چاہتا تھا کہ اس طرح وطن اسلامی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ آج اس مجروح جسم کے تمام زخم مندمل ہونے کی گھڑی

آن پہنچی ہے۔ اب اس جسم کو ایک زندہ و بیدار و توانا وجود نصیب ہونا ہے اور پھر قبائے استعمار کو تار تار کرنا ہے۔

وجود و ہستی کا فطری تقاضا ہے کہ اس سلیم فطرت اور عظیم عقیدے کو نصرت نصیب ہو، تقسیم و انتشار کا دور گزر چکا۔ اگر اسلامی تحریک اس تاریک دور میں فنا کے گھاٹ نہیں اتاری جاسکی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آج بیداری، انتفاضے اور احیائے اسلام کے دور میں اسے فنا کیا جاسکے۔ آج اسلامی فکر اور اخوان المسلمون کا وجود یک جان دو قالب کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ جس طرح تاریخ ان دونوں کو جدا نہیں کرسکتی، اسی طرح آج یا آنے والے کل میں بھی کوئی ان دونوں کو الگ نہیں کرسکتا۔

ماضی میں استعمار نے امت پر ایسے خواب آور نسخے آزمائے جنھیں دین سے منسوب کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے کبھی تو اہل تصوف کو استعمال کیا اور کبھی جامعہ الازہر کو۔ لیکن آج یہ سب کچھ ممکن نہیں رہا۔ اخوان کی مضبوط عمارت فکر اسلامی کی بھرپور نمایندگی کرتی ہے ــــــ آج کسی اور ادارے یا فرد کے ذریعے اسلامی سوچ کو دھندلایا نہیں جاسکتا۔ آج ازہر بھی طویل اسیری کے بعد استعماری گرفت سے آزاد ہو رہا ہے اور اس کے طلبہ و اساتذہ بھی بڑی تعداد میں اخوان میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے اسے یوں ہی ہونا تھا:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ٥ (المجادله ۵۸:۲۱)

اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا کہ یقیناً میں اور میرے رسولؐ ہی غالب رہیں گے، بے شک اللہ قوی و غالب ہے۔

❋❋❋

شہیدِ اسلام

جسٹس عبدالقادر عودہ ○

۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو حسن البنا خون میں لت پت اپنے رب کریم سے جا ملے۔ آپ نے اقامت دین کے راستے میں حائل بتوں کو پاش پاش کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

آپ نے مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی صحیح تصویر جاگزیں کرنے، ان کے دلوں میں اسے راسخ کرنے، عملی زندگی میں انھیں اسلام کے تابع فرمان بنانے، اور اسلام کی بالادستی قائم کرنے کی راہ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔

حسن البنا نے جن بتوں کو پاش پاش کرتے ہوئے شہادت کا مرتبہ پایا، ان میں سے سرفہرست عصر حاضر کے وہ بت ہیں کہ جنھیں لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ اور وہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دولت و اقتدار کے کروفر رسوم و رواج کے چنگل یا مذہبی فریب کاری سے متاثر ان بتوں کے سامنے ماتھا ٹیکتے ہیں۔ یہی بت ہیں جن کی جانب ہر سمت سے لوگ بھاگے

○ اخوان المسلمون کے اولین شہید جنھیں جمال عبدالناصر نے اپنا دست ظلم وجور آزماتے ہوئے ۱۹۵۴ء میں شہید کیا۔ مصری عدلیہ سے وابستہ ہو کر جج مقرر ہوئے۔ آپ امام حسن البنا شہید کی زیر ادارت نکلنے والے رسالے الشہاب کے اسی شمارے سے متاثر ہو کر اخوان المسلمون کی صفوں میں شامل ہوئے تھے کہ جسے پڑھ کر مرشد عام حسن الہضیبی جماعت میں آئے تھے۔ جب حسن الہضیبی مرشد عام منتخب ہوئے تو عبدالقادر شہید کو اخوان المسلمون کا سیکریٹری مقرر کیا۔ عبدالقادر عودہ شہید نے ۲۸ فروری ۱۹۵۴ء کے اُس مظاہرے کی قیادت کی تھی جس کے دباؤ پر فوج کی انقلابی کونسل، جنرل محمد نجیب کو دوبارہ صدر جمہوریہ مقرر کرنے پر مجبور ہوئی۔ آپ ہی نے مظاہرہ میں نہتے لوگوں پر گولی چلانے کی پاداش میں بطور قصاص جمال عبدالناصر کے سر کا مطالبہ کیا تھا۔ ترجمہ: ڈاکٹر افتخار احمد خان

آتے ہیں، اور ہر جگہ انھی بتوں کے گرد لوگ دیوانہ وار چکر کاٹتے ہیں۔ ان کی خواہش یہی ہے کہ کسی طرح ان سے جا ملیں یا ان کا قرب حاصل کرلیں۔ ایسے کم ظرف لوگ اپنے ازلی و ابدی رب کی نافرمانی کرتے ہیں اور وقتی، عارضی اور بودے جھوٹے خداؤں کی رضا جوئی چاہتے ہیں۔

عصرِ حاضر کے یہ بت، قدیم زمانے کے پتھر اور لکڑی وغیرہ کے بت نہیں ہیں، جن کی آغوش میں انسان پناہ لیتے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے اور اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے انھیں پوجتے تھے۔ یہ مجسم چلتے پھرتے انسانی بت ہیں، جن میں مریض روحیں سرایت کرچکی ہیں، جنھیں خواہشات نے غلام بنا رکھا ہے اور جنسی اور مالی ہوس ناکی نے انھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ایسی روحیں جن پر بدترین افکار اور حقیر خواہشات غالب ہیں۔ ایسی روحیں جو مال و جاہ پر فریفتہ ہیں اور خدا کے عطا کردہ جاہ و جلال سے بے پروا ہیں۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کو فراموش کرچکے ہیں اور جنھوں نے اس کے نازل کردہ احکامات کا انکار کر رکھا ہے، یہ خود بھی بدبخت ہیں اور انھوں نے دوسروں کو بھی بدبخت بنا رکھا ہے۔ وہ نہ صرف خود گمراہی و ہلاکت میں پڑے ہوئے ہیں بلکہ، اپنے پیروکاروں کو بھی لے ڈوبے ہیں۔

حسن البنا نے نہ تو کوئی جنگ چھیڑی تھی اور نہ وہ بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے۔ وہ ایک نہتے انسان تھے۔ ان کے پاس حق کا ہتھیار ضرور تھا، لیکن یہ ان کی سرشت میں نہ تھا کہ وہ لوگوں پر چڑھ دوڑیں، وہ حکیمانہ اور بھلے انداز سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے تھے، اور لوگوں کو ایسے بھلائی کے کاموں کی طرف دعوت دیتے تھے جن میں سراسر ان کی دنیا و آخرت کی بھلائی اور ان کے لیے خوش بختی کا سامان ہو۔

حسن البنا نے لوگوں کو یہ دعوت دی کہ اسلام طاقت و قوت اور عزت و شوکت کا نام ہے، جب کہ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اسلام کمزوری، غلامی اور خودسپردگی کا نام ہے۔ انھوں نے لوگوں پر واضح کردیا کہ اسلام، انصاف، پاکیزگی، آزادی، مساوات اور برابری کا دین ہے۔ جس وقت مسلمان مظالم، تکالیف اور ایذا رسانی کے سبب کراہ رہے تھے اور گناہوں میں ڈوب چکے تھے، ان کی آزادی سلب اور حکومت ختم ہوچکی تھی اور انھوں نے آپس ہی میں ایک دوسرے پر چڑھائی کررکھی تھی۔ ان کے طاقت وروں نے کمزوروں کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑا تھا اور ان کے حاکموں

نے رعایا کو دبا رکھا تھا...... امام حسن البنا نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ اسلام ہی ان کے درمیان وحدت اور ان کے ممالک کے لیے اتحاد کا سبب ہے، اسلام ہی مومنوں کے درمیان بھائی چارے کا باعث اور مسلمانوں کے درمیان باہمی تعاون و یک جہتی کا وسیلہ ہے۔ اسلام نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرنے، اور یک جا ہو کر خیر کے پھیلانے اور شر و فساد کو ختم کرنے کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ حسن البنا ایک طویل جدوجہد اور اَن تھک محنت کے بعد کامیاب ہوں۔ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے، ان کی دعوت کو قبول کیا اور ان کی یہ دعوت اطراف و اکناف میں پھیل گئی۔ مختلف علاقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور نوجوانوں نے اس دعوت کو قبول کیا۔ گویا وہ نئے جوش و ولولے سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں اور قرآن کے جھنڈے تلے صف آرا ہوگئے ہیں۔ وہ سب یک زبان تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کی غرض و غایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان کے لیڈر اور رہنما ہیں، قرآن کریم ہی ان کا دستورِ حیات ہے، جہاد ان کا راستہ ہے اور اللہ کی راہ میں موت ان کی منتہاے آرزو ہے۔

جب یہ دعوت مسلم دنیا میں پھیلی اور اس کی روشنیاں ہر سُو جگ مگانے لگیں تو ظالموں کو خطرہ لاحق ہوگیا کہ ان کے مظالم کی طویل رات کے زوال کا وقت آ گیا ہے۔ سامراجی قوتوں نے محسوس کیا کہ ان کے شکار ان کے ہاتھ سے نکلنا چاہتے ہیں۔ ظلمتوں کے پجاری چمگادڑوں نے جان لیا کہ اسلام کی روشنی میں ان کے لیے زندہ رہنا دشوار ہوگا، تو انھوں نے اپنے تئیں سمجھا کہ اس دعوت کے داعی کے قتل کے ساتھ ہی اس دعوت کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔ اسی لیے انھوں نے دھوکے اور بہانے سے امام حسن البنا کو قتل کر دیا۔ آپ رحمہ اللہ تو خوشی خوشی اپنے رب کریم سے جا ملے، تاکہ اس کے ہاں انبیا و صدیقین کے ساتھ جگہ پالیں۔ جہاں تک تعلق ہے انھیں دھوکے سے شہید کرنے والوں کا تو انھوں نے یہ مکروہ اور قبیح حرکت کر کے اللہ تعالیٰ کا غضب مول لیا اور اس کی لعنت اور دنیا و آخرت کی رسوائی حاصل کی۔

حسن البنا، شہید اسلام ہیں، جنھوں نے اذہان میں اسلام کی تجدید کی، قلوب میں اسے زندہ کیا، مسلمانوں کے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکی، انھیں خواب غفلت سے بیدار کیا اور انھیں اپنی آزادی اور ناموس دین و ملت کی حفاظت کے لیے ابھارا۔

امام حسن البنا کو جن ظالموں نے قتل کیا وہ سراسر خسارے میں رہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی ذات کو ختم کر کے شاید انھوں نے ان کی دعوت کو بھی ختم کر دیا، حالانکہ وہ سمجھ ہی نہیں پائے کہ وہ کوئی چند اشخاص کی دعوت نہیں ہے بلکہ اللہ کی پکار ہے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سمجھا دیا ہے کہ دعوت کا تعلّق اس ذات وحدہٗ لاشریک سے ہے، دعوت دینے والوں کی ذات سے نہیں ہے۔ اشخاص کا اس سلسلے میں بس اتنا ہی حصّہ ہے کہ جس کسی نے اس دعوت کے لیے کوشش کی اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کے سبب اسے عزت دی، اور جس نے اس دعوت کو چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے بھلائی سے دور کر دیا، پھر وہ کسی حال میں دعوت کی اس نعمت تک نہیں پہنچتا۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ان کی دعوت کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا، تو پھر حسن البنا کے دنیا سے چلے جانے سے اس دعوت کو کیسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن ظالموں کو اس کی سمجھ کیوں کر آئے گی۔

میں جس چیز کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اصل میں دعوت اسلام، کسی شخص کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی دعوت ہے۔ گویا بھلائی، سعادت مندی اور انسانی اصلاح کے لیے تو یہ ایک روشنی ہے۔ ایسی روشنی جسے اللہ تعالیٰ نے زمین کی طرف اتارا ہے، تاکہ جہالت اور ظلم کے اندھیروں کو پاش پاش کر دے اور کرۂ ارضی کو ظلم وفساد سے پاک کر دے۔ دوسری طرف زمین میں پھیلے طاغوت اور اس کے آلہ کار ہر جگہ، ہر زمانے میں اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ وہ اس دعوت کو نیچا دکھائیں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی پھیلائی ہوئی روشنی کو بجھا دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ بہرصورت روشنی کو مکمل کر کے رہے گا، اور اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کرے گا۔ چاہے ظالم طاغوت، اور استعماری سامراج ہرگز نہ چاہیں اور چاہے وہ سب مل کر ایک دوسرے کی پشت پناہی کرتے رہیں: ”اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا وہ اگر انتقال فرمائیں یا شہید ہوں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے، اور جو الٹے پاؤں پھرے گا اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور عنقریب اللہ شکر کرنے والوں کو صلہ دے گا“۔ (اٰل عمرٰن ۳:۱۴۴)

بے شک اخوان المسلمون کے محترم اور محبوب قائد حسن البنا کو قتل کر دیا گیا، ان کے ساتھیوں میں سے بھی کئی قتل ہوئے، بہت سے ستائے گئے، آزمائے گئے اور انھیں ان کے

گھر والوں کو مال اور مستقبل کے حوالے سے آزمایش میں ڈالا گیا، لیکن یہ سب کچھ انھیں اللہ تعالیٰ کی دعوت سے نہ پھیر سکا بلکہ ان کے ایمان اور ثابت قدمی میں اضافے کا سبب ہوا۔

الحمدللہ ، وہ تمام آزمایشوں سے زیادہ سخت جان، زیادہ پختہ ارادے والے اور برائی کی قوتوں کا بھرپور طریقے سے مقابلہ کرنے والے بن کر صراط مستقیم پر گام زن ہوئے۔ وہ اپنے شہید راہ نما کے طریقے پر چلتے رہے، جو اپنے قائد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور اللہ جل شانہ کی کتاب کو تھام کر چلنے کے لیے کوشاں رہے۔ ہرلمحہ اللہ تعالیٰ سے دعا گو رہے کہ وہ اللہ سے ایسی حالت میں ملاقات کریں کہ جس میں ملنا مطلوب ہے۔

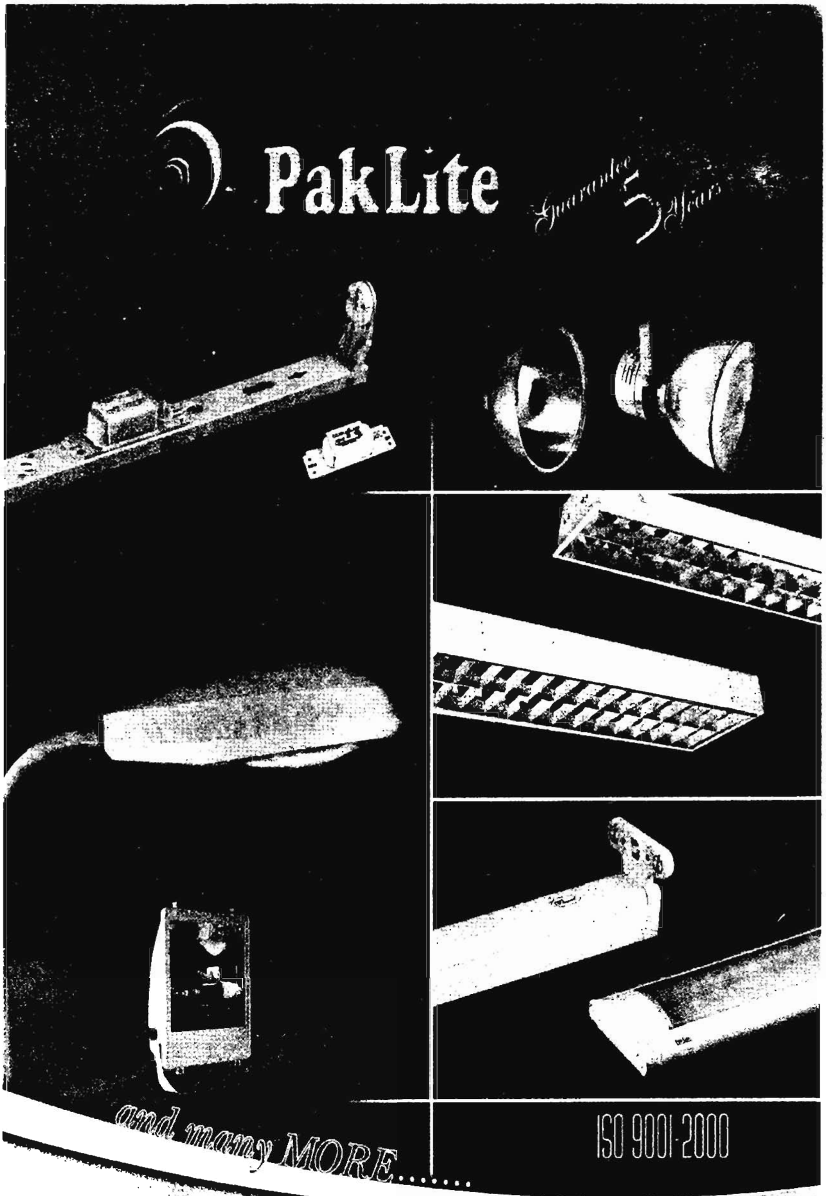
> ایمان والوں میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں، جنھوں نے سچ کر دکھایا وہ وعدہ جو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا، پس ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنھوں نے اپنی نذر پوری کردی اور کچھ منتظر ہیں اور وہ ہرگز نہیں بدلے۔ (الاحزاب ۳۳:۲۳)

اس واقعہ میں ان لوگوں کے لیے عبرت ہے جو حق کی مخالفت کرتے اور اللہ تعالیٰ کی دعوت کو بوجھ بلکہ ناخوش گوار سمجھتے ہیں۔ اگر وہ عبرت حاصل کریں اور سمجھ جائیں تو اس میں ان کے لیے اور لوگوں کے لیے بھلائی ہے۔ کامیابی حق کے لیے ہے۔ یہ باطل خواہ کتنا بلند اور کامیاب ہو بالآخر اسے زوال پذیر ہونا ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے روزِ اول سے طے کردیا ہے کہ اس کا حکم ہی غالب رہے گا اور اس کے رسولؐ کا بھی۔ جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے مقابلہ کرنے کی حماقت کرتا ہے، وہ خود مغلوب ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لازم کرلیا ہے اپنے لیے کہ وہ اپنے نیک بندوں کو زمین کا وارث بنائے گا۔

> اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک اعمال کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور انھیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنایا گیا جو تم سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کا وہ دین جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے، غالب کردے گا۔ (النور ۲۴:۲۵)

***


PakLite
Guarantee 5 Years
and many MORE........
ISO 9001-2000

حسن البنا اور قائداعظم

سلیم منصور خالد

طاغوت سے آزادی اور اسلامی ریاست کا قیام ہر زندہ ضمیر مسلمان کا خواب ہے۔ تحریک پاکستان کی بازگشت سمندر پار پہنچی تو یہ خواب دیکھنے والے لاکھوں لوگ اس کی کامیابی کے لیے دعاگو ہوگئے۔ وادیِ نیل میں بسنے والی ایک ولی اللہ شخصیت حسن البنا شہید نہ صرف اپنے لاکھوں ساتھیوں کے ہمراہ اس تحریک کی کامیابی کے لیے دعاگو تھے، بلکہ اپنے محاذ پر سرگرم کار بھی تھے۔ قائداعظم اور حسن البنا کے درمیان براہِ راست ملاقات بھی ہوئی۔ بعدازاں یہ رابطہ متعدد حوالوں سے برابر قائم رہا۔ دونوں کی تمنا ایک ہی تھی اور ایک ہی خواب: استعمار سے آزادی اور ایک ترقی یافتہ مثالی اسلامی ریاست کا قیام۔

دوسری جانب قائداعظم محمد علی جناح [۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء-۱۱ستمبر ۱۹۴۸ء]، تحریک پاکستان کو

● تاریخ کے مطالعے میں دل چسپی رکھنے والے افراد کے لیے یہ خط کتابت پہلی مرتبہ منظرعام پر آرہی ہے، مگر کئی حوالوں سے اس وقت بھی یہ نامکمل ہے۔ اس مناسبت سے متعدد خطوط یا نوٹس کی بازیافت کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ دو خط بلند پایہ تحقیقی مجلدات Jinnah Papers سے ملے ہیں، جب کہ حسن البنا کے باقی خطوط اخوان کے روزنامے الجریدة الیومیة قاہرہ، مصر سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اول الذکر خطوط انگریزی میں اور ثانی الذکر عربی میں ہیں، یہاں ان کا اُردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ عربی خطوط کا یہ ترجمہ برادرم عبدالغفار عزیز نے کیا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح بلاشبہہ ہندستان کے مسلمانوں کے ایک قومی راہ نما تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ مسلم ہند یا مسلمانوں کی جدوجہد کا ایک استعارہ (metaphor) اور علامت بھی تھے۔ اس لیے زیرنظر پیش کش میں قائداعظم کے نام اور قائداعظم کی رفاقت میں سرگرم رہنماؤں کے نام مراسلت کو بھی یک جا کردیا گیا ہے۔ مرتب

رہنمائی دینے کے ساتھ انڈونیشیا، فلسطین، لیبیا، ملایشیا وغیرہ میں مسلمانوں کی آزادی کی تحریکوں کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے حق میں کلمۂ خیر کہتے تھے۔ ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ قائداعظم نے ایران، اُردن، مصر، ترکی، عراق وغیرہ کے مسلمان حکمرانوں سے بھی رابطہ رکھا۔ اس زمانے میں عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عبدالرحمٰن عزام[1] تھے۔ ایک جانب قائداعظم کا ان سے رابطہ تھا اور دوسری جانب عالم عرب کی ہمہ گیر اسلامی عوامی تحریک اخوان المسلمون، تحریک پاکستان کی تائید وحمایت کو اپنی دینی اور ملی ذمہ داری سمجھتی تھی۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں قائداعظم کچھ دنوں کے لیے مصر میں رکے، تو اخوان المسلمون کے مرشد عام حسن البنا نے ۱۶دسمبر سے ۱۹دسمبر ۱۹۴۶ء کے دوران ان سے ملاقات میں تحریک پاکستان کی تائید وتحسین کی، اور انھیں قرآن کریم کا ایک نہایت خوب صورت نسخہ، تحریک پاکستان کی علامتی تائید کے لیے، بطور ہدیہ پیش کیا (یہ نسخہ اس وقت بھی کراچی میں مزارِ قائد پر موجود نوادرات میں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے، جس کا عکس یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔)

مفتی اعظم فلسطین محمد امین الحسینی (۱۸۹۳ء-۱۹۷۴ء) بیان کرتے ہیں: ''مجھے یاد ہے ایک دعوت کا اہتمام عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عبدالرحمٰن عزام نے قائداعظم محمد علی جناح کے اعزاز میں کیا تھا، قائداعظم کے ہمراہ لیاقت علی خاں [یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء- ۱۶اکتوبر ۱۹۵۱ء] بھی تھے عزام صاحب کے گھر سب سے پہلے پہنچنے والوں میں، میں اور امام حسن البنا شہید تھے۔ ہم قائداعظم سے دیر تک محوِ گفتگو رہے۔''[2]

قائداعظم نے ۱۶ دسمبر ۱۹۴۶ء کو قاہرہ پہنچنے پر اپنے بیان میں فرمایا تھا: ''مصر کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلم ہند کس مقصد کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے؟ یہ مصر کے لیے بھی اتنا ہی ضروری

۱- عبدالرحمٰن حسن عزام (۱۸۹۳ء-۱۹۷۶ء) مصری نژاد دانش ور اور بین الاقوامی امور کے ماہر تھے۔ عرب لیگ کے پہلے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے ۵۲-۱۹۴۵ء کے دوران خدمات انجام دیں۔

۲- خلیل احمد حامدی (مقدمہ) حسن البنا شہید کی ڈائری، ص ۱۰۴-۱۰۵۔ عتیق ظفر شیخ اور محمد ریاض ملک کی مرتب کردہ کتاب Quaid-e-Azam and The Muslim World رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۷۸ء کے مطابق یہ ملاقات اسی سفر کے دوران دسمبر ۱۹۴۹ء کو قاہرہ میں ہوئی تھی۔

ہے جتنا اہلِ ہند کے لیے۔ اگر ہم حصولِ پاکستان میں کامیاب ہوگئے تو یہ مصر کے لیے بھی اچھا ہوگا۔ کانگریس کے پروپیگنڈے سے بہت سے اہلِ مصر گمراہ ہوئے ہیں۔ میں ان مصری بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مسلم ہند کے معاملات میں زیادہ دل چسپی لیں اور ہند کے آیندہ دستور کے مسائل کا مطالعہ کریں۔ اہلِ مصر کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانانِ ہند کی جدوجہد کا مقصد کیا ہے' اور یہ جدوجہد مصر کے لیے کس قدر اہم ہے کہ ہم پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں' اور یہ کتنا خطرناک ہوگا کہ اگر ناکام ہوجاتے ہیں...... جب پاکستان قائم ہوجائے گا تب ہی ہم [ہندی اور مصری مسلمان] حقیقت میں آزاد ہوں گے' وگرنہ ہندو سامراج کی لعنت اپنے پنجے (tentacles) مشرق وسطیٰ کے اس پار تک پھیلا دے گی''۔[۳] [قاہرہ میں ایک ضیافت سے خطاب کرتے ہوئے ۱۸ دسمبر ۱۹۴۶ کو کہا] ''اگر ہند میں ہندو سلطنت قائم ہوگئی تو اس کا مطلب ہوگا ہند میں اسلام کا خاتمہ اور دیگر مسلم ممالک میں بھی...... اس باب میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ روحانی اور مذہبی رشتے ہمیں مصر سے منسلک کرتے ہیں۔ اگر ہم ڈوبے تو سب ڈوب جائیں گے''[۴]...... [پھر قاہرہ ریڈیو سے ۱۹ دسمبر کو نشری تقریر میں وضاحت کی] ہم چاہتے ہیں کہ ان دو منطقوں میں جہاں ایک مسلم حکومت اپنے علاقوں کی فرماں روا بنے' وہاں ہم ایک خودمختار قوم کی حیثیت سے اپنی زندگی بسر کریں' اور ان تمام اقدار کا تحفظ کریں جن کا علَم بردار اسلام ہے...... یہ ۱۰ کروڑ مسلمانوں کی حیات و موت کا معاملہ ہے''۔[۵]

قاہرہ میں ۱۹ دسمبر کو پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''اگر ہند پر ہندو سامراج کی حکمرانی ہوئی تو یہ مستقبل کے لیے' اگر اس سے زیادہ نہیں تو اتنا ہی بڑا خطرہ ہوگا جتنا بڑا خطرہ برطانوی سامراج سے ماضی میں تھا۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ پورا مشرق وسطیٰ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جائے گا...... میں یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان ان تمام اقوام کو بلاتمیز رنگ و نسل اپنا تعاون

۳- روزنامہ The Dawn' ۱۸ دسمبر ۱۹۴۶ء/ قائداعظم: تقاریر و بیانات' ج ۴' مرتبہ: اقبال احمد صدیقی' بزمِ اقبال' ۲-کلب روڈ' لاہور' ۱۹۹۸ء' ص ۲۸۵/Quaid-e-Azam Papers فائل ۹۸۴

۴- روزنامہ The Dawn' ۲۱ دسمبر ۱۹۴۶ء/ ایضاً' ص ۲۸۷-۲۸۸

۵- Quaid-e-Azam Papers' فائل ۷۸۵' ص ۲۰۰-۲۰۲' بحوالہ ایضاً' ص ۲۸۸

پیش کرے گا، جو حصولِ آزادی کی غرض سے جدوجہد کر رہی ہوں''۔[۶]

حسن البنا شہید، آل انڈیا مسلم لیگ کے مقصدِ تخلیق پاکستان کے زبردست تائید کنندگان میں شمار ہوتے تھے۔ بقول جناب پروفیسر خورشید احمد: ''اخوان کے نوجوان رہنما سعید رمضان [م: ۸ اگست ۱۹۹۵ء] نے بتایا کہ وہ خود اور اخوان کی قیادت کے مرکزی رہنما تحریک پاکستان کی تائید کے لیے مصر کے طول و عرض میں پُرجوش تقاریر کیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس مصر کے سیکولر قوم پرستوں میں کانگریس اور نہرو کے بارے میں نرم گوشہ پایا جاتا تھا اور وہ ان کی تائید کرتے تھے''۔

خود قائداعظم بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ عرب قوم پرست اور سیکولر عناصر انڈین نیشنل کانگریس اور انڈین نیشنل ازم کے حامی ہیں۔ اس پس منظر میں اخوان المسلمون کی جانب سے عالمِ عرب و افریقہ کے مرکز علم و تہذیب میں تحریکِ پاکستان کی تائید و حمایت اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں کانگریس نے دہلی میں ایک بین الاقوامی ایشیائی کانفرنس [۲۳ مارچ تا ۲ اپریل ۱۹۴۷ء] منعقد کرنے کا ڈول ڈالا۔ قائداعظم اس کانفرنس کے پس پردہ محرکات کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ اگرچہ شام، لبنان اور یمن نے اس کانفرنس کا دعوت نامہ مسترد کر دیا تھا، لیکن عرب لیگ نے کانفرنس میں وفد روانہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ قائداعظم نے فروری ۱۹۴۷ء کو عرب لیگ کے سیکرٹری عبدالرحمٰن عزام کے نام خط میں اس فیصلے پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔

○

اسی دوران میں حافظ کرم علی (م: ۳۰ جنوری ۱۹۷۲ء۔ سربراہ حج کمیٹی، مسلم لیگ صوبہ جات متحدہ (یوپی))[۷] نے قاہرہ میں امام حسن البنا سے ملاقات کرنے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر،

۶- روزنامہ The Dawn، ۲۱ دسمبر ۱۹۴۶ء/ ایضاً، ص ۲۹۰-۲۹۱

۷- پروفیسر احمد سعید، Muslim India، انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان ہسٹاریکل ریسرچ، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۰

قائداعظم محمد علی جناح کے نام خط لکھا:[8]

نیو ہوٹل، قاہرہ

مارچ ۱۹۴۷ء

جناب محترم [محمد علی جناح]

میں کئی دنوں سے یہاں مقیم ہوں۔ اس قیام کے دوران میں، میں نے قاہرہ میں موجود بہت سے مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا--- اور [انھیں] مسلم لیگ کے موقف سے آگاہ کیا ہے۔

میں، عبدالرحمٰن عزام سیکرٹری [جنرل] عرب لیگ سے بھی ملا، اور ان سے درخواست کی کہ وہ بھارت میں [منعقد ہونے والی کانفرنس میں] کوئی وفد نہ بھیجیں کیوں کہ یہ مسلم لیگ کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ: ''ہمارا وفد وہاں کوئی تقریر نہیں کرے گا۔ اگر مسلم لیگ چاہے تو انھیں چائے پر بلا لے''۔

میں گذشتہ دو ہفتے سے یہاں پر مقیم ہوں، اور امکان ہے کہ جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اگر کوئی اطلاع ہو تو براہ کرم مجھے جلد مطلع فرمائیں، میں اپنی استعداد کے مطابق تعمیل ارشاد کے لیے بھرپور کوشش کروں گا۔

مصر میں سب سے زیادہ طاقت ور، مضبوط اور مقبول تنظیم اخوان المسلمون کے نام سے موسوم ہے، جس کے سربراہ شیخ حسن البنا ہیں۔ ان کے ۵۰ ہزار رضا کار اور لاکھوں پیروکار ہیں۔ اس تنظیم کا اپنا ایک روزنامہ اخبار اور ایک ہفت روزہ بھی ہے۔ میں نے تنظیم کے مرکزی دفتر میں تنظیم کے سربراہ سے ملاقات کی۔ وہ نہایت تپاک اور بڑی شفقت سے پیش آئے۔ آپ سے میری استدعا ہے کہ حسن البنا سے رابطہ قائم کریں۔

اگر آپ مناسب سمجھیں تو [آل انڈیا مسلم] لیگ کے سیکرٹری انھیں ایک خط لکھیں، جس

8- *Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah Papers :Prelude to Pakistan 20 February-2June 1947* Editor-in-Chief Z.H.Zaidi Vol:1,Part 1- National Archives of Pakistan, Oxford University Press.1993,p.178-179

میں ان کے کریمانہ سلوک پر شکریہ ادا کریں۔ اس چیز کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ خط میں میرا تذکرہ کیا جائے۔

ان کا پتا ہے: شیخ حسن البنا، الاخوان المسلمون، حلمیہ قدیمہ، قاہرہ

آپ کا نہایت مخلص

محمد کرم علی

ممبر ورکنگ کمیٹی یوپی، ممبر، آل انڈیا مسلم لیگ کونسل

○

۱۳ اپریل ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے عبدالرحمٰن عزام کے نام خط میں زور دیا کہ: ''کانفرنس میں اگرچہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا گیا، لیکن ہم ان شاء اللہ اس کوشش سے بچ نکلیں گے اور ہم ہندستان اور مشرق وسطیٰ دونوں جگہ کامیاب ہوں گے''۔ اسی تسلسل میں قائداعظم نے اخوان المسلمون کے سربراہ حسن البنا کے نام جو ذاتی پیغام مصطفیٰ مومن کے ذریعے بھیجا تھا،[۹] امام البنا نے دستی طور پر اس کا جواب مصطفیٰ مومن کے ذریعے ہی بھیجا، جو حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ اکبر وللہ الحمد

قاہرہ، ۲۸ مئی ۱۹۴۷ء

میرے محترم قائد محمد علی جناح،

ہمارے بھائی جناب مصطفیٰ مومن[۱۰] کے ذریعے آپ کا پرخلوص پیغام موصول ہوا، جس کے لیے میں آپ کا انتہائی شکرگزار ہوں۔ جہاں تک ایشیائی کانفرنس کا تعلق ہے، تو اس بارے میں، میں یہ عرض کرسکتا ہوں کہ ہم اس کانفرنس کے مقاصد اور اہداف کے بارے میں بے خبر نہیں ہیں۔ ہم نے

۹- جاوید اقبال خواجہ: ہفت روزہ تکبیر، کراچی، ۲۲ اگست ۱۹۹۶ء، ص ۱۳-۱۴

۱۰- مصطفیٰ مومن، اخوان المسلمون سے وابستہ ایک نوجوان کارکن اور انجینیرنگ کے طالب علم تھے۔

اس موقعے کو بعض وجوہ سے مناسب سمجھا، کہ وہاں پر مصر کا ایک نہایت متقی اور وفادار مسلمان شرکت کرے۔ جو پورے ہندستان کی اسلامی تحریک کے قائدین، بالخصوص آپ سے ذاتی طور پر ملے، خط کتابت کے ذریعے نہیں بلکہ بالمشافہہ ملاقات کی سعادت حاصل کرے، تاکہ پاکستان کی مبارک تحریک کے بارے میں اسلامیانِ مصر کے مخلصانہ جذبات اور نیک تمنائیں آپ تک پہنچائے۔

اس کانفرنس میں ہماری شرکت کا دوسرا بڑا ہدف یہ تھا کہ اگر خدانخواستہ اس میں کوئی ایسی بات ہو، یا تبادلہ خیالات کے دوران میں کوئی ایسا پہلو زیر بحث آجائے جو مسلمانوں اور عالم عرب کے خلاف ہو، جیسا کہ اس سے پہلے مسئلہ فلسطین کے بارے میں عملاً ہو چکا ہے تو ہم اسے ناکام بنا سکیں۔

آپ کو یہ بتاتے ہوئے مجھے انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ پوری وادیِ نیل کامل خلوص دل کے ساتھ آپ کی مکمل تائید کرتی ہے۔ اور کامل اعتماد رکھتی ہے کہ آپ کی زیر قیادت یہ جدوجہد ہندستان کی اسلامی قوم کو اتحاد سے سرفراز کرے گی، اور آزادی کے لیے کی جانے والی یہ جدوجہد بالآخر کامیاب ہوگی۔ آج کے بعد پوری روے زمین پر کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اخوت اسلامی کے ان مضبوط رشتوں کو توڑ سکے، یا جوامت اسلامیہ کی آزادی اور استقلال کی راہ میں حائل ہوسکے، یا ان کے منصفانہ قومی مطالبات کو تسلیم ہونے سے روک سکے۔ اس لیے آپ کامل یقین سے آگے بڑھیے، اللہ آپ کے ساتھ ہے اور وہ آپ کی بہترین کوششوں کا اجر عطا فرمائے گا۔[11]

۱۱- اس فضا میں جب کہ مصر میں حکمران وفد پارٹی کے صدر اور وزیراعظم نحاس پاشا اور قائداعظم کے درمیان ملاقات کی رپورٹ، وفد پارٹی کے لندن میں مقیم نمایندے نے امریکی سفیر متعینہ لندن کے نام اس طرح پیش کی:
''۲۲ مئی ۱۹۴۷ء۔ وفد پارٹی کے رہنما نحاس پاشا اور مسٹر جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کے مابین چھے ماہ قبل یہ طے ہوا تھا کہ عملی طور پر جتنی جلد ممکن ہو، مسلم ریاستوں کی ایک جمہوری تنظیم، جسے فیڈریشن آف مسلم اسٹیٹس کہا جائے گا قائم کی جائے، جس کا مرکز قاہرہ ہو۔ جب مصر اور مسلم انڈیا [پاکستان] مذکورہ نئی مسلم فیڈریشن کا مرکزثقل (nucleus) تشکیل دے لیں گے، تب توقع ہے کہ افغانستان، ایران، عراق، سعودی عرب بھی اس سے وابستگی اختیار کرلیں گے''۔ Quaid-e-Azam and The Muslim World، مرتبہ: عتیق ظفر شیخ اور محمد ریاض ملک، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۷۴-۱۷۵، بحوالہ Quaid-e-Azam Papers فائل ۶۷۶، ص ۶۴

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

حسن البنا[۱۲]

سربراہ، اخوان المسلمون

O

قائداعظم گورنر جنرل پاکستان کے نام ٹیلی گرام

قیام پاکستان کی خبر سن کر حسن البنا نے پاکستان کے بانی اور گورنر جنرل قائداعظم کے نام حسب ذیل ٹیلی گرام ارسال کیا:

[قاہرہ: ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء]

عزت مآب محمد علی جناح

آج کے اس تاریخی اور ابدی حقیقت کے حامل دن، کہ جب دانش اور حکمت پر مبنی آپ کی قیادت میں پاکستان کی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا ہے، میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد اور نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں۔ یہ مبارک باد وادیِ نیل کے سپوتوں اور بالخصوص اخوان المسلمون کے دلی جذبات کی حقیقی عکاس اور نمایندہ مبارک باد ہے۔

حسن البنا[۱۳]

O

۱۲- الجریدة الیومیة، قاہرہ، اتوار، ۱۲ رجب ۱۳۶۶ھ، یکم جون ۱۹۴۷ء اور Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah Papers، ص ۹۱۰-۹۱۱۔ کتاب Quaid-e-Azam and The Muslim World میں بحوالہ فائل ۸۴۷۔ یہ خط اس کتاب میں دو الگ الگ تاریخوں میں جزوی تبدیلی کے ساتھ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ دیکھیے: ص ۱۷۶-۱۷۸۔ لیکن ہم نے خط کے عربی متن کو منتخب کر کے اُردو ترجمہ دیا ہے۔

۱۳- الجریدة الیومیة، قاہرہ جمعۃ المبارک، ۲۸ رمضان ۱۳۶۶ھ، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

گاندھی جی[۱۴]، نہرو[۱۵] اور ماؤنٹ بیٹن[۱۶] کے نام مشترکہ ٹیلی گرام

قیامِ پاکستان کے وقت' ہندو اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کے قتلِ عام' عورتوں کی بے حُرمتی اور مہاجر قافلوں کی لوٹ مار پر بھارتی قیادت سے احتجاج کرتے ہوئے حسب ذیل ٹیلی گرام روانہ کیا:

[قاہرہ: ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء]

سرزمین ہند پر مسلمانوں کی خوں ریزی نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے دل' رنج و حزن اور غم و غصے سے بھر دیے ہیں۔ اسلام سراسر سلامتی کا دین ہے' الا یہ کہ اہل اسلام پر کوئی زیادتی کرے۔ اخوان المسلمون ،عالم عرب اور عالم اسلام کی نمایندگی کرتے ہوئے اپنے بھائیوں کی خوں ریزی کو روکنے میں تساہل کا ذمہ دار آپ کو قرار دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ لہو کی پکار کو کوئی نہیں دبا سکا اور یہ ہمیشہ زیادتی کرنے والے کے لیے تباہی لے کر آتی ہے۔ آپ حضرات کو معلوم ہونا چاہیے مسلمانوں سے دوستی، اس خوں ریزی کے تمام اہداف و مقاصد سے زیادہ مفید و بہتر ثابت ہوگی۔

حسن البنا[۱۷]

○

قائداعظم ، گورنر جنرل پاکستان کے نام ٹیلی گرام

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد بھارت کے مسلمانوں پر ہندوؤں اور سکھوں نے جو بہیمانہ مظالم کیے' ان پر مسلمانوں سے یک جہتی اور اظہارِ ہمدردی کی غرض سے امام حسن البنا نے قائداعظم کے نام

۱۴- موہن داس کرم چند گاندھی (۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء- ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء) پیشے کے اعتبار سے قانون دان' بھارتی ہندوؤں کے مذہبی وسیاسی رہنما اور مہاتما۔

۱۵- جواہر لال نہرو (۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء- ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء) انڈین نیشنل کانگریس کے مرکزی رہنما اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے تادمِ آخر بھارت کے وزیراعظم۔

۱۶- لارڈ ماؤنٹ بیٹن (۲۵ جون ۱۹۰۰ء- ۲۷ اگست ۱۹۷۹ء) برطانیہ کے شاہی خاندان کے رکن اور برطانوی مقبوضہ ہندستان میں آخری وائسرائے (۲۴ مارچ- ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء) جب کہ آزادی کے بعد بھارت کے پہلے گورنر جنرل (۱۹۴۷ء-۱۹۴۸ء)

۱۷- الجریدة الیومیة، قاہرہ، سوموار، ۱۶ شوال ۱۳۶۶ھ، یکم ستمبر ۱۹۴۷ء

حسب ذیل ٹیلی گرام بھیجا:

[قاہرہ: ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء]

جناب قائداعظم محمد علی جناح

مسلمانان ہند کے بہنے والے خون پر اخوان المسلمون گہرے رنج وغم کا شکار ہیں۔ ہم اپنے تمام فوت شدگان کے لیے شہادت اور ان کے اہل خانہ کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں۔ ہم نے ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور گاندھی کے نام بھی فوری تار ارسال کیے ہیں اور انھیں مسلمانوں پر ہونے والی اس زیادتی کو روکنے میں غفلت برتنے کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ ہم دل کی گہرائیوں سے آپ کے ساتھ ہیں اور عملاً آپ کے شانہ بشانہ ہیں۔ اس ضمن میں ہم نے اپنے ہاں موجود سفارتی حلقوں تک بھی اپنے جذبات پہنچائے ہیں، اور ہم اپنے بھائیوں کی خوں ریزی رکوانے کے لیے جو کچھ بھی ممکن ہوسکا' ضرور کریں گے۔ آپ ہمیں جو بھی ہدایت فرمائیں گے، ہم اس کی روشنی میں اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ یقیناً صبر اور ثابت قدمی کا مقدر فتح ونصرت ہوا کرتی ہے۔

حسن البنا[۱۸]

○

صدر مسلم لیگ برطانیہ، علی محمد خاں کے نام خط

مسلم لیگ' لندن نے پاکستان اور بھارت کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والے مظالم پر آواز بلند کرنے کے لیے دنیا بھر کے مسلم ممالک اور اہم پارٹیوں کے ساتھ رابطہ کیا۔ اس موصولہ خط کے جواب میں امام حسن البنا نے لکھا:

[قاہرہ: ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء]

محترم جناب علی محمد خان، صدر مسلم لیگ، لندن

لندن میں اخوان المسلمون کے اخبار کے دفتر کے ذریعے پہنچنے والی آپ کی اپیل نے پورے مصر میں شدید اضطراب پیدا کردیا ہے۔ اے ہمارے مسلم بھائی، ہم آپ کی پکار پر لبیک

۱۸- الجریدة الیومیة، قاہرہ، سوموار، ۱۶ شوال ۱۳۶۶ھ، یکم ستمبر ۱۹۴۷ء

کہتے ہیں۔ آپ کی اپیل آتے ہی ہم نے ان تمام سرگرمیوں کا آغاز کر دیا ہے جن کا تذکرہ آپ نے کیا تھا۔ ہم نے فوراً ماؤنٹ بیٹن، گاندھی اور نہرو کے نام ٹیلی گرام روانہ کیا ہے، جس میں انھیں اس شرم ناک اور وحشیانہ خوں ریزی کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ہم نے انھیں لکھا ہے کہ اسلام سراسر سلامتی کا دین ہے۔ اہل اسلام اپنے دفاع کے علاوہ کبھی جنگ نہیں کرتے، اور بھارت کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ دنیا بھر میں بسنے والے مسلمانوں کا دل جیتنے کی کوشش کرے، اور اپنے ہاں موجود مسلمانوں سے حسن سلوک برتے۔

اسی طرح ہم نے خود قائداعظم کے نام بھی ٹیلی گرام ارسال کیا ہے، جس میں ہم نے مسلمانانِ ہند کی تائید کی ہے، ان سے غم گساری کا اظہار کیا ہے، اور ان کے ہم وطن مسلمان فوت شدگان کے لیے رتبہ شہادت کی دعا کی ہے۔ ہم نے اپنے ہاں موجود سفارت خانوں سے بھی رابطہ کیا ہے اور آئندہ بھی یہ عمل جاری رکھیں گے۔ اس کے علاوہ بھی ہم جو کچھ کر سکے اور جس کام کا بھی آپ نے ہمیں مشورہ دیا، ان شاء اللہ ضرور کریں گے۔ پوری امت مسلمہ ایک جسد واحد کی حیثیت رکھتی ہے اور ہم اسی جسد ملی کا حصہ ہیں، اور اس کی خدمت کے لیے ہمیشہ مستعد ہیں۔

لندن میں ہمارے اخبار کے دفتر کے ذریعے آپ نے ہم سے جو رابطہ کیا ہے، ہم اس پر آپ کے شکر گزار ہیں۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ اس رابطے کو جاری رکھیں، تاکہ حق اور خیر کی خاطر باہمی تعاون جاری رہے۔

خدا حافظ اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حسن البنا[19]

○

علامہ شبیر احمد عثمانی کے نام خط

تحریک پاکستان کے بزرگ رہنما اور ممتاز دینی قائد، جناب شبیر احمد عثمانی[20] نے امام حسن البنا سے

۱۹- الجریدة الیومیة، قاہرہ، سوموار، ۱۶ شوال ۱۳۶۶ھ، یکم ستمبر ۱۹۴۷ء

۲۰- علامہ شبیر احمد عثمانی (۲۸ ستمبر ۱۸۸۷ء، بجنور- ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء، کراچی) دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل،

اظہار یک جہتی کرتے ہوئے یہ تفصیلی خط لکھا، جس میں رنج وغم کا اظہار اور ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے پر سرگرم کار اسلامیانِ عالم کے دلی جذبات اور پاکستان سے وابستہ توقعات کا بیان ملتا ہے:

[قاہرہ: ۱۸ نومبر ۱۹۴۷ء]

بزرگ جلیل جناب شبیر احمد عثمانی مدظلہٗ

اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے، جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ اس مالک کی تعریفیں بیان کرتے ہوئے' آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے اہل بیت صحابہ کرامؓ اور قیامت تک آپ کی شریعت پر عمل کرنے اور آپ کی دعوت عام کرنے والوں پر درود وسلام بھیجتے ہوئے، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

حرمین شریفین میں اور پھر قاہرہ میں مجھے برادر عزیز الحاج کرم علی صاحب سے بہت مفید ملاقاتوں کا موقع ملا۔ ان کے ذریعے آپ کی خدمات جلیلہ کا بھی علم ہوا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ آپ پاکستان اور دیگر ممالک میں ہمارے بھائیوں میں اسلام کی دعوت اور اس کے احکامات عام کرنے کے لیے ہمہ پہلو جہاد کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ جان کر ہمیں دلی مسرت ہوئی۔ غائبانہ طور پر آپ سے اللہ کی خاطر محبت کا ایک مضبوط تعلق قائم ہوگیا' اور ہم نے رب ذوالجلال سے دعا کی کہ اپنے فرشتوں کے ذریعے آپ کی مدد فرمائے اور ہمارا اور آپ کا شمار اپنے ہدایت یافتہ اور پیغام ہدایت کے حامل ان داعیان حق میں فرمائے، کہ جو اللہ کی عطا کردہ بصیرت کے سہارے دعوت حق کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

پاکستان کی صورت میں ایک ابھرتی ہوئی اسلامی ریاست کے وجود سے' ہمیں عظیم مسرت نصیب ہوئی اور اللہ کے حکم سے اس کے ساتھ ہماری بڑی امیدیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری یہ امیدیں پوری فرمائے۔ اگرچہ پاکستان کو معرض وجود میں آنے کے فوراً بعد

شیخ الہند مولانا محمود حسن (۱۸۵۱ء-۱۹۲۰ء) کے خاص شاگرد۔ مسلم لیگ کے حامی اور تحریک پاکستان کے سرگرم رہنما۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے رکن۔ دینی امور میں رہنمائی کے لیے قائداعظم محمد علی جناح ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ پہلی دستور ساز اسمبلی پاکستان سے 'قرارداد مقاصد' منظور کرانے کے لیے آپ کی جدوجہد مرکزی مقام رکھتی ہے۔

بڑی مہیب رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے، تعصب کرنے والوں کے تعصبات، سازشی عناصر کی سازشوں اور ان کی جانب سے حالیہ مجرمانہ و تباہ کن جارحیت کا منہ دیکھنا پڑا ہے، لیکن ہمیں یقین ہے کہ یہ سب کچھ اسے جہاد فی سبیل اللہ، جدوجہد آزادی و استقلال سے اور اسلام حنیف کے احکامات کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے سے روک نہیں سکے گا اور پرچم اسلام یقیناً سربلند ہوگا، ان شاء اللہ۔

ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں اس مبارک سفر میں ہمارے پاکستانی بھائی تنہا نہیں ہیں۔ پوری امت اسلامیہ اور اقوام عرب اپنے تمام تر جذبات و احساسات اور اپنی عملی کاوشوں کے ذریعے آپ کے ساتھ ہیں۔ اخوان المسلمون جو کہ ان اقوام و امم کی اکثریت کی ترجمانی کرتی ہے اور جس کا شعار یہ ہے: 'اللہ ہمارا مقصود ہے، رسولؐ ہمارا اسوہ ہیں، قرآن ہمارا دستور ہے، جہاد ہمارا راستہ ہے، اور اللہ کی راہ میں موت ہماری سب سے بڑی آرزو ہے' ___ وہ تب تک چین سے نہیں بیٹھیں گے اور انھیں تب تک سکون نصیب نہیں ہوگا، جب تک کہ پاکستان کو نصرت و استحکام نصیب نہ ہو جائے اور اسے اطمینان و سلامتی حاصل نہ ہو جائے، اس راستے میں جو بھی قربانیاں دینا پڑیں، وہ ضرور دیں گے۔

پورے روے زمین کے مسلمانوں کی سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ریاست اسلامی پاکستان کے تمام سرکاری اور عوامی معاملات: اسلامی تعلیمات و احکامات اور جامع رہنمائی کی محکم بنیادوں پر استوار ہو جائیں۔ اگر عصر حاضر کے حادثات نے سوشلزم، جمہوریت یا دیگر ایسے نظریات کو جنم دیا ہے، جو کسی بھی صورت اسلام کے جامع اور مکمل نظام کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اسلام عذاب و اذیت سے دوچار انسانیت کو عالمی بھائی چارے کے مضبوط رشتے سے جوڑتا ہے، اور اگر دنیا میں ایسے ممالک موجود ہیں جنھوں نے ان نظریات کو اپنایا ہے اور اپنے مال و اعمال سے ان کی مدد کر رہے ہیں، تو ہم مسلمانوں کا بھی فرض اولین ہے کہ ہماری ایسی حکومتیں قائم ہوں اور ایسے ممالک وجود میں آئیں، جن کی بنیاد اسلام کی دعوت پر رکھی گئی ہو، اس دعوت پر کہ ایک جامع نظام اور کامل پیغام کی حامل دعوت ہے۔

اکثر مسلم ممالک کی حکومتیں اسلام کی حقیقی تعلیمات سے منحرف ہو چکی ہیں، کوئی کم کوئی

زیادہ، لیکن اب یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ حکومت پاکستان کی بنیاد ہی اسلام پر رکھی جائے۔ اب اسلام ہی اس کا شعار، اسلام ہی اس کی متاع، اسلام ہی اس کی تکوینی بنیاد اور اسلام ہی اس کی ترقی کا راز قرار پایا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت اسی کے لیے بچا کر رکھی ہوئی تھی، تاکہ وہ دوسروں سے پہلے اور دوسروں سے نمایاں ہو کر اس فضیلت کو پالے۔

جناب من، اب ان لوگوں کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے کتاب عطا کی ہے، جن سے پختہ عہد لیا ہے کہ وہ اس کتاب کو لوگوں تک پہنچائیں گے، اس کا کتمان نہیں کریں گے۔ اس کی خاطر نصیحت کریں گے اور اسی کی طرف لوگوں کی رہنمائی کریں گے، خواہ انھیں اس راہ میں کتنی بھی مصیبتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ اب آپ کے لیے یہ سنہری موقع ہے، کہ آپ حکومتی ذمہ داران کی بھی اسی درست سمت میں رہنمائی فرمائیں۔ انھیں دین حنیف کی تعلیمات اپنانے پر آمادہ کریں، اور انھیں اس ضمن میں دین کی آسانیوں سے روشناس کروائیں۔ جناب من، آپ امت مسلمہ میں اخوت کی وہ روح دوڑائیں، جس کی آبیاری، جس کی سرپرستی اور جس کی بیداری کے لیے قرآن کریم نازل ہوا۔ اس مقصد کے حصول میں کامیابی ہوگئی، تو امت مسلمہ، وحدت و یگانگت کے علاوہ کسی دوسری جانب نہیں جاسکے گی۔ اس کی تاریخ، اس کا شعور، اس کی اخوت اور اس کی جہت ایک ہی رہے گی، خواہ وہ بعض مسائل یا آرا میں کچھ اختلافات ہی کیوں نہ رکھتی ہو۔ جناب من! آپ امت واحدہ میں مذہبی تعصبات کی بیخ کنی کے لیے ہر ممکن سعی فرمایئے، جس کی جو رائے ہے وہ رکھے، لیکن رہیں گے سب ہمہ پہلو اسلام ہی کے زیر سایہ۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو اس کی تائید حاصل رہے اور آپ کے دست مبارک پر خیر کثیر جاری فرمائے اور ہمیں اپنے فیصلوں میں رشد و ہدایت سے نوازے۔

خدا حافظ اور السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

حسن البنا[۲۱]

○

۲۱- الجریدۃ الیومیۃ، قاہرہ، بدھ ۶ محرم ۱۳۶۷ھ/ ۱۹ نومبر ۱۹۴۷ء

قائد اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان کے نام

پاکستان کو معرض وجود میں آئے ساڑھے تین ماہ گزر چکے تھے، لیکن مشکلات اور رنج والم کا طوفان تھمتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس صورت حال میں امام البنا نے قائداعظم سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

[قاہرہ: ۲۴ نومبر ۱۹۴۷ء]

عزت مآب جناب قائداعظم محمد علی جناح

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

ہم وہ مبارک گھڑیاں کبھی فراموش نہیں کرسکتے ہیں جن میں مصر کو آپ کی زیارت، اور ہمیں آپ سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ آج جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری ان آرزوؤں کو پورا کردیا ہے جن کے بارے میں ہم نے باہم گفتگو کی تھی، اور پاکستان کی اسلامی ریاست ایک حقیقت کی صورت میں نقشۂ عالم پر موجود ہے۔ ہم' جناب کی خدمت میں دلی مبارک باد اور نیک تمنائیں پیش کرتے ہیں۔

اس وقت خوں ریزی کے جو افسوس ناک واقعات دیکھنے میں آرہے ہیں، اور جس طرح مسلمانوں کے نوتشکیل اور نوخیز ملک کے خلاف جارحیت کی جارہی ہے، اس کی بازگشت مصر اور عالم عرب کے ہر باشندے نے اور اخوان المسلمون کے ہر کارکن نے خاص طور پر اپنے دل میں محسوس کی ہے۔ ان کٹھن لمحات میں مسلم اقوام، پاکستان کے مجاہد عوام اور پاکستان کی مقدس ریاست کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔

جناب قائد، آپ اس ضمن میں کامل یقین اور بھروسا رکھیے۔ آپ یقین رکھیے کہ ہم آپ کے شانہ بشانہ رہ کر دل و جان سے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہیں، یہاں تک کہ پاکستان اپنی آزادی، استحکام اور مذموم تعصب کے خلاف مزاحمت کی بھرپور جدوجہد میں مکمل طور پہ فتح یاب ہوجائے۔

ہمیں کامل یقین ہے کہ آپ کی حکیمانہ قیادت میں پاکستان ہر شعبہ زندگی میں حقیقی اسلامی

منزل کی طرف گام زن ہوگا۔ پاکستان، اسلام کی ان تعلیمات پر اپنی ترقی کی بنیادیں استوار کرے گا جو ہر زمانے اور ہر علاقے کے لیے یکساں موثر ہیں۔ اس طرح پاکستان مضبوط ترین بنیادوں پر تعمیر حیات کرتے ہوئے دنیا بھر کے مسلمانوں اور دیگر اقوام کے لیے ایک روشن مثال قائم کرے گا۔

میں آپ کی خدمت میں اخوان المسلمون کے سیکرٹری جنرل اور اپنے مجاہد بھائی صالح عشماوی[۲۲] کو بھیج رہا ہوں، جو ہمارے روزنامے کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ الحمدللہ، ہمارا یہ روزنامہ مصری اور پاکستانی رائے عامہ میں قربت و ہم آہنگی پیدا کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔ یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں، تاکہ وادیِ نیل اور عالم عرب کے شرق و غرب میں بسنے والے اخوان کے مخلصانہ اور محبت بھرے جذبات آپ تک پہنچاسکیں۔ میں اس موقع پر یہ ذکر خیر کرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کررہا ہوں کہ ان دنوں ہمارے بھائی عبدالعلیم صدیقی[۲۳]، مصر کے معزز مہمان کی حیثیت سے یہاں موجود ہیں، جو پاکستان سے وادیِ نیل میں اخوان المسلمون کے مرکز آئے ہوئے ہیں۔

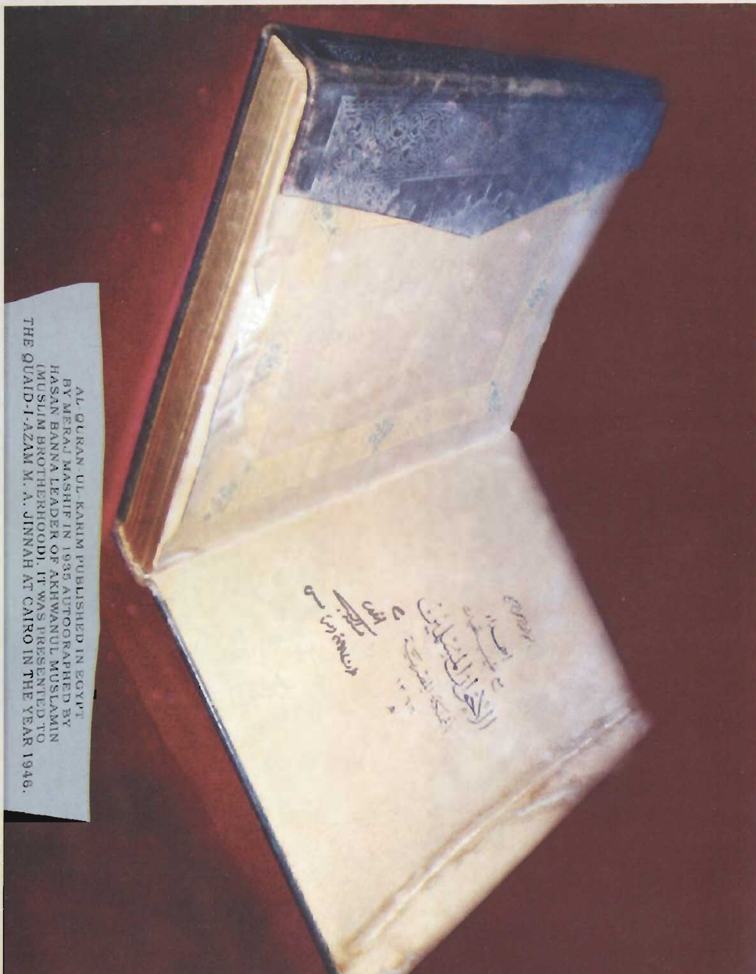
۲۲- صالح عشماوی (۱۹۱۱ء-۱۹۸۳ء) اخوان المسلمون کے مرکزی رہنما اور قائد صحافت تھے۔ زندگی کی آخری ساعتوں تک اخوان المسلمون کے مختلف رسائل و جرائد کی ادارت کا فریضہ انجام دیا۔ جن رسائل کے مدیر رہے، ان کے نام یہ ہیں: النذیر، الدعوة، المسلمون، مجلة الاخوان المسلمون، المنبرالشرق، البشریٰ، المنار، الاعتصام، النضال وغیرہ۔

۲۳- مولانا شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی (۳ اپریل ۱۸۹۲ء، میرٹھ۔ ۲۲ اگست ۱۹۵۴ء مدینہ منورہ)۔ بڑے معروف اور مصروف مبلغ اسلام تھے۔ ان کے اساتذہ میں شیخ احمد شمس (مراکش) شیخ السنوسی (لیبیا) اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی شامل تھے۔ آپ مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم و مغفور (۱۸۵۶ء-۱۹۲۱ء) کے قابلِ اعتماد رفقا میں شمار ہوتے تھے۔ امریکا، افریقہ، ایشیا اور یورپ کے ۴۰ ممالک میں دینی و دعوتی سرگرمیوں میں زندگی بھر منہمک رہے۔ آپ کے بیٹے مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی (۱۹۲۶ء میرٹھ- ۱۱ ستمبر ۲۰۰۳ء، اسلام آباد) پاکستان کے معروف دینی اور سیاسی رہنما تھے۔ مولانا شاہ محمد عبدالعلیم مرحوم کی صاحب زادی ڈاکٹر فریدہ احمد (ممبر قومی اسمبلی پاکستان) پاکستان کی خواتین میں دینی، علمی اور سیاسی سطح پر بلند مقام رکھتی ہیں۔

مُرشدِ عام حسنُ البنّاؒ کی جانب سے قائد اعظمؒ کو پیش کردہ

القرآن

کا عکس جو مزارِ قائد کراچی کے گوشۂ نوادرات میں موجود ہے





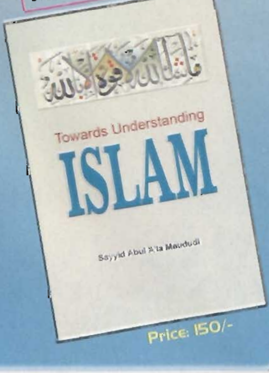
قرآن سمجھنے کے لیے بہترین



1-S سادہ بین السطور 425	3-S بین السطور مع حواشی، سادہ 500
1-B آرٹ پیپر بکس 600	3-B بین السطور مع حواشی آرٹ پیپر بکس 1000
1-F آرٹ پیپر بغیر بکس 550	3-S بین السطور مع حواشی، آرٹ پیپر فوم 900



2-S سادہ ترجمہ مع مختصر حواشی خورد 450	4-A مع مختصر حواشی، آفسٹ پیپر کلاں 450
2-B سادہ ترجمہ مع مختصر حواشی آرٹ پیپر بکس خورد 550	4-S مع مختصر حواشی، کلاں 350
2-F سادہ ترجمہ مع مختصر حواشی آرٹ پیپر فوم خورد 500	5-S مع مختصر حواشی، 23 x 36 x 8 650





تلاوت : علی عبدالرحمٰن الحذیفی

ترجمہ : عظیم سرور

حواشی : سفیر حسن اور عبدالقدیر سلیم کی آوازوں میں

چھ جلدیں مکمل ایک DVD میں، ۱۰۰ روپے میں

چھ سی ڈی MP3 میں، ۲۲۵ روپے میں

سمع و بصر، منصورہ، سے بھی دستیاب ہے

ادارہ ترجمان القرآن

غزنی سٹریٹ، ترجمان مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 7234014-7236665

ای میل: idaratarjuman@yahoo.com، ویب سائٹ: www.tarjumanulquran.com.pk

Designed By: MANSHURAT

انھوں نے نہایت محنت وخوش اسلوبی سے اپنے پروگرام کیے ہیں اور وہ بہت کامیاب عوامی سفیر ثابت ہوئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مصر میں پاکستان کا موقف کیسے پیش کریں اور یہاں کے عوام کے ساتھ اپنے قلبی روابط کس طرح مضبوط کریں۔

اگرچہ اس وقت ہم آپ کی طرف صرف یہی نیک جذبات اور خطوط ارسال کر پا رہے ہیں، لیکن ہمیں امید ہے کہ ہم عنقریب اپنی اس ابدی اخوت کا عملی اظہار بھی کرسکیں گے کہ جس اخوت کے اس ابدی رشتے کو کبھی زوال نہیں آسکتا، یہ ہمیشہ باقی رہنے والے دین اسلام کی طرح قائم ودائم، زیادہ قوی، زیادہ مؤثر اور دوجہاں میں زیادہ نفع بخش ثابت ہوگا۔

آخر میں ایک بار پھر ہمارے تحیات اور احساسات تو قیر قبول فرمائیے۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

حسن البنا [۲۴]

○

بھارتی قیادت کے نام ٹیلی گرام

جنوبی ہند میں ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء کو نظام الملک کی قیادت میں حیدرآباد دکن' خودمختار ریاست بن گئی تو مغل بادشاہ محمد شاہ نے نظام الملک کو آصف جاہ کا خطاب دیا۔ ۱۸ویں صدی عیسوی میں جب سازش' ہوس اور ظلم کے زور پر برطانوی سامراج نے ہندستان پر غلبہ پانا شروع کیا تو حیدرآباد دکن نے دوسری ریاستوں کے برعکس اپنی نیم خودمختارانہ حیثیت کا تحفظ کرنے کی کوشش کی۔ اس ریاست کا اپنا سکہ' اپنی ڈاک' ریل اور اپنا فوجی وانتظامی نظم ونسق تھا۔ اس کے فرماں روا کبھی برطانوی ہند کے 'والیانِ ریاست کے اجلاس' (چیمبر آف پرنس) میں شریک نہ ہوئے۔ ۳جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے فارمولے کا اعلان ہوا' اور برطانوی مقبوضہ ہند کی ریاستوں کو حق دیا گیا کہ وہ بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک ملک سے الحاق کرسکتے ہیں۔ ۱۱جون ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد، دکن کے حاکم

۲۴- الجريدة اليومية، قاہرہ، منگل، ۱۲محرم ۱۳۶۷ھ/ ۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء

میر عثمان علی خاں[۲۵] نے حیدرآباد کی آزادی کا فرمان جاری کرتے ہوئے کہا: ''پاکستان میں شرکت، حیدرآباد کی ہندو رعایا کے لیے تکلیف کا باعث ہوگی' اس لیے حیدرآباد' ریاست آزاد رہ کر' مستقبل کے ممالک بھارت اور پاکستان سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے گی''۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان اور ۱۵ اگست کو بھارت کا قیام عمل میں آیا' مگر پہلے ہی روز سے بھارت نے حیدرآباد کو دبانے اور مرعوب کرنے کی پالیسی پر عمل شروع کیا۔ آخرکار ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو بھارت اور حیدرآباد کے درمیان 'معاہدہ انتظامیاتِ جاریہ' طے پایا' جس میں بھارت نے ریاست حیدرآباد' دکن کی محدود خودمختاری کے احترام اور تحفظ کا وعدہ کیا۔ مگر بھارت نے اس معاہدہ جاریہ کی بہت جلد خلاف ورزیاں شروع کردیں' اور ریاست کے اندر ہندو انتہاپسندی کو کھلے عام جدید ترین اسلحہ فراہم کرنا شروع کردیا' جنھوں نے دہشت انگیزی اور مسلم کشی کی منظم کا آغاز کردیا۔ چاروں طرف سے بھارتی سلطنت میں گھری (land locked) اس ریاست پر دہلی کے حکمرانوں کا حریصانہ دباؤ بڑھتا گیا، جس کے تحت ریاست کی معاشی ناکہ بندی کردی' پٹرول کی فراہمی ختم کردی' ادویات' کپڑے اور خوراک کی سپلائی روک دی' انجام کار ہزاروں افراد موت کے منہ میں چلے گئے۔ ریاست نے دہلی سے مفاہمت کی بہت کوشش کی مگر ہر پیش کش ٹھکرا دی گئی۔[۲۶] بھارت نے حیدرآباد پر چڑھائی کرنے کے لیے ریاست کی سرحدوں پر اپنی افواج لگادیں، تاکہ اس کی آزادی سلب کرتے ہوئے اسے زبردستی اپنے ساتھ قبضے میں لے آئے۔ اس تباہ کن صورت حال میں اخوان المسلمون کے مرشد عام امام حسن البنا نے بھارت کی حسب ذیل شخصیات کے نام یہ ٹیلی گرام ارسال کیا:

[قاہرہ: ۱۴ جون ۱۹۴۸ء]

o پنڈت جواہر لال نہرو: وزیراعظم' نئی دہلی

۲۵- ریاست آصفیہ حیدرآباد' کے حکمران کا لقب نظام ہوتا تھا۔ قیامِ پاکستان کے وقت میر عثمان علی خاں (۶ اپریل ۱۸۸۶ء - ۲۴ فروری ۱۹۶۷ء) اس کے حکمران تھے۔ ۱۹۴۸ء میں بھارت کی فوجی یلغار کے وقت یہ دولت آصفیہ کے آخری حکمران تھے۔ (پروفیسر احمد سعید: Muslim India ۱۹۹۷ء' ص ۲۶۰)

۲۶- اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۸، دانش گاہ پنجاب، ص ۷۴۹-۷۵۰

o راج گوپال:[۲۷] گورنر جنرل، نئی دہلی

o سری پرکاش: بھارتی قونصل جنرل، کراچی

"حیدرآباد ایک آزاد ریاست ہے، اور ہر مسلمان اور عرب باشندے کو بے حد عزیز ہے۔ اس کے خلاف کوئی بھی جارحیت یا اس سے کوئی بھی چھیڑ چھاڑ، عالم اسلام کے ہر باشندے کو اشتعال دلانے کا سبب بنے گی۔ عالم اسلام اس آزاد ریاست کے مسلمانوں کے خلاف ہونے والی کسی جارحیت پر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہیں گے۔

عالم عرب اور عالم اسلامی کی ترجمانی و نمایندگی کرتے ہوئے اخوان المسلمون، بھارتی حکومت کو ریاست حیدرآباد [دکن] کی سلامتی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ ظلم وزیادتی کے بجاے انصاف وسلامتی کی ترویج کے لیے اپنی ذمہ داریاں ادا کرے گی"۔

حسن البنا[۲۸]

o

حیدر آباد دکن کے سربراہ عثمان علی خان کے نام

اُوپر مذکورہ صورت حال کی مناسبت سے میر عثمان علی خاں کو یہ ٹیلی گرام روانہ کیا گیا:

[قاہرہ: یکم اگست ۱۹۴۸ء]

محترم المقام نظام عثمان علی

عالم عرب اور عالم اسلام کے اخوان المسلمون کی طرف سے ہم ریاست حیدرآباد کی آزادی کی مکمل تائید کرتے ہیں، اور آپ کی مملکت کے خلاف ہونے والی کسی بھی جارحیت کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ ہم نے اس ضمن میں بھارتی حکومت کے ذمہ داران کے نام بھی ایک ٹیلی گرام

۲۷- چکرورتی راج گوپال اچاریہ (۱۸۷۸ء-۱۹۷۲ء) انڈین نیشنل کانگریس کے مرکزی رہنما اور ماؤنٹ بیٹن کے بعد بھارت کے دوسرے گورنر جنرل (۱۹۴۸ء-۱۹۵۰ء)

۲۸- الجریدۃ الیومیۃ، قاہرہ، ۷ شعبان ۱۳۶۷ھ، ۱۵ جون ۱۹۴۸ء

ارسال کیا ہے، جس میں ہم نے عالم عرب اور عالم اسلام کے اس دوٹوک موقف کا اعادہ کیا ہے کہ حیدرآباد کے خلاف کسی بھی طرح کی جارحیت ناقابل قبول ہے۔ ہم نے مطالبہ کیا ہے کہ اس سرزمین کا امن واستحکام یقینی بنایا جائے اور اس کی آزادی واستقلال پر کوئی آنچ نہ آنے دی جائے۔

حسن البنا[۲۹]

○

مصر میں مسلم ممالک کے وزراے خارجہ کے نام ٹیلی گرام

[قاہرہ: یکم اگست ۱۹۴۸ء]

محترم جناب، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

پاکستان اور بھارت کی صورت میں انگریزی سامراج کے چنگل سے آزادی نے تمام مسلم اقوام کے دلوں پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ مشرقی اقوام کو عمومی طور پر انتظار تھا کہ یہ دونوں نوآزاد ریاستیں باہم محبت وہم آہنگی سے رہیں گی، لیکن بدقسمتی سے بھارت انگریزوں کی شہ پر، برادر ملک پاکستان سے دشمنی پر اتر آیا ہے، وہ اس کے ایک مضبوط اور معزز مشرقی ملک بننے سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے۔

یہی نہیں، بلکہ وہ پورے بھارت میں پھیلے ہوئے مسلمانوں سے جنگ پر اتر آیا ہے۔ اسلامی ریاست جموں وکشمیر سے اس کا برتاؤ پوری دنیا کو معلوم ہے۔ وہ وہاں کے عوام کے حق خودارادیت کے خلاف برسرپیکار ہے۔ وہ اپنے غلط موقف پر اصرار کرتے ہوئے امن وسلامتی کو جنگ وجدال میں بدل دینا چاہتا ہے۔ بھارت نے مسلمانوں کو کچلنے کے لیے اپنی یہ رجعت پسندانہ پالیسیاں ہر خطے میں اپنائی ہوئی ہیں۔ اب وہ ایک نئے شکار (ریاست حیدرآباد) پر جھپٹا ہے۔ حالانکہ یہ ایک مستقل ریاست ہے، مگر بھارت اس کی آزادی کا انکاری ہے، اور اسے دھمکیاں دے رہا ہے۔ وہ نظام حیدرآباد کے زیرانتظام آزادی وامن سے رہنے والے بعض چھوٹے غیرمسلم دھڑوں کو بغاوت پر اُکسا رہا ہے۔

۲۹- الجریدة الیومیة، قاہرہ، ۲۶ رمضان ۱۳۶۷ھ، ۲ اگست ۱۹۴۸ء

یہی نہیں، بلکہ بھارت نے اس ریاست کی سرحدوں پر فوجیں لا بٹھائی ہیں، اور اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے، اس طرح حیدرآباد کے خلاف خفیہ اعصابی جنگ چھیڑ دی گئی ہے۔ خود نظام [یعنی میرعثمان علی خان] کے خلاف پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور ان کی حکومت پر استبدادی نظام ہونے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ بھارت کو تب تک چین نہیں آئے گا، جب تک وہ حیدرآباد کے خلاف ظالمانہ حملہ نہیں کر دیتا، اس کی دولت اور قیمتی ذرائع آمدنی پر قبضہ نہیں جما لیتا اور ہندوؤں کے ہاتھ میں مسلمانوں کی گردنیں دیتے ہوئے ان کے مردوں کو ذبح کرنا اور خواتین کی توہین کرنا یقینی نہیں بنا لیتا۔ ان کے گھربار اور بستیاں تباہ نہیں کروا دیتا، اس سے پہلے وہ کشمیر اور پاکستان میں بھی ایسا ہی کر چکا ہے۔

تحریک اخوان المسلمون آپ سے بھرپور اپیل کرتی ہے کہ آپ ازراہ کرم آزاد ریاست حیدرآباد کی تائید وحمایت کریں۔ اپنے ملک میں موجود بھارتی سفیر کو فوراً طلب کریں یا بھارتی وزیرخارجہ کو بلائیں اور انھیں بتائیں کہ آپ ایک آزاد [مسلم] ریاست حیدرآباد پر کسی بھی طرح کی جارحیت کو یکسر مسترد کرتے ہیں۔ آپ سے یہ بھی درخواست ہے کہ آپ نظام حیدرآباد سے رابطہ کرتے ہوئے انھیں اپنی تائید کا مکمل یقین دلائیں۔

اس عادلانہ مسئلے کے بارے میں آپ کی کامیاب کاوشوں کے انتظار میں ہم آپ عزت مآب کی خدمت میں باحترام تمام، سلام وتحیات پیش کرتے ہیں۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

حسن البنا[۳۰]

○

پاکستان کے پہلے یوم آزادی پر حسن البنا کا پیغام

اسلامی نیوز ایجنسی نے مرشد عام سے درخواست کی کہ پاکستان کے پہلے یوم آزادی ۱۴ اگست

۳۰- الجریدة الیومیة، قاہرہ، ۲۶ رمضان ۱۳۶۷ھ، ۲ اگست ۱۹۴۸ء

۱۹۴۸ء کے موقع پر اپنا پیغام ارسال کریں، تو مرشد عام حسن البنا نے درج ذیل پیغام لکھا:

[قاہرہ: اگست ۱۹۴۸ء]

''اسلامی ریاست پاکستان کی تشکیل و ولادت پر پورے عالم اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اسلامی نظام حیات کی اقامت کی طرف دعوت دینے والے اخوان المسلمون کی خوشی اپنے دوسرے بھائیوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ہم نے نظامِ اسلامی کی آغوش میں جنم لینے والی، اس کے سایے میں پروان چڑھنے والی اس مضبوط ریاست کے وجود میں آنے پر وہ حوصلہ و ہمت حاصل کی ہے، جس نے ہمارے جذبۂ جہاد کو دوچند کر دیا ہے، ہمیں حادثات سے دل شکستہ نہ ہونے کا پیغام دیا ہے، اور مشکلات پر غلبہ پالینے کے یقین سے سرشار کر دیا ہے۔ پاکستان کی آزادی سے ہمارے اس یقین کو مہمیز ملی ہے کہ ہمیں بھی یقیناً اسلامی نظام کی اسی منزل تک پہنچنا ہے، جس کی نعمت سے ہمارا یہ برادر اور نوزائیدہ ملک ہم کنار ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اسلامی ریاست کو برکتیں عطا فرمائے اور اسے اپنی تائید و نصرت سے نوازے۔

اس دور میں کہ جب پوری دنیا ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ اسے ایک طرف سے سوشلزم اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور دوسری طرف سے اینگلو امریکی سرمایہ دارانہ جمہوری نظام، حالانکہ مسلمانوں کے لیے ان دونوں نظاموں میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ ان کے پاس اللہ کی کتاب ہے، نظامِ اسلامی کا مکمل خاکہ ہے اور رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہے:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (المائدہ ۵:۱۵،۱۶) تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے، اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

ہم پاکستان کی اس مبارک عیدِ آزادی کے موقع پر، اس کے معزز عوام، حکیم حکومت اور قائد اعلیٰ [محمد علی جناح] کی خدمت میں دلی مبارک باد اور معطر تحیات پیش کرتے ہیں۔ ہم

اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ اسے اپنی خصوصی تائید سے نوازے، اپنی خصوصی رحمت سے اس کی حفاظت فرمائے اور اس کے نصیب میں عروج و کمال اور توفیق و ہدایت لکھ دے، آمین۔

ہم اپنے عزیز ملک پاکستان کے عوام اور حکومت کی خدمت میں عید الفطر کے مبارک موقع پر بھی خلوص و محبت کے پرجوش احساسات و جذبات پیش کرتے ہیں۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حسن البنا[۳۱]

○

بھارتی وزیراعظم نہرو کے نام ارسال کردہ ٹیلی گرام

۲۱ اگست ۱۹۴۸ء کو ریاست حیدرآباد نے اپنا مقدمہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پیش کیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائداعظم کا انتقال ہوا، اور ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو علی الصبح بھارت کی مسلم افواج نے ریاست پر پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ دو لاکھ مسلمان، ہندو افواج کے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنے۔ ہزاروں خاندان اُجڑ گئے اور حیدرآباد دکن بھارت میں ضم کر لی گئی ہے۔ فوری حکم کے تحت اُردو میں تعلیم ختم کرتے ہوئے ہندی لازمی کر دی گئی۔ مسلمانوں کو ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا اور بہت سی مساجد شہید کر دی گئیں۔[۳۲] حسن البنا نے وزیراعظم ہند جواہر لال نہرو کو یہ ٹیلی گرام ارسال کیا:

[قاہرہ: ستمبر ۱۹۴۸ء]

عالم عرب اور عالم اسلام کے الاخوان المسلمون حیدرآباد پر بھارت کی وحشیانہ جارحیت پر شدید احتجاج کرتے ہیں۔ عنقریب رجعت پسند ہندوازم بھی اسی انجام سے دوچار ہوگا، جس سے دیگر سامراجی ممالک دوچار ہوئے۔ ریاست حیدرآباد آزاد ہو کر رہے گی۔

حسن البنا[۳۳]

۳۱- الجریدۃ الیومیۃ، قاہرہ، ۱۰ شوال ۱۳۶۷ھ، ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء

۳۲- اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۸، دانش گاہ پنجاب لاہور، ص ۷۵۱

۳۳- الجریدۃ الیومیۃ، قاہرہ، سوموار، ۱۰ ذوالعقدہ ۱۳۶۷ھ، ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء

❊❊❊

مجددعصر اور اخوان: مشاہدات

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی ○

امام حسن البنا شہید کے صد سالہ جشن ولادت کی مناسبت سے ترجمان القرآن نے جو خصوصی شمارہ شائع کرنے کا عزم کیا ہے، وہ بہت مستحسن و مبارک قدم ہے۔ اس موقع پر میں نے سوچا کہ اس عظیم شہید کی شخصیت و شمائل، ان کی دعوت و تحریک، ان کی تصنیفات و خطبات، ان کے دعوتی خصائص و امتیازات وغیرہ پر تو بہت سے فاضل مقالہ نگار روشنی ڈالیں گے، اخوان المسلمون جو ان کا سب سے بڑا کارنامہ بلکہ ان کا سرمایۂ حیات اور ان کی زندگی کا نچوڑ تھی، کیوں نہ میں اس کے بارے میں اپنے مشاہدات پیش کروں، کہ میں مصر اور شام میں اس سے وابستہ رہا ہوں، اور عراق و اردن میں بھی اس تحریک کے مظاہر بڑے قریب سے دیکھے ہیں۔ اس کے قائدین اور کارکنوں کے ساتھ میرا گہرا تعلق رہا ہے بلکہ میں ان کے خاندان (اسرہ، سب سے چھوٹا تنظیمی یونٹ) کا ایک فرد رہا ہوں۔ میں نے ان کو آزادانہ اور سرفروشانہ سرگرم عمل بھی دیکھا ہے، اور ان کا وہ دور ابتلا بھی دیکھا ہے جب سرزمینِ مصر ان کے چھے ممتاز شہیدوں کے لہو سے لالہ زار تھی، اور جب ان کے ہزاروں کارکن و قائدین پابند سلاسل تھے اور ہزاروں ہی خود اختیاری جلاوطنی پر مجبور تھے۔

وہ سرزمین جہاں امام حسن البنا شہید پیدا ہوئے، اور جہاں ان کی عظیم عالمی اسلامی تحریک اخوان المسلمون پروان چڑھی اور پھر ان کے خون سے لالہ زار ہوئی، یعنی مصر، اس پر میں نے

○ کیمبرج یونی ورسٹی سے قدیم تفسیری نسخے پر تحقیق کے نتیجے میں ڈاکٹریٹ۔ کیمبرج یونی ورسٹی، بن غازی یونی ورسٹی لیبیا، اور شاہ سعود یونی ورسٹی ریاض میں تاریخ و تمدن اور عربی زبان و ادب کے استاذ رہے۔ حال مقیم: کراچی

پہلا قدم ستمبر ۱۹۵۳ء میں رکھا۔ مصر کا میرا یہ پہلا سفر جدہ سے سویز براستہ سمندر تھا۔ اس کے بعد متعدد بار فضائی اور بری راستوں (لیبیا، مصر) سے مصر جانا ہوا، لیکن پہلا سفر متعدد وجوہ سے بڑا یادگار سفر تھا۔ ایک تو یہ کہ اس کا دورانیہ خاصا طویل، یعنی تقریباً پونے دو سال تھا، کیونکہ یہ مطالعاتی اور تعلیمی سفر تھا۔ دوسرے، یہ کہ اس سفر میں جو جنرل نجیب کے ہاتھوں انقلاب کے صرف ایک سال بعد پیش آیا تھا، میں نے مصر میں فوجی سیاست کے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں نے اس سفر میں مختلف مراحل میں اخوان کی تحریک کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا، اس کے راہ نماؤں کو سنا اور اس کے کارکنوں کے صبح و شام دیکھے۔ ان کے عزم و ہمت کا مشاہدہ کیا اور ان کا صبر و ثبات دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ساتھ میرا جو زمانہ گزرا وہ بہت ہی عزیز زمانہ تھا۔

○ **اخوان سے تعلق:** اخوان سے میرا تعلق مکہ مکرمہ میں قائم ہوا تھا، جہاں میں ۱۹۵۰ء کے حج سے ستمبر ۱۹۵۳ء تک مقیم رہا (بیچ میں پانچ چھے ماہ کا سفر دمام کا پیش آیا)۔ میں حج پر استاذ معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (مولانا علی میاں) کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ حج کے موقع پر اخوان کے ایک نوجوان راہ نما اور (بعد ازاں) امام حسن البنا شہید کے داماد الاستاذ سعید رمضان بھی آئے ہوئے تھے، جن سے میرے استاذ معظم مولانا علی میاں رحمۃ اللہ کا تعارف ہوا، جو بعد میں ایک مستقل دوستی اور تعلق میں تبدیل ہوگیا۔

استاذ سعید رمضان مرحوم نے مکہ کے واحد بڑے ہوٹل 'بنک مصر' میں حج کے فوراً بعد ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں حجاز کے علما، ادبا اور دانش وروں کو دعوت دی۔ اس جلسے میں مشہور مبلغ اسلام مولانا عبدالعلیم صدیقی (مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم کے والد گرامی) بھی مقرر کی حیثیت سے شامل تھے اور میں بھی حضرت مولانا علی میاں کے ایک رفیق کی حیثیت سے موجود تھا۔ مولانا مرحوم نے اس موقعے پر عربی زبان میں، جب کہ مولانا عبدالعلیم صدیقی نے انگریزی میں تقریر کی تھی، لیکن برادرم مرحوم الاستاذ سعید رمضان کی تقریر سب پر بھاری تھی۔ اس کے کئی سال بعد دمشق میں مؤتمر اسلامی کی بین الاقوامی کانفرنس کے موقعے پر ان کے جوہر دیکھنے میں آئے۔ ۱۹۵۶ء کی اس کانفرنس میں جو استاذ سعید رمضان ہی نے منعقد کی تھی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی شریک تھے۔ میں اس وقت دمشق یونی ورسٹی کے کلیۃ الشریعہ کا

ایک طالب علم تھا۔ ڈاکٹر سعید رمضان مرحوم کی شعلہ بیانی اور زورِ خطابت شہید حسن البنا کے اثر ہی سے تھا، وہ اپنے مرشد مرحوم کی کاپی تھے۔

استاذ سعید رمضان سے ۱۹۵۰ء میں مختصر تعارف اور ملاقات کے بعد دوسرے موسم حج کے موقع (۱۹۵۱ء) پر اخوان کا ایک مختصر وفد ڈاکٹر عبدالعزیز کامل کی قیادت میں مکہ مکرمہ آیا تھا۔ موصوف اسکندریہ کی فاروق یونی ورسٹی میں جغرافیہ کے استاد تھے۔ ان کے ہمراہ اسکندریہ یونی ورسٹی کے بعض اخوان طلبہ بھی تھے، ان میں سے ایک محب المحمدی الحسنی سے میری اچھی ملاقات ہوگئی۔ دوسال بعد جب میں مصر گیا تو اس وقت یہ ملاقات بہت کام آئی، کیونکہ اس وقت یہ ساتھی قاہرہ آچکے تھے، جہاں وہ بی اے آنرز کے بین الاقوامی تعلقات میں قاہرہ یونی ورسٹی سے ڈپلومہ کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ایک نئے روزنامے الجمہوریہ میں کام بھی کرتے تھے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر اس زمانے میں جمال عبدالناصر کے ساتھی اور انقلابی قیادت کونسل (Revolutionary Command Council) کے رکن انورالسادات تھے، جو جمال عبدالناصر کے بعد صدر بنے۔

○ **اخوان کی اخوت:** مجھے اخوان کی 'اخوانیت' دیکھنے کا موقع مصر میں ملا۔ اگر میں مصر جا کر ان کی طویل رفاقت اختیار نہ کرتا تو مجھے اخوان کی اس حقیقت کا پتا نہ چلتا جس پر امام حسن البنا نے ۱۹۲۸ء میں تحریک اخوان المسلمون کی بنیاد رکھی۔ وہ بنیاد تھی سچی اسلامی اخوت، للّٰہیت، خطرات کا مقابلہ اور اللہ تعالیٰ پر بے پناہ اعتماد۔ اس کا کریڈٹ تحریک اخوان المسلمون کے بانی اور پہلے مرشد عام حسن البنا شہید کو جاتا ہے۔ یہاں کچھ آپ بیتی بھی ضروری ہے جس میں درحقیقت جگ بیتی پنہاں ہے۔

میں نے قاہرہ پہنچنے کے بعد قصر عابدین (اندرون شہر شاہ فاروق کی سابقہ قیام گاہ) کے قریب شارع عبدالعزیز پر ایک گیسٹ ہاؤس (pension) میں ایک کمرہ کرایے پر لے لیا تھا۔ یہاں مجھے رہتے ہوئے تین چار ماہ کے قریب ہوئے تھے کہ میرا اخوانی دوست، محب المحمدی جس سے دوسال قبل مکہ میں تعارف و ملاقات رہی تھی اور اس سے کچھ مراسلت بھی رہی، اس گیسٹ ہاؤس سے اصرار کر کے وسط شہر سے دور بلکہ قاہرہ کے الدقی نامی محلے میں مجھے اپنے فلیٹ پر لے گیا، جو اس گیسٹ ہاؤس کے مقابلے میں بہت سستا تھا۔ اس میں پانچ نوجوان اور رہتے تھے

جن میں دو اسکول ماسٹر تھے، دو طالب علم اور ایک کسی کمپنی میں کلرک تھا۔ محب المحمدی اپنا کمرہ چھوڑ کر اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں رہنے جا رہے تھے اور انھوں نے مجھے اپنا کمرہ دے دیا تھا۔ یہ فلیٹ شارع جوہر پر تھا۔ ان پانچ میں سے صرف ایک مدرس غیر اخوانی تھا، لیکن وہ بھی حامیوں میں سے تھا۔

اب میں اس اخوانی خاندان کا ایک فرد تھا۔ خاندان کا لفظ یہاں بے محل استعمال نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اخوان المسلمون کے مرشد عام (صدر یا امیر جماعت) نے اپنی تحریک کا جو تنظیمی ڈھانچا بنایا تھا، اس میں پہلے تنظیمی یونٹ یا اکائی کا نام 'اسرہ' (خاندان) ہی رکھا تھا۔ اس 'اسرہ' کے ان پانچ ممبران (بشمول محب المحمدی) کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ممبر (عضو) تھے۔ اس سے بڑی تنظیمی اکائی 'شعبہ' تھی۔[1] 'اسرہ' اور 'شعبہ' کے اجلاس مقررہ اوقات پر ہوتے رہتے تھے۔ ہمارے محلے کے شعبے کا سربراہ ایک ترکی الاصل مصری نوجوان تھا اور شعبے کی میٹنگ ایک قریبی مسجد میں ہوتی تھی۔

ان سب اخوانی اور ایک غیر اخوانی بھائیوں کا مجھ سے ایسا برادرانہ اور مخلصانہ تعلق تھا کہ میں اپنی مسافرانہ حیثیت کو بھول گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ واقعتاً ہم ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ حجاز میں رہنے کے سبب میری عربی اچھی ہوگئی تھی اور گفت وشنید میں کوئی دشواری نہ تھی، جلد ہی میں نے مقامی مصری بولی (colloqial) بھی سیکھ لی۔ اسلامی اخوت جو اخوان کا امتیازی نشان تھا کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عید کے موقعے پر یہ اخوانی جو مصر کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے تھے، اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے، ابواحمد جو سب میں سینئر تھے انھوں نے اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ ان کے گاؤں جاؤں۔ میرے تکلف پر انھوں نے کہا کہ اگر تم ہمارے ساتھ نہ گئے تو ہم بھی عید کرنے اپنے گھروں کو نہ جائیں گے۔ مجبوراً میں ان کے ساتھ قاہرہ سے کافی دور ان کے گاؤں دکرنس تحصیل بیت عمر گیا، جو قاہرہ کے شمال مغرب میں واقع مشہور شہر منصورہ کے قریب تھا۔ یہاں ان لوگوں نے میری اس اہتمام سے خاطر مدارت کی جو شاید بہت سے قریبی رشتے دار بھی

۱- اس تنظیمی ڈھانچے کے لیے ملاحظہ ہو، میری عربی سے ترجمہ کردہ کتاب تحریک اخوان المسلمین، کراچی، ۱۹۹۹ء۔ یہ اخوان کی تحریک پر ایک علمی، شماریاتی کتاب ہے جو دراصل قاہرہ یونی ورسٹی کا عربی میں ایک مقالہ تھا۔

نہ کرسکیں۔ یہ ایک پُرخلوص اور غیر معمولی اسلامی اخوت کا سحر انگیز مشاہدہ تھا۔

تقریباً ڈیڑھ سال تک میرا قاہرہ میں ان کے ساتھ قیام رہا اور اس دوران میں کتنے ہی اخوانی دوستوں سے ملا۔ سب کا طریقۂ تعارف نام بتاتے وقت یہ تھا 'اخوکم فی اللہ' مصطفیٰ یا محمد وغیرہ یعنی اللہ کی خاطر تمھارا بھائی فلاں۔ یہ اسلامی اخوت کا وہ پہلا سبق تھا جو بہت پہلے حسن البنا شہید نے اپنی تحریک کے پیروؤں کو سکھایا تھا۔ جس پر وہ آج تک کاربند ہیں اور جس نے ان کو ایک ایسے مضبوط رشتے میں جوڑ دیا تھا، جس کی مثال کسی اور تحریک میں نہیں ملتی۔ اس کا بھرپور مظاہرہ اس شدید دور ابتلا میں ہوا جو جمال عبدالناصر کے عہد ۱۹۵۴ء سے شروع ہوا اور اس کی موت (۱۹۷۱ء) تک جاری رہا۔ اس دور میں ۲۰، ۲۵ ہزار کے قریب اخوان جیلوں میں تھے۔ ان کے بیوی بچوں کے مصارف وہ ہزاروں اخوانی برداشت کرتے رہے جو کہ کسی نہ کسی طریقے سے جان بچا کر خلیج، کویت ،قطر، سعودیہ، بحرین وغیرہ پہنچ گئے تھے۔ یہ لوگ خفیہ طریقے سے رقم مصر بھیجتے تھے، جو ان بے سہارا خاندانوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔

○ **مصر کا انقلاب:** مصری انقلاب کے صرف ایک سال بعد میں وہاں پہنچا تھا۔ اس انقلاب میں اخوان کا ایک مرکزی کردار تھا۔ آزاد افسران فوج (الضباط الاحرار) کی جو خفیہ تنظیم شاہ فاروق کے زمانے میں قائم تھی، اس کی بعض خفیہ اجلاس اخوانی راہ نماؤں کے گھروں یا خفیہ مقامات پر ہوتی تھیں۔ انقلابی قیادت کونسل (مجلس الثورۃ) جو انقلاب کے بعد قائم ہوئی، اس کے بعض ارکان کمال الدین حسینی اور انورالسادات وغیرہ کے اخوان سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ انقلاب کے بعد اخوانی فکر کے جن اعلیٰ فوجی افسران کے نام منظر عام پر آئے، ان میں سے مشہور اشخاص رشاد مہنا، کرنل ابوالمکارم عبدالحیٔ اور کرنل عبدالمنعم عبدالرؤف کے نام اب تک مجھے یاد ہیں۔ ان سب کا اس انقلاب میں بڑا فعال کردار تھا۔ رشاد مہنا تو اس کونسل کے صدر تھے جو شاہ فاروق کی رونگی کے بعد اس کے ولی عہد خاندان اور محلات وغیرہ کی نگرانی کے لیے بنائی گئی تھی اور کرنل عبدالمنعم عبدالرؤف نے شاہ فاروق سے تخت سلطنت سے دست بردار ہونے کی دستاویز پر دستخط کرائے تھے اور اس کو جلاوطن کیا تھا۔

جنرل محمد نجیب کا جو ابتدا میں انقلابی کمانڈ کونسل کے صدر بنائے گئے تھے، اخوان سے

براہِ راست تعلق نہ تھا، لیکن وہ اپنی اسلامی سیرت کے سبب اخوان سے قریب تھے، چونکہ وہ ایک سینیر جنرل تھے اور بادشاہت کے خلاف، اس لیے انقلابی فوجی افسران نے ان کو صدر بنانا پسند کیا۔ لیکن وہ فوجی انقلابی جو عیاشی کی طرف مائل تھے یا وہ جو بائیں بازو کی سیاست کے حامی تھے، انھوں نے کرنل جمال عبدالناصر کو صدر بنانے اور جنرل محمد نجیب کو صدارت سے ہٹانے کی حمایت کی۔ مصری انقلاب کی تاریخ کا ایک دل چسپ پہلو جس کا میں عینی شاہد ہوں یہ ہے کہ جیسے ہی جنرل نجیب کو صدارت سے معزول کرنے کی خبر پھیلی، عوام نے غم و غصے کے اظہار میں مظاہرے شروع کردیے۔ دو یا تین دن کے بعد انقلابی کمانڈ کونسل نے جنرل نجیب کی صدارت کے عہدے پر واپسی کا اعلان کردیا۔ یہ شاید ستمبر یا اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں اس وقت قصرعابدین کی شارع عبدالعزیز کے فلیٹ میں ہی مقیم تھا۔ گیارہ بارہ بجے کے قریب بلڈنگ سے باہر آیا تو دیکھا کہ سڑک پر لوگ خوشی سے ناچ رہے ہیں اور راہ گیروں کو شربت پلا رہے ہیں۔ مجھے بھی ایک دکان دار نے شربت پیش کیا، آگے بڑھا تو دیکھا کہ قصرعابدین کے سامنے وسیع میدان میں بڑا ہجوم ہے۔ معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے لوگ یہاں جنرل نجیب کو کاندھوں پر اٹھائے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کررہے تھے۔

ابتدا میں انقلابی افسران اور جنرل نجیب نے اعلان کیا تھا کہ ملک میں آزاد انتخابات کرائے جائیں گے۔ بہت سی سیاسی پارٹیوں کو الیکشن کی تیاری کا حکم بھی دے دیا گیا تھا۔ ملک میں ایک عجیب سرخوشی اور گہما گہمی کا راج تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اعلیٰ انقلابی افسران حسن البنا شہید کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے تھے اور انھوں نے اعلان کیا تھا کہ اخوان پر جو ظلم ہوا ہے اس کی پوری پوری تلافی کی جائے گی۔ لیکن بعد میں یہ وعدے پورے نہیں کیے گئے بلکہ بعض وہ اعلیٰ اخوانی فوجی افسران جن کا انقلاب میں اہم کردار تھا، ان کو ملک چھوڑ کر خفیہ طور پر بھاگنا پڑا، تاکہ جمال عبدالناصر کی دار و گیر سے بچ سکیں۔ ان میں نمایاں نام کرنل عبدالمنعم عبدالرؤف کا تھا، جنھوں نے شاہ فاروق کو تخت چھوڑنے اور ملک بدر ہونے پر مجبور کیا تھا۔

انقلاب سے ڈیڑھ دو سال قبل وفدی حکومت کے عہد میں اخوان پر سے پابندی اُٹھا لی گئی۔ اخوان پر پہلی پابندی ۱۹۴۹ء میں لگی اور حسن البنا شہید کے ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو سرکاری

کارندوں کے ہاتھوں شہادت کے ایک سال بعد، ان کی جماعت کو پھر فکر و عمل کی آزادی مل گئی تھی۔ انقلاب کے بعد اس میں مزید سرگرمی آ گئی۔ میں اپنے اخوانی دوستوں کے ساتھ محلہ الحلمیۃ الجدیدۃ کے، مرکز اخوان میں ان کے ہفتہ وار منگل کے اجتماع میں جاتا تھا، جو بعد مغرب ہوتا تھا اور جس میں اخوان کا کوئی مقرر یا بیرونی مہمان اسلامی موضوعات پر تقریر کرتا تھا۔

جنوری ۱۹۵۴ء کی ایسی ہی ایک شام میں نے وہاں ایران کی تحریک فدائیان اسلام کے ایک نوجوان راہ نما نواب صفوی کی تقریر سنی (ایک سال بعد شہنشاہ ایران نے ان کو پھانسی دے دی تھی)۔ فصیح و بلیغ عربی میں یہ تقریر کیا تھی، ایک شعلہ افشانی تھی۔ دوران تقریر اخوان کا خاص مفصل نعرہ، اللّٰہ غاتیننا ، والرسول زعیمنا (مجھے زعیمنا ہی یاد ہے اور یوسف القرضاوی نے اپنی تازہ کتاب الاخوان المسلمون میں یوں ہی لکھا ہے، بعض کتابوں میں 'قدوتنا' ہے)، والقرآن دستورنا ، والجھاد سبیلنا و الموت فی سبیل اللہ اسمیٰ امانینا، کئی ہزار افراد کی آواز میں بلند ہو رہا تھا (اللہ ہمارا مقصود و مطلوب ہے، رسولؐ ہمارے لیڈر ہیں، قرآن ہمارا دستور ہے، جہاد ہمارا طریقہ کار ہے اور اللہ کے راستے میں شہادت ہماری عزیز ترین آرزو ہے)۔ جوش و جذبے کا یہ عالم تھا کہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ تین چار ہزار افراد اگر چاہیں تو ابھی مرکز اخوان سے نکل کر پورے شہر پر قبضہ کر سکتے ہیں۔

انقلابی فوجی افسران جو اپنی بیرکوں وغیرہ میں خفیہ اجتماعات و ملاقاتیں کرتے تھے، ان کو یہ عوامی مقبولیت کہاں حاصل تھی، جو اخوان کو تھی۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ انقلاب کے فوراً بعد تمام سیاسی پارٹیاں (احزاب) غیر قانونی قرار دے دی گئی تھیں، سوائے اخوان المسلمون کے، کیونکہ اس کا سرکاری نام حزب (پارٹی) اخوان المسلمون نہیں تھا، بلکہ جماعت اخوان المسلمون تھا، اور مصر میں 'حزب' کا لفظ سیاسی پارٹی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح اخوان ہی تنہا میدان میں تھے اور ان کے ذریعے انقلاب کو عوامی مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔

جمال عبدالناصر اخوان کے جذبۂ جہاد کا مشاہدہ کر چکا تھا، ان کی ممتاز عسکری کارکردگی کو ۱۹۴۸ء کی پہلی جنگ فلسطین میں دیکھ چکا تھا' اور انقلاب سے قبل مختلف خفیہ اجتماعات میں ان کے ساتھ شریک ہو چکا تھا۔ وہ ان کی عوامی مقبولیت اور انتظامی قابلیت سے واقف تھا۔ اب انقلاب

کے بعد وہ خود زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا اور اپنے قومی اشترا کی ایجنڈے پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ اخوان اپنے اسلامی فکر و عمل سے اس کے راستے میں حائل تھے۔ اس لیے اس نے اخوان کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے ۱۹۵۴ء کی ابتدا سے مختلف طریقے اختیار کیے۔ پہلے جنوری ۱۹۵۴ء میں قاہرہ یونی ورسٹی میں اخوانی طلبہ اور سرکاری تنظیم ہیئۃ التحریر کے نوجوانوں کے درمیان جھڑپ کو بہانہ بنا کر اخوان پر پابندی لگادی اور بہت سے اخوانیوں کو قید و بند میں مبتلا کیا۔ پھر مارچ ۱۹۵۴ء میں یہ پابندی اٹھی تو اخوان از سرِ نو سرگرمِ عمل ہوگئے۔

○ **نہر سویز پر انگریزوں سے معاہدہ:** اخوان برسوں سے انگریزوں کے نہر سویز پر قبضے کے خلاف سرگرم تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ نہر سویز کے علاقے اور خاص طور پر شہر اسماعیلیہ میں جہاں بڑا برطانوی فوجی اڈا تھا، انگریزوں پر گوریلا حملے کرتے رہے تھے۔ یہ حملے جاری تھے کہ جولائی ۱۹۵۲ء کا فوجی انقلاب رونما ہوگیا۔ اخوان نے فوجی حکومت پر انگریز فوج کو مصر سے نکالنے کے لیے اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ مصر میں آزاد فوجی افسران کی خفیہ تنظیم بھی انگریزی فوجی وجود کے خلاف تھی، اور انقلاب سے پہلے دونوں میں اس بارے میں باہمی تعاون تھا، لیکن دونوں کے مقاصد میں فرق تھا۔ اخوان انگریزوں کے سامراجی وجود سے مصر کو بالکل پاک کرنا چاہتے تھے کہ نہر سویز پر ان کا کسی قسم کا دعویٰ نہ رہے، جب کہ نئی انقلابی قیادت ان سے سمجھوتا چاہتی تھی، اور ان کو یہ مراعات دینے کے لیے تیار تھی کہ انگریز جب چاہیں کسی جائز وجہ کی بنا پر دوبارہ نہر سویز اور اس کے علاقے پر قبضہ کرسکتے ہیں۔

جولائی ۱۹۵۴ء میں ابتدائی طور پر ایسے ایک معاہدے پر انقلابی حکومت اور انگریزوں کے مابین دستخط ہوگئے۔ اس کمزور اور انجام کار ضرر رساں معاہدے کی تکمیل کرانے میں امریکا اور بھارت کی نہرو حکومت کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس سلسلے میں، میں اپنا ایک ذاتی مشاہدہ پیش کرتا ہوں۔

میں اس زمانے میں بھارتی شہریت کا حامل تھا۔ جدہ سے ایک مشہور کانگریسی سیاسی شخصیت عبداللہ مصری قاہرہ آئی ہوئی تھی۔ ان سے مکہ مکرمہ میں میری ملاقات رہی تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ قاہرہ میں بھارتی سفیر علی یاور جنگ عربی زبان پڑھنا چاہتے ہیں، آپ یہ کام انجام دیں۔ میں تیار ہوگیا۔ ہفتے میں دو تین اسباق ہوئے تھے کہ سفیر صاحب کو اقوام متحدہ جانا پڑ گیا۔

اس دوران بھارتی سفارت خانے میں میری ملاقات ملٹری اتاشی کرنل مدن سے ہوگئی۔ انھوں نے کہا کہ سفیر صاحب کی جگہ میں ان کو عربی پڑھا دیا کروں۔ یہ اپریل یا مئی ۱۹۵۴ء کا واقعہ ہے۔ ابھی مجھے انھیں پڑھاتے ہوئے صرف ایک ماہ ہوا تھا کہ انھوں نے مجھ سے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ میں آج کل مصری فوجی حکومت اور انگریزوں کے مابین سویز کینال سے متعلق سمجھوتے کے لیے ثالثی کے طور پر گفت و شنید میں سخت مصروف ہوں، اس لیے عربی زبان کی تعلیم کا یہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکتا۔ مصر کے اس اہم مسئلے میں بھارت کی ثالثی کا یہی کردار تھا جو مصر اور خاص طور پر جمال عبدالناصر کے بھارت سے پایدار تعلق کی بنیاد بنا۔ ورنہ اس سے قبل جب اسی سال کی ابتدا میں جنرل محمد نجیب اور جمال عبدالناصر کے مابین سخت اختلافات رونما ہوئے تھے تو انھیں حل کرانے میں پاکستان کے سفیر طیب حسین کا بڑا ہاتھ تھا۔ تب پاکستان سے نئی مصری فوجی حکومت کی بڑی دوستی تھی، جو بعد میں مختلف وجوہ کی بنا پر دشمنی میں تبدیل ہوگئی۔

○ **اخوان کا ردعمل:** اخوان نے انگریزوں کے ساتھ اس کمزور معاہدے پر جس کی تکمیل میں امریکا اور بھارت نے بڑا کردار ادا کیا تھا، اپنے سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے اخبارات و رسائل میں بھی اس معاہدے پر تنقید کی اور اپنی تقاریر میں بھی۔ اس ضمن میں ایک اہم واقعے کا میں عینی شاہد ہوں۔ ہم لوگ کبھی کبھی جمعہ کی نماز کے لیے قاہرہ کے ایک مشہور محلے فیصل الروضہ کی اخوانی مسجد جایا کرتے تھے۔ اس معاہدے کے فوراً بعد اواخر جولائی یا اگست میں اخوانی رفیق حسین الاسکندرانی کے ساتھ میں جمعہ کی نماز کے لیے اخوان کی مسجد الشریف میں گیا۔ اخوانی نوجوان مصطفیٰ مشہور (جو بعد میں پانچویں مرشد عام بنے) نے جمعے کا خطبہ دیا، جس میں انھوں نے بڑے سخت الفاظ میں اس کمزور اور دب کر کیے گئے معاہدے پر تنقید کی۔ وہ جب جمعہ کی نماز پڑھا چکے اور کچھ لوگ مسجد سے باہر نکلنے لگے تو وہاں مسجد میں باہر اور اندر پولیس نے گولی چلادی۔ میں اور میرا اخوانی رفیق ابھی مسجد کے اندر ہی تھے، گولی کی آواز سن کر ہم وہاں سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔ کچھ لوگ زخمی ہوئے اور کئی گرفتار کیے گئے۔ امام انجینیر مصطفیٰ مشہور کی جان بچ گئی۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کے اس ڈرامے کے بعد جمال عبدالناصر نے اپنے اوپر اخوان کی طرف سے حملے کا ڈراما رچایا۔ قاہرہ میں مصطفیٰ مشہور اسی سال گرفتار ہوئے اور انھیں ۱۰ سال کی سزا ہوئی۔

۱۹۶۴ء میں رہائی کے بعد ۱۹۶۵ء کے چوتھے دورِ ابتلا میں ان کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور پانچ سال کے بعد ۱۹۷۱ء میں ان کو جیل سے رہائی ملی۔ ۱۹۹۶ء میں وہ اخوان المسلمون کے پانچویں مرشد عام منتخب ہوئے (ان کے اور باقی اخوان کے مرشدین کے بارے میں ملاحظہ ہو میری کتاب تحریک اخوان پر میرا مقدمہ، ص ۲۴-۳۵)۔ ستمبر ۲۰۰۳ء میں ۳۰ سال بعد جب میں مصر گیا تو اس سے چند ہی برس قبل مرشد مصطفیٰ مشہور وفات پاچکے تھے اور مامون الہضیبی چھٹے مرشد عام تھے، جن سے محلہ الروضہ کے چھوٹے سے مرکز اخوان میں ملاقات ہوئی، یہیں میں نے ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ یہ مرکز پرانے مرکز کے مقابلے میں جو وسط شہر کے محلہ الحلیۃ الجریدۃ میں تھا، بہت چھوٹا ہے۔

○ **ناصر کے مظالم:** حسن البنا شہید نے اپنی اس عظیم اور جامع اسلامی تحریک کو اپنے خون سے سینچ کر، پامردی وثبات کا جو درس اخوان کو دیا تھا، اس کا بدرجہ اتم ظہور میں نے ۱۹۵۴ء کے اواخر میں دیکھا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو جب عبدالناصر اسکندریہ میں تقریر کررہا تھا کہ اس پر کسی نے پستول سے آٹھ فائر کیے، لیکن کوئی گولی نہ تو عبدالناصر کو لگی اور نہ اسٹیج پر بیٹھے کسی اور شخص کو۔ اور عبدالناصر نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ اگلی صبح روزنامہ الاہرام اور دیگر اخبارات یہ خبر لائے کہ ایک شخص محمود عبداللطیف نے یہ حملہ کیا تھا جو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ محلہ امبابہ، قاہرہ میں رہنے والا یہ شخص پلمبر ہے۔ اخوان کے راہ نما ایڈووکیٹ ہنداوی دویر نے مبینہ طور پر جمال عبدالناصر کو قتل کرنے کے لیے اسے ریوالور دیا تھا اور دو مصری پاؤنڈ اس کو اپنے گھر والوں پر صرف کرنے کے لیے دیے تھے۔ فوجی عدالت نے اس کو پھانسی کی سزا دے دی۔

یہ سال جمال عبدالناصر کے استبدادی مزاج اور پالیسیوں کے لیے آزمایش کا سال تھا۔ جنرل محمد نجیب جنھوں نے آزاد افسران کی تنظیم کے مطالبے پر انقلاب کی قیادت اور ملک کی صدارت سنبھالی، ان سے جمال عبدالناصر سب کچھ چھیننا چاہتا تھا، لیکن فوج کے ایک حصے نے محمد نجیب کا ساتھ دیا۔ دوسری طرف عوام نے نجیب کے لیے مظاہرے کیے اور عبدالناصر کو مجبوراً ان کا دوسری بار فوج کے کمانڈر ان چیف اور صدر جمہوریہ کی حیثیت سے تقرر کرنا پڑا۔ تیسری طرف اخوان المسلمون تھے جو اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ ملک کو قومیت اور لادینی اشتراکیت کے

راستے پر چلایا جائے۔ جمال عبدالناصر ان کی عوامی قوت اور جذبۂ جہاد و قربانی سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ یہ بھی خوب جانتا تھا کہ فاروق کی باشاہت کے خلاف مزاحم اصل قوت وہی تھے، اور فاروق کے حسن البنا کو قتل کرانے کے بعد عوام کی ہمدردیاں اخوان کے ساتھ کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہیں۔ پھر یہ کہ وہ اس انقلاب میں بھی بڑے حصہ دار ہیں۔ کرنل عبدالمنعم عبدالرؤف اخوان کے ہمدرد رہے ہیں اور انھی نے شاہ فاروق کو اپنی معزولی کے پروانے پر دستخط کے لیے مجبور کر کے اٹلی کے لیے ملک بدر کیا تھا۔

اس صورت حال اور اپنی کم ہوتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر جمال عبدالناصر نے اپنی خفیہ فوجی پولیس کے ذریعے ایک بہت ہی معمولی شخص پلمبر کو یہ ڈراما رچانے کے لیے قربانی کا بکرا بنایا، تاکہ اس طرح وہ اخوان کو بدنام کر کے ان سے چھٹکارا حاصل کرے، جو اس کے سب سے بڑے مدمقابل تھے۔ مگر اس کے لیے اس کے کارندوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بڑا بھونڈا تھا۔ بھلا ایک ملک کے سربراہ (اس وقت جنرل نجیب صرف نام کے صدر تھے، سارے اختیارات جمال عبدالناصر کے ہاتھ میں تھے) اور ایک قائد انقلاب کو قتل کرنے کے لیے اخوان ایک اناڑی پلمبر کو مشن سونپتے، پھر اس کو صرف دو مصری پاؤنڈ اس کام کے لیے دیتے۔ ایک غیر جانب دار مصری مؤرخ و مصنف پروفیسر ڈاکٹر شبلی نے اپنی کتاب تاریخ الحضارة الاسلامیه کی جلد ۹ میں بہت اہم دلائل دیتے ہوئے اخوان پر اس الزام کو سراسر جھوٹ قرار دیا ہے۔ (ص ۴۲۰ تا ۴۲۹)[۲]

اس سلسلے میں ایک ذاتی واقعہ بیان کرتا ہوں کہ اس ڈرامے سے دو تین ماہ پہلے یہ محمود عبداللطیف ہم لوگوں سے ملنے ہمارے فلیٹ پر شام کو آیا تھا۔ درمیانی قد اور جسامت کا یہ شخص جو واقعتاً امبابہ کا رہنے والا اور پلمبر تھا، خاموش طبیعت کا عام اخوانی لگ رہا تھا، اس موقع پر ہمارا اخوانی بھائی محب الحمدی بھی آ گیا تھا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا اور محمود عبداللطیف کا نام اخباروں میں آیا تو ہمیں تعجب ہوا۔ پھر یہ کہ ہمارے فلیٹ کی ان دنوں انٹیلی جنس والوں کی طرف سے نگرانی ہوتی تھی۔

۲- جمال عبدالناصر کے ظالمانہ دور پر ۸۰۰ سے زائد صفحات کی یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی گئی ہے اور اخوان پر جو ظلم وستم اس دور میں کیا گیا ہے اس میں اس کا کافی ذکر ہے۔ یہ کتاب اردو میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر احمد شبلی سے میری ملاقات بنغازی، لیبیا میں ہوئی، جب میں وہاں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۹ء تک پروفیسر تھا۔

اپنے ایک منزلہ فلیٹ کی سڑک پر کھلنے والی کھڑکی سے ہمارے ساتھی اکثر وہاں ایک آدمی کو کھڑا دیکھتے تھے۔ اگر محمود عبداللطیف کا اس قصے میں ہاتھ ہوتا تو اس واقعے کے بعد پولیس ہمارے فلیٹ پر دھاوا بولتی اور ہم سبھی کو پوچھ گچھ کے لیے گرفتار کر لیتی۔

اس خودساختہ جھوٹی کہانی کا مقصد اخوان کی اسلامی تحریک اور ان کی قوت کو تباہ کرنا تھا۔ چھے اخوانی راہ نماؤں کو سخت تعذیب کے بعد پھانسی دے دی گئی، جن میں شیخ محمد فرغلی جیسے ازہری عالم اور جسٹس (ریٹائرڈ) عبدالقادر عودہ جیسے ممتاز قانون دان اور دو جلدوں میں اعلیٰ درجے کی تحقیقی کتاب التشریع الجنائی فی الاسلام (اسلام کا فوج داری قانون) کے مصنف بھی شامل تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر شبلی کے مطابق ان کا جرم درحقیقت صرف یہ تھا کہ وہ مارچ ۱۹۵۴ء میں جمال عبدالناصر کے خلاف اور جنرل محمد نجیب کی تائید میں عوامی مظاہرے کے وقت نجیب کی واپسی پر قصر عابدین (صدارتی قیام گاہ) کی بالکونی پر کھڑے تھے۔

○ **اخوان کا دورِ ابتلا:** اس واقعے کو بہانہ بنا کر ہزاروں اخوان کو گرفتار کیا گیا، پابند قید و سلاسل کیا گیا۔ ان پر وہ وحشیانہ تعذیب کی گئی جس کا انسان تصور بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن امام حسن البنا نے صبر ثبات کا جو درس ان کو دیا تھا، اس پر وہ جمے رہے۔ چھے ممتاز اخوانی راہ نماؤں کی شہادت کے بعد عام اخوانی نوجوانوں کی زبان پر قرآن کریم کی غزوہ خندق کے موقع پر اترنے والی یہ آیت تھی: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (احزاب ۳۳:۲۳) ”یہ اہل ایمان میں ایسے لوگ تھے جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر دکھایا، ان میں سے کچھ کو موت آگئی اور ان میں سے کچھ منتظر ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی“۔

اس دار و گیر کے زمانے میں اخوان کے ہزاروں کارکن کسی نہ کسی طریقے سے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ انھی میں سے دو نوجوان محمد عرفہ اور اسماعیل ہضیبی (اخوان کے دوسرے مرشد عام کا بھتیجا جس کو ۱۵ سال قید کی سزا غیر حاضری میں سنائی گئی تھی) دمشق پہنچ گئے تھے، وہ ثابت قدم تھے۔ میں دورانِ تعلیم ان کے ساتھ ایک سال کے قریب (۱۹۵۷ء) رہا۔ ان کی زبانوں پر بھی قرآن کریم کی یہی آیت تھی جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اسی فلیٹ میں دوپہر کے کھانے پر جیسا کہ

پہلے ذکر ہوا ہماری ملاقات کرنل عبدالمنعم عبدالرؤف سے ہوئی تھی جو کسی نہ کسی طریقے سے جمال عبدالناصر کی جیل سے بھاگ نکلے تھے اور اب ترکی جارہے تھے۔

استاذ سعید رمضان مرحوم اور بعض دیگر اخوانی راہ نما ۱۹۵۴ء کے اس واقعے سے پہلے ہی ایک کانفرنس میں شرکت کے سبب دمشق میں موجود تھے۔ جمال عبدالناصر نے ایسے چھے ممتاز اخوانی راہ نماؤں کی مصری شہریت ختم کردی تھی۔ مصر کے بعد میرا اکثر ان سے ملنا رہتا تھا اور ان کا ماہانہ مجلہ المسلمون قاہرہ کے بعد اب دمشق سے شائع ہونے لگا تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنے اس مجلے میں جمال عبدالناصر پر ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا: 'فرعونِ مصر'۔ اسی لقب سے اس کو اس کے ایک فوجی رفیق انقلاب اور سابق وزیر عبداللطیف بغدادی نے اپنی کتاب میں یاد کیا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ نصف صدی سے قبل اس شدید ابتلا اور پھر ۱۹۶۵ء میں دوسری ابتلا، پھانسیوں (سید قطب شہید کی پھانسی)، قید و بند اور جلاوطنی اور معاشی و خاندانی مصائب کے باوجود اخوان کی تنظیم آج بھی مصر میں فعال ہے۔ جمال عبدالناصر کی قوم پرستانہ اشتراکیت اب قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔ ۲۰ویں صدی کے اس فرعون کا اب کوئی نام بھی لینا پسند نہیں کرتا، جب کہ اخوان نے ان پر سیاسی پابندیوں کے باوجود آزاد حیثیت اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے ٹکٹ پر گذشتہ انتخابات میں ۸۸ سے زائد نشستیں حاصل کی ہیں۔ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد ۱۳:۱۷) ''اور جہاں تک (سلابی) جھاگوں کا تعلق ہے تو وہ رائیگاں ہوتی ہیں اور جو چیز لوگوں کو نفع دینے والی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے''۔

امام حسن البنا نے اخوان المسلمون میں جو ثبات و صلاحیت پیدا کردی تھی، یہ اسی کا فیض تھا کہ تعذیب وقتل اور مسلسل سخت ابتلا کی آندھیاں بھی ان کو ہلا نہ سکیں۔ مرد تو مرد اخوانی خواتین بھی ناصری جلادوں کے ہاتھوں جیل میں سخت تعذیب کا شکار رہیں، لیکن ان کے پائے ثبات میں جنبش تک نہیں آئی۔ ۱۹۶۵ء کے دور ابتلا میں سیدہ زینب الغزالی اور سید قطب شہید کی بہنوں حمیدہ قطب اور امینہ قطب وغیرہ نے جیل خانوں میں بڑی تعذیب برداشت کی، لیکن اپنے مشن پر قائم رہیں۔

اس تعذیب کا ایک شکار ہمارا دوست محب حسنی الحمدی بھی ہوا۔ وہ ۱۹۵۴ء میں قاہرہ یونی ورسٹی

میں بین الاقوامی تعلقات میں ایک کورس پڑھنے کے ساتھ ساتھ رات کو روزنامہ الجمہوریہ میں بھی کام کرتا تھا۔ جمال عبدالناصر کے قتل کے ڈرامے کے بعد جہاں ہزاروں اخوانی گرفتار کیے گئے تھے، وہاں اس کو بھی گرفتار کیا گیا۔ یہ دو ہفتے جیل میں رہنے کے بعد ہم سے ملنے آیا۔ اس کا سر مونڈ دیا گیا تھا اور اس نے ہمیں پیٹھ دکھائی جو کوڑوں کی مار سے اب تک نیلی تھی اور کہیں کہیں سے کھال ادھڑی ہوئی تھی، لیکن اس کا آہنی عزم اب بھی ویسا ہی تھا۔ یہ اخوان کی اس تنظیم میں نہ تھا، جو نہر سویز کے علاقے میں انگریزوں کے خلاف گوریلا حملوں کے لیے ۱۹۵۱ء میں بنائی گئی تھی جس سے مصری وفدی حکومت اور فوجی حکومت واقف تھی۔ محب الحمدی کو اس کے بقول صرف شبہے میں پکڑا گیا تھا، اور محض یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کا اس تنظیم سے کوئی تعلق تو نہیں جیل میں ننگا کر کے اس کی کھال ادھیڑ دی گئی تھی۔ خدا شاہد ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہنستا تھا۔ اس اذیت ناک عمل کی اس پر کوئی دہشت، کوئی خوف طاری نہ تھا۔ وہ اور میرے دوسرے فلیٹ کے اخوانی ساتھی امام حسن البنا شہید کو دیکھ چکے تھے، سن چکے تھے، ان کے ساتھ بیٹھ چکے تھے، ان کی صحبت نے ان نوجوانوں کو جو اَب ۷۰ برس کے بوڑھے ہیں یا دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، کندن کر دیا تھا۔

○ **امام البنا اور تصوف:** امام حسن البنا شہید کو جوانوں سے بہت محبت تھی۔ انھوں نے اپنی تحریک اخوان المسلمون کی بنیاد ۱۹۲۸ء میں اس وقت رکھی جب وہ اسماعیلیہ کے شہر میں ایک اسکول ماسٹر تھے، یعنی وہ اس وقت صرف ۲۲ سال کے ایک نوجوان تھے۔ وہ ایک وہبی لیڈر (قائد موہوب) تھے۔ بچپن ہی سے ان کو اجتماعی خیر کے کاموں کا شوق تھا۔ انھوں نے اپنے قصبے محمودیہ میں الجمعیة الحصافیه الخیریة اپنے اسکول کے زمانے میں بنائی تھی، جس کے وہ سیکرٹری تھے اور یہ جمعیت انھوں نے اپنے شیخ طریقت شیخ عبدالوہاب الحصافی کے نام پر بنائی تھی، جن سے وہ طریقۂ حصافیہ میں بیعت ہوگئے تھے کہ جب وہ دمنہور کے اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس تعلق و تربیت سے ان کے اندر وہ روحانیت پیدا ہوگئی تھی اور ان کی تقریر و تحریر میں وہ حلاوت و تاثیر تھی جو بہت سے دین کے مبلغین اور داعیوں میں نہیں پائی جاتی۔

امام حسن البنا نے اپنی کتاب مذکرات الدعوة و الداعیة (حسن البنا شہید کی ڈائری) میں تصوف کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ شیخ حسن البنا تصوف کے خانقاہی نظام سے

متفق نہیں تھے، تاہم وہ اس کو عبادات کا ذوق وشوق اور اس میں حلاوت پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ واقعی وہ اپنے جوانی کے ابتدائی زمانے سے اس کے سبب تہجد و دیگر نوافل اور نفلی روزوں اور اذکار واوراد کے پابند تھے۔ اسی ذوق عبادت کے تحت انھوں نے بعد میں اخوان کے لیے مسنون ادعیہ و اوراد پر ایک چھوٹی سی کتاب المانورات لکھی، جو عام طور پر اخوان پڑھتے ہیں۔ شیخ حسن البنا متحرک یا تحریکی (dynamic) تصوف کے قائل تھے۔ اسی لیے جب انھوں نے تحریک اخوان المسلمون کی بنیاد ڈالی جو حرکت وعمل پر مبنی تھی تو ان کے شیخ طریقت نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ تب انھوں نے اپنے شیخ کے اختلاف پر کوئی توجہ نہیں دی اور اپنی تحریک پر عمل پیرا رہے۔

○ **حسن البنا کی دینی تڑپ:** الجمعية الخيرية کے علاوہ جو دینی عقائد کی تصحیح، اسلامی احکام پر عمل، فلاحی کام اور عیسائی مشنریوں کے توڑ کے لیے بنائی گئی تھی، حسن البنا اپنی جوانی ہی میں قاہرہ میں دوسری دینی جماعتوں، جمعية نهضة الاسلام' جمعية مكارم الاخلاق الاسلاميه کے بھی رکن رہے، لیکن انھیں اللہ تعالیٰ نے کسی اور بڑی اور ہمہ گیر اسلامی تحریک کے لیے بنایا تھا۔ اس لیے مصر میں کسی بھی موجود دینی وسماجی جمعیت سے ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ ان کی دینی حمیت اور تڑپ کا یہ عالم تھا کہ جب وہ قاہرہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے آئے تھے اور ۱۷ سال کی عمر میں کالج میں زیر تعلیم تھے تو اس وقت قاہرہ میں لادینیت اور بے حیا مغربی تہذیب کے اثرات زوروں پر تھے۔ اس کے سبب حسن البنا کے بقول: میں ملک کے اس حال پر اتنا فکرمند تھا کہ رمضان میں دو ہفتہ تک نیند نہیں آئی۔ میں نے طے کیا کہ علما اور کسی ایسے عالم و شیخ طریقت سے مل کر جن کا معاشرے میں اثر ہو ان پر زور دوں گا کہ وہ اس بڑھتی ہوئی لادینیت اور اباحیت کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھائیں۔

اس غرض کے لیے حسن البنا جمعية نهضة الاسلام کے صدر شیخ یوسف الدجوی کے پاس گئے، ان کی محفل میں کچھ علما اور ممتاز لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ نوجوان طالب علم حسن البنا نے ملک میں بڑھتی ہوئی لادینیت اور بے حیائی کا شکوہ کیا۔ شیخ یوسف نے عام بزرگوں کی طرح کہا جو کچھ ہوسکتا ہے کرو کہ لا يكلف الله---" مگر خود حسن البنا کہتے ہیں: میں نے کہا نہیں، یا سیدی! یہ کمزوری اور اپنی ذمہ داری سے فرار کی بات ہے۔ آپ کو کس کا ڈر ہے، حکومت کا، ازہر کا؟ آپ کو

گزارہ الاؤنس ملتا ہے، اپنے گھر بیٹھے ہیں، کوئی کام نہیں، اسلام کے لیے کام کیجیے۔ ہماری قوم مسلمان قوم ہے، وہ آپ کے ساتھ ہے۔ میں نے ان لوگوں کو قہوہ خانوں میں، سڑکوں پر اور مسجدوں میں دیکھا ہے، وہ آپ کے ساتھ ہیں، لیکن چونکہ کوئی ان کی راہ نمائی نہیں کر رہا ہے، اس لیے اپنے پرجوش ایمان کے باوجود وہ ایک ضائع شدہ طاقت ہیں، اور اسی سبب سے لادین اور بدکردار عناصر کے اخبارات و رسائل، جو آپ لوگوں کی لاتعلقی کے سبب سرگرم ہیں، ان کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اگر آپ لوگ ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں تو یہ عناصر اپنے بلوں میں گھس جائیں گے۔ یا استاذ! اگر آپ اللہ کے لیے قدم اٹھانا نہیں چاہتے ہیں تو اپنی دنیا اور اپنی روٹی کے لیے ہی اٹھیے، کیونکہ اگر اسلام مٹ گیا تو ازہر بھی مٹ جائے گا، علما بھی مٹ جائیں گے۔ پھر نہ آپ کو کچھ کھانے کے لیے ملے گا اور نہ خرچ کرنے کے لیے پیسہ ملے گا۔ اگر اسلام کے دفاع کے لیے نہیں اٹھتے تو اپنی ذات کے لیے اٹھیے، اپنی دنیا کے لیے ہی سرگرم عمل ہو جایئے۔ اگر آخرت کے لیے عمل نہ کیا، تو اے شیخ محترم! یہ دنیا اور آخرت دونوں ہی رائیگاں جائیں گے۔

حسن البنا شدت جذبات میں اسی سوز دروں سے بولتے رہے، لیکن حاضرین میں کچھ لوگوں کو نوجوان طالب علم کا یہ لہجہ پسند نہیں آیا۔ ایک مرید نے سختی سے انھیں جھڑکا کہ ''تم نے شیخ کے ساتھ گستاخی کی ہے اور علمائے ازہر کی بھی توہین کی، اسلام کمزور نہیں پڑے گا۔ اللہ نے خود اس کی نصرت کا وعدہ کیا ہے۔ تم کون ہوتے ہو یہ ڈراوے دینے والے''۔ لیکن حاضرین میں سے ایک معزز شخص احمد بے کامل نے ان صاحب کو روکا: ''نہیں، یہ نوجوان حق بات کہہ رہا ہے۔ تمھارا فرض ہے کہ اٹھو، کب تک یہ بے عملی رہے گی؟ وہ تو تم سے صرف یہ چاہتا ہے کہ تم اسلام کی نصرت کے لیے جمع ہو جاؤ۔ اگر تمھیں جگہ درکار ہے تو میرا گھر موجود ہے، پیسہ چاہیے تو خیرخواہ مسلمانوں کی کمی نہیں، تم ہمارے راہ نما ہو، ہم تمھارے پیچھے ہیں، لیکن یہ حیل وحجت کسی کام کی نہیں۔[۳]

اس کے بعد شیخ یوسف الدجوی ایک دوسرے بزرگ شیخ محمد سعید کے یہاں جانے کے لیے اٹھ گئے۔ حسن البنا بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور ان کے گھر جو کچھ پیش آیا وہ حسن البنا شہید کی

۳- احمد حسن الشوریجی: الامام الشہید البنا، مجدد القرن الرابع عشر الہجری، دار الدعوۃ، اسکندریہ، ص ۷۶-۷۷

اللہ کے یہاں مقبولیت کی پہلی نمایاں جھلک تھی۔

الامام البنا خود اس رقت آمیز اور اثر انگیز واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں: ''ہم سب شیخ دجوی کے مکان سے قریب ہی شیخ محمد سعید کے یہاں منتقل ہوگئے، اور میں نے کوشش کی کہ شیخ دجوی کے قریب ہی بیٹھوں، تاکہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ بخوبی کہہ سکوں۔ اس موقعے پر رمضان کی جو مٹھائیاں ہوتی ہیں حاضر کی گئیں۔ وہ لینے کے لیے شیخ بڑھے تو میں ان کے قریب آ گیا۔ شیخ نے کہا تم یہاں بھی ہمارے ساتھ آ گئے۔ میں نے کہا: جی ہاں، جب تک ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جائیں گے، آپ کو چھوڑوں گا نہیں۔ شیخ دجوی نے مجھے کھانے کے لیے مٹھائی دی اور کہا کہ یہ کھاؤ، ان شاء اللہ ہم سوچیں گے۔ اس پر میں نے کہا یا سیدی! مسئلہ اب سوچتے رہنے کا نہیں ہے، ضرورت عمل کی ہے۔ اگر مجھے مٹھائی وغیرہ کھانا ہوتی تو میں ایک قرش (روپیہ) میں خرید کر اپنے گھر میں بیٹھ کر آرام سے کھاتا اور یہاں آنے کی مشقت گوارا نہیں کرتا۔ یا سیدی! اسلام کے خلاف اتنی سخت جنگ جاری ہے اور اسلام کے پیروکار، اس کے حمایتی اور مسلمانوں کے پیشوا اس عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ جو کچھ کھا رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس کا آپ سے حساب نہیں لے گا؟ اگر آپ لوگوں کو اپنے سوا اسلام کے کوئی اور پیشوا اور دفاع کرنے والے معلوم ہوں تو براہ کرم مجھ کو انھی کا پتا دے دیجیے، میں ان کے پاس چلا جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے ان کے پاس وہ مل جائے جو آپ کے پاس نہیں (یعنی اسلام کا درد)''۔

''ایک گھڑی کے لیے عجیب خاموشی طاری ہوگئی اور پھر شیخ کی آنکھوں سے شدت سے آنسو بہنے لگے، جس سے ان کی داڑھی تر ہوگئی اور حاضرین پر بھی گریہ طاری ہوگیا۔ شیخ نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا اور گہرے غم اور شدید احساس میں کہا: میں کیا کرسکتا ہوں حسن؟ میں نے کہا یا سیدی! معاملہ آسان ہے، لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (البقرہ ۲:۲۸۶) میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اہل علم اور اصحاب جاہ و منزلت میں سے جن میں آپ کو دینی حمیت نظر آتی ہے، آپ براہ کرم صرف ان کے نام شمار کرا دیں تاکہ وہ کچھ کرنے کے بارے میں سوچیں۔ الحادی جرائد کے مقابلے میں کچھ نہیں تو ایک ہفتہ وار مجلہ ہی نکالیں، اور ان کی کتابوں کے رد میں کتابیں اور پمفلٹ لکھیں۔ نوجوانوں کے لیے تنظیمیں بنائیں، وعظ و نصیحت میں سرگرم ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ کہنے لگے

خوب۔(ایضاً، ص-۷۷)

مٹھائی کی پرات اٹھا کر لے جانے کا حکم دیا اور کاغذ و قلم منگوایا اور مجھ سے کہا لکھو۔ ہم نام یاد کرنے لگے۔ ہم نے کچھ علما اور بڑے لوگوں کے نام لکھے جن میں سے مجھے یہ یاد ہیں، خود یوسف الدجوی، شیخ محمد الخضر حسین (۱۹۵۲ء کے مصری فوجی انقلاب کے بعد ابتدا میں ازہر کے شیخ متعین کیے گئے تھے۔ باقی بھی سب مشہور علما تھے)، شیخ عبدالعزیز جاویش، شیخ عبدالوہاب النجار، شیخ محمد الخضری، شیخ محمد احمد ابراہیم اور شیخ عبدالعزیز الخولی۔ شیخ السید محمد رشید رضا کا نام آیا تو کہا: یہ بھی لکھو، یہ بھی لکھو، یہ کوئی فروعی مسئلہ نہیں ہے کہ جس میں ہم اختلاف کریں، بلکہ یہ اسلام و کفر کا معاملہ ہے اور شیخ رشید رضا اپنے قلم، علم اور اپنے مجلّے سے اسلام کا بہترین دفاع کرتے ہیں۔" (السید رشید رضا دراصل سلفی مسلک کے آدمی تھے اور تصوف و تقلید کے خلاف، جب کہ شیخ یوسف الدجوی ایک صاحب طریقت عالم تھے، پھر بھی شیخ نے ان کا نام لکھوایا، ان کے مجلّے سے مراد مشہور مجلّہ المنار ہے"۔(ایضاً، ص ۷۷)

اس فہرست میں ان علما کے علاوہ ملک کے سربرآوردہ اشخاص کے نام بھی تھے۔ اس کے بعد شیخ ان لوگوں سے ملے جن کو وہ جانتے تھے اور حسن البنا ان سے ملے جن کو وہ جانتے تھے۔ پھر ان سب مشاہیر علما اور سربرآوردہ شخصیات کے باہم اجتماعات ہوتے رہے۔ یہ بہت سے اہل علم کے لیے ایک انکشاف ہوگا، جس طرح میرے لیے ہوا کہ حسن البنا کی ان کوششوں اور ان حضرات کے تعاون کے نتیجے میں ۲۰ویں صدی کے نصف اول میں مصر کا المنار کے بعد مشہور ترین مجلّہ الفتح شائع ہوا، جو برسوں محب الدین الخطیب کی ادارت میں جاری رہا۔ یہی وہ مجلّہ تھا جس کو ہندستان کے علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پڑھ کر اپنی عربی کو جلا دیتے اور اس میں اپنے مضامین شائع کرتے تھے۔ محب الدین الخطیب سے راقم الحروف کو ملنے کی سعادت ۱۹۵۴ء میں حاصل ہوئی۔ اس وقت وہ مجلة الازھر کے ایڈیٹر تھے۔

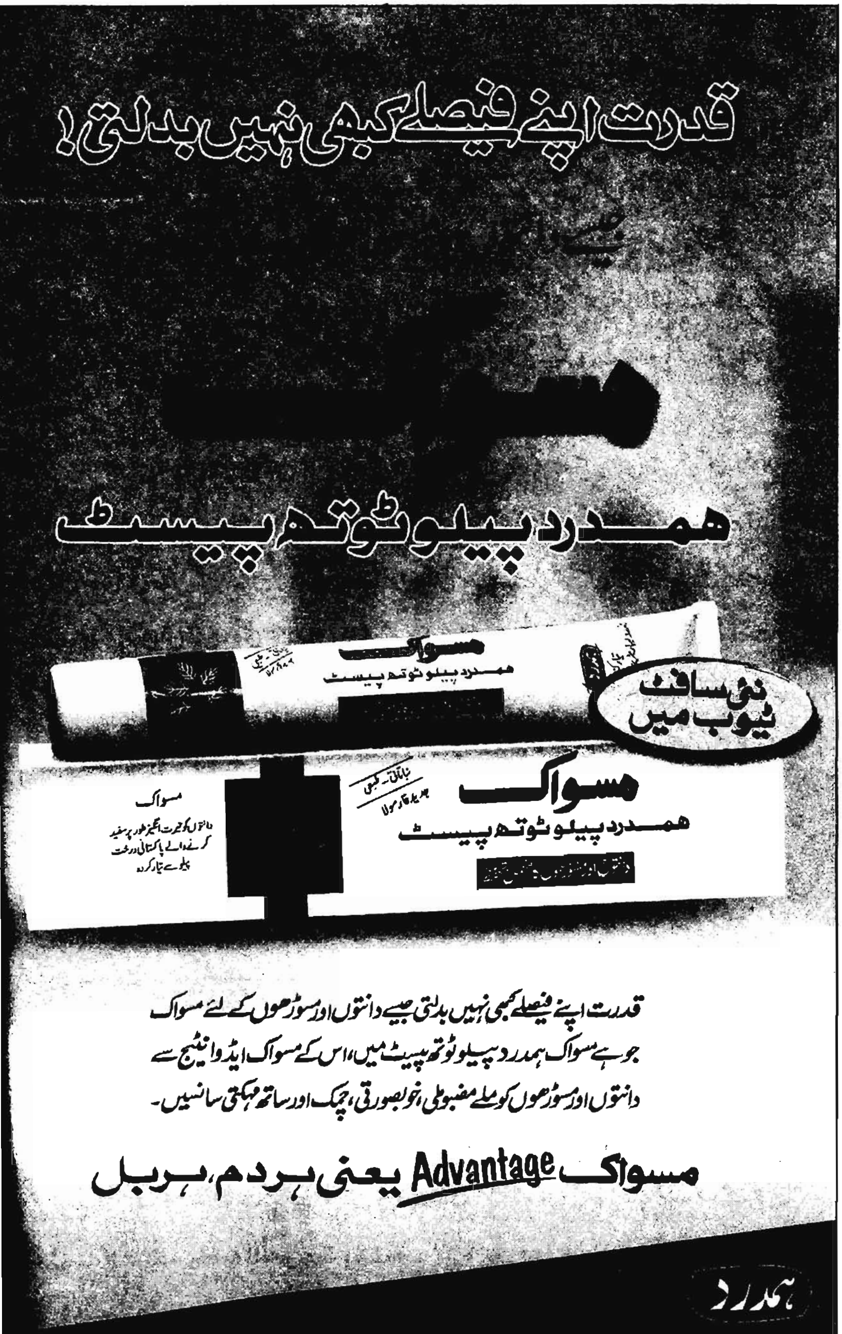
امام حسن البنا نے دارالعلوم کالج کی طالب علمی کے زمانے میں جن علما اور سربرآوردہ اشخاص کو اسلام کی خدمت اور تقویت کے لیے جمع کر دیا تھا، ان سے ان کا رابطہ بعد میں بھی قائم رہا اور سربرآوردہ شخصیات میں سے احمد تیمور پاشا، عبدالعزیز پاشا اور عبدالحمید بک سعید اور خاص کر

موخرالذکر کی کوشش سے مصر کی مشہور تنظیم جمعیة الشبان المسلمین قائم ہوئی جو مسلمان نوجوانوں کی مؤثر تنظیم تھی۔ شیخ حسن البنا اس تنظیم کے سرگرم معاون تھے اور جس روز، یعنی ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کی شام کو ان کی شہادت ہوئی، اس شام وہ اسی تنظیم کے دفتر میں بعض حکومتی نمایندوں سے میٹنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ میرا بھی زمانۂ قیام مصر میں یہاں اکثر جانا رہتا تھا۔ یہ ثقافتی سماجی اور دینی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور یہاں کے شان دار آڈیٹوریم میں بعض مشہور علما و ادبا کے ساتھ مجھے ایک پروگرام میں تقریر کرنے کا موقع ملا، عنوان تھا: 'دنیا میں اسلام'۔ میں نے ہندو پاک میں اسلام کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ صالح حرب پاشا اس زمانے میں اس کے صدر تھے۔

۲۰ویں صدی عیسوی میں جو عظیم دینی تحریکیں دنیا میں قائم ہوئیں، ان میں تحریک اخوان المسلمون (مصر)، تبلیغی جماعت (ہند)، اور جماعت اسلامی (ہندو پاکستان) سب سے زیادہ دوررس نتائج کی حامل تھیں۔ ان تحریکوں کے بانیوں میں سب سے کم عمر حسن البنا شہید تھے اور سب سے زیادہ کم عمری ہی میں، یعنی ۴۳ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے، اور ان کو شہادت کا شرف نصیب ہوا۔ پھر ان کی تحریک کو جس ابتلا و مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے ارکان جس قتل و غارت گری سے دوچار ہوئے، اگر یہ سب کچھ کسی دوسری تحریک کے ساتھ پیش آتا تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا کیا انجام ہوتا، لیکن الحمدللہ یہ عظیم اور جامع اسلامی تحریک آج بھی زندہ ہے۔

امام حسن البنا کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ ان کو ۲۰ ہزار اخوانیوں کے نام یاد تھے۔ وہ کوئی بہت بڑے مصنف نہیں تھے۔ ان سے جب بعض لوگوں نے تصنیف و تالیف کے لیے کہا تو انھوں نے جواباً کہا: ''میں کتابوں کے بجاے ایسے آدمی بنانا چاہتا ہوں کہ ان میں سے اگر ایک آدمی کو بھی میں کسی شہر میں بھیجوں تو وہ اس شہر کی حالت درست کردے''۔ واقعی انھوں نے ایسے افراد تیار کیے۔ ایسے افراد میں، سید قطب شہید نمایاں ترین تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اخوان کی راہ نمائی کے لیے مختلف دینی موضوعات پر آٹھ رسائل تحریر کیے، جس کا ۵۰۰ صفحات پر محیط اڈیشن بیروت سے ۱۹۶۶ء میں چھپا۔ بے شک وہ چودھویں ہجری کے مجدد تھے۔ رحمه الله رحمة واسعة۔

***



قدرت اپنے فیصلے کبھی نہیں بدلتی!
ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ
نئی سافٹ ٹیوب میں
مسواک
ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ
قدرت اپنے فیصلے کبھی نہیں بدلتی جیسے دانتوں اور مسوڑھوں کے لئے مسواک
جو ہے مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ میں، اس کے مسواک ایڈوانٹیج سے
دانتوں اور مسوڑھوں کو ملے مضبوطی، خوبصورتی، چمک اور ساتھ مہکتی سانسیں۔
مسواک Advantage یعنی ہر دم، ہر پل
ہمدرد

شہید ابو

سناء حسن البنا°

○ سوال: سب سے پہلے ہم آپ کے افراد خانہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں ؟

● جواب: ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ ہمارے دو بھائی، والد صاحب کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ ہم میں سب سے بڑی وفاء بہن ہیں جو مرحوم سعید رمضان کی اہلیہ بنیں، ان کے بعد احمد سیف الاسلام البنا ہیں، پھر سناء اور محمد حسام الدین (فوت ہوگئے)، ان کے بعد رجاء ہیں اور پھر صفاء تھیں (فوت ہوگئیں) ان کے بعد ہالہ ہیں اور سب سے چھوٹی بہن استشہاد ہیں جو والد صاحب کی شہادت کے بعد پیدا ہوئیں۔ ہمارے دادا ان کا نام دماء (خون) رکھنا چاہتے تھے لیکن رجسٹریشن کرنے والوں نے یہ نام رکھنے سے انکار کر دیا۔ پھر میرے دادا نے بھی یہ نام پسند نہیں کیا کہ وہ ہماری بہن کی ذات کا حصہ بنتا تھا اس لیے استشہاد (شہادت) تجویز کیا گیا۔ کلرک نے اس سے بھی انکار کر دیا لیکن میرے دادا نے اصرار کیا اور کہا کہ اگر اس کا یہ نام نہیں لکھو گے تو میں اسے بے نام ہی رہنے دوں گا یہاں تک کہ یہ بچی تم لوگوں کے ظلم کی زنجیر توڑنے کا سبب بن جائے گی۔ اس پر مجبور ہو کر اس نے استشہاد رجسٹر کر لیا، کیونکہ اس نے میرے ابو کی شہادت کے بعد جنم لیا تھا۔ یہ نام دادا جان، دادی جان اور ہماری بڑی بہن وفاء نے چنا تھا۔

ابو کی شہادت کے وقت وفاء باجی کی عمر ۱۷ برس تھی اور سیف ۱۴ سال کے تھے۔

○ حسن البنا شہید کی صاحب زادی۔ انٹرویو نگار: نسیبہ حسین، ترجمہ: عبدالغفار عزیز

سناء ۱۱سال کی تھی۔ رجاء ساڑھے پانچ برس کی تھیں، جب کہ ہالہ اڑھائی سال کی تھی۔ ہماری والدہ اس وقت بیماری سے دوچار تھیں۔ وہ دل کی مریضہ بھی تھیں۔ ہالہ کی پیدایش کے بعد امی کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ابو کی شہادت کے وقت ان پر بیماری کا حملہ شدید تھا، حتیٰ کہ ان کے معالج نے کہا کہ اسقاط کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس ضمن میں حتمی فیصلہ کرنے کے لیے انھوں نے ۱۲فروری کی تاریخ طے کر دی۔ لیکن ۱۱فروری ۱۹۴۹ء کی شام ابو کو شہید کر دیا گیا۔ امی کی طبیعت خراب ہونے کے باعث ڈاکٹر صاحب وزارت داخلہ سے خصوصی اجازت کے بعد ابو کی شہادت کے اگلے دن گھر آنے میں کامیاب ہوگئے۔ پولیس نے ہمارے گھر کا مکمل محاصرہ کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اصرار کیا کہ والدہ کو ہسپتال لے جایا جائے، لیکن امی نے انکار کر دیا۔ پھر کچھ عرصے بعد دوبارہ یہی بات چلی۔ سیف بھائی نے امی کی کمزور صحت کے باعث اسقاط سے انکار کر دیا۔ ہماری ایک رشتہ دار خاتون انھیں ایک اور ڈاکٹر کے پاس لے گئیں جنھوں نے کہا کہ ہر ۱۵روز بعد طبی معائنہ ہوتا رہے گا۔ اگر کوئی خطرہ ہوا تو پھر کوئی انتہائی فیصلہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کو منظور تھا کہ استشہاد دنیا میں آئی اور اس کا نام ابو کی شہادت کی نشانی بن گیا۔

○ ذاتی زندگی میں امام شہید کا آپ سے برتاؤ کیسا تھا؟

● ابو کی پوری زندگی میں بہت واضح اور مکمل توازن تھا۔ انھوں نے ہماری تربیت میں بھی توازن برتا۔ ہماری بہن وفاء بچوں میں سب سے بڑی تھیں اور وہ گھر پر ابو کی سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتی تھیں۔ امی مصروف بھی بہت رہتی تھیں اور بیمار بھی تھیں۔ گھر پر میزبانی کی ذمہ داریوں کا بڑا بوجھ امی کے کندھوں پر تھا۔ مرکز میں آنے والے مہمانوں کے لیے کھانا بھی بعض اوقات وہی تیار کیا کرتی تھیں۔ کبھی ایک دن میں تین تین بار کھانا پکتا۔ ابو کی شہادت کے بعد بھی اخوان کا معمول تھا کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد ہمارے گھر والوں سے ملاقات کے لیے ضرور آتے اور یہ ناممکن تھا کہ کوئی آئے اور امی اسے کچھ کھلائے پلائے بغیر جانے دیں۔ جب امی ابو قاہرہ آگئے اور وہاں اخوان کا مرکز بننے لگا تو امی نے اپنا سارا جہیز مرکز کے لیے دے دیا، یہاں تک کہ گھر کے قالین اور پردے بھی۔ یہاں میں آپ کو امی کے بارے میں مزید کچھ تفصیلات بتاتی چلوں۔ میری والدہ اسماعیلیہ شہر کے ایک درمیانے متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ میری دادی اماں، ہمارے

والد صاحب کے لیے مختلف گھروں کے رشتے دیکھ رہی تھیں۔ ایک رات امی کے گھر آئیں تو انھیں نسوانی آواز میں خوب صورت تلاوت قرآن کی آواز آئی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ فلاں ہیں اور دورانِ نوافل تلاوت کر رہی ہیں۔ دادی نے بغیر کچھ مزید پوچھے ذہن میں ایک رائے قائم کرلی۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ اگرچہ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، ملازم خواتین بھی ہیں لیکن اہلِ خانہ گھر کے اکثر کام خود کرتے ہیں تو یہ رائے مزید پختہ ہوگئی، لیکن پھر معلوم ہوا کہ ان کی منگنی کہیں اور طے ہوچکی ہے، یہ سن کر دادی اماں واپس آگئیں____ ایک روز ایسا ہوا کہ امی کا منگیتر آیا اور نانا سے کہنے لگا: اپنی صاحب زادی کو میرے ساتھ بھیج دیں ہم نے سینما جانا ہے۔ نانا نے کسی سے پوچھا: یہ سینما کیا ہوتا ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ تو بڑی خراب چیز ہوتی ہے جس میں رقص و سرود بھی شامل ہے۔ نانا نے منگنی کی انگوٹھی لاکر ان کی ہتھیلی پر رکھ دی اور کہا: تم سے میری کسی بیٹی کی شادی نہیں ہوسکتی۔ بعد میں یہ رشتہ ابو کے ساتھ طے پاگیا۔

○ مسلسل سفر اور شدید مصروفیت کے باوجود وہ آپ لوگوں کی تربیت کے لیے کیسے وقت نکالا کرتے تھے؟

● ابو دورہ کر بھی ہماری تربیت کیا کرتے تھے۔ مثلاً انھیں معلوم ہوا کہ سیف بھائی کچھ عام قسم کے ناول پڑھنے کے شوقین بنتے جارہے ہیں۔ انھوں نے منع کرنے کے بجائے تاریخ اسلامی کے واقعات اور عظیم شخصیات جیسے صلاح الدین ایوبی کے بارے میں کئی اچھی کتابیں انھیں لاکر دیں، نتیجہ یہ کہ کچھ عرصہ بعد خود سیف الاسلام بھائی کی پسند بدل گئی۔ اس طرح والد صاحب کی کوشش ہوتی تھی کہ ہم جو کام بھی کریں اس کا داعیہ خود ہمارے دل سے اٹھے۔

'جدید مصر' نامی ایک پرائیویٹ اسکول کی پرنسپل، میرے والد صاحب سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ وہ ہر منگل کو ابو کے درس کے لیے خواتین کو جمع کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے ابو سے پوچھا کہ: "آپ اپنی کوئی بیٹی داخل کروانا چاہتے ہیں"۔ ابو نے رضامندی ظاہر کی تو انھوں نے مجھے وہاں براہِ راست پہلی کلاس میں داخلہ دے دیا۔ لیکن جب ابو نے دیکھا کہ پرنسپل کے لاڈ پیار کی وجہ سے میری پڑھائی کا معیار گر رہا ہے، تو انھوں نے مجھے وہاں سے وفاء بہن کے اسکول منتقل کردیا۔

ابو کبھی ہمیں افسردہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک بار دادی جان نے شادی کی ایک تقریب میں جانے کا پروگرام بنایا۔ طے ہوا کہ سیف بھائی، وفاء بہن اور میں ان کے ہمراہ جائیں گے، لیکن جب روانگی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ سامان زیادہ ہوگیا ہے اور ہمارے لیے جگہ نہیں ہے، بہ مشکل وفاء بہن اور سیف بھائی ہی بیٹھ سکتے تھے۔ اس لیے دادی جان ان دونوں کو لے گئیں اور میں اپنے کپڑوں کا بیگ تھامے وہیں کھڑی رہ گئی۔ ابو آئے انھوں نے میرے کندھے تھپتھپائے اور کہا سناء کوئی بات نہیں اور مجھے راضی کرنے کے لیے ۲۵ قرش دے دیے جو اس وقت اچھی خاصی رقم تھی۔ میں پھر بھی اداس ہی رہی جس پر انھوں نے میرا بیگ اٹھایا اور مجھے ساتھ لے گئے۔

○ **کیا کبھی ان کی دعوتی سرگرمیاں انھیں آپ سے دور کردیتی تھیں؟**

● انھوں نے کبھی ہمیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ کام کا بوجھ اپنے ساتھ گھر لے آئے ہیں۔ مثلاً ہم نے انھیں کبھی ان لوگوں کی طرح کرتے نہیں دیکھا کہ جو گھر میں داخل ہوتے ہی چیخنا چلانا، ڈانٹنا اور دھمکانا شروع کر دیتے ہیں۔ ابو کی زندگی میں سب سے اہم اور قابلِ ذکر بات ان کا منظم ہونا تھا۔ آپ والد صاحب کی زندگی کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ وہ مکمل طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بخوبی سمجھتے تھے کہ تم پر تمھارے بدن کا بھی حق ہے۔ ابو ۲۴ گھنٹوں میں بہ مشکل چار گھنٹے سویا کرتے تھے۔ آپ کی ۱۰ سنہری نصیحتوں میں بھی یہ بات شامل تھی کہ ذمہ داریاں اوقات سے زیادہ ہیں۔ ان کی یہ بات ان جیسے اللہ کے مجاہدوں کے لیے تو درست تھی، رہے ہم جیسے لوگ تو وقت ضائع کرنے میں مہارت رکھتے ہیں، غالباً ہمیں سب سے اچھی طرح یہی کام کرنا آتا ہے۔ ابو ہمیشہ دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر ان کے پاس مہمان ہوتے تو انھیں بھی گھر لے آتے تھے۔

ابو صبح کام پر جاتے، دوپہر کے کھانے کے وقت آتے، پھر بہت تھوڑا سا آرام کرتے، یہاں تک کہ وفاء باجی کہتی ہیں ایک بار ابو نے کہا: ''میں تھوڑی دیر آرام کرنے لگا ہوں۔ مجھے ٹھیک سات منٹ بعد جگا دینا''۔ باجی کہتی ہیں کہ میں جا کر قہوہ تیار کرنے لگ گئی کہ جتنی دیر میں قہوہ

بنے گا سات منٹ ہو جائیں گے اور میں ساتھ ہی قہوہ پیش کردوں گی۔ لیکن جیسے ہی میں قہوہ تیار کر کے پلٹنے لگی وہ میرے ساتھ کھڑے پوچھ رہے تھے۔ ''وفاء بیٹی! قہوہ بن گیا''۔ ابو خود پر مکمل کنٹرول رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ذات کو اپنی خواہشات کے ہاتھوں مغلوب نہیں ہونے دیا۔

ابو نے ہم میں سے ہر ایک کی الگ الگ فائل بنا رکھی تھی، جس میں اس کا سارا ریکارڈ محفوظ رکھتے تھے۔ ہر بچے کے اسکول کے معاملات، بیماری اور علاج، حفاظتی ٹیکوں کی تاریخیں، یہاں تک کہ ولادت سے لے کر جو جو ٹیکے لگے اور جو جو بیماری لاحق ہوئی ہر چیز کا ریکارڈ ہماری فائلوں میں رکھتے۔ یہ بھی ان کے منظم ہونے کی علامت تھی کہ کسی کام کو دوسرے کام پر حاوی نہیں ہونے دیتے تھے۔

○ آپ نے بتایا کہ آپ کی بڑی بہن وفاء ان کے سیکرٹری کی حیثیت رکھتی تھیں۔

● وفاء باجی ہم میں سب سے بڑی تھیں اور ہمیشہ گھر ہی میں رہتی تھیں۔ ہماری بہن 'الاخوات المسلمات' کی تاسیس کرنے والوں میں سے تھیں۔ دیگر کئی بہنیں بھی ان کے پاس آتی رہتیں اور مختلف معاملات میں ہاتھ بٹاتیں۔ امی بھی اس پورے کام میں ان کے ساتھ شریک رہتیں۔ ابو انھیں ہماری بڑی بہن وفاء کے نام کی مناسبت سے اُم وفا کہہ کر مخاطب کیا کرتے' اور انھوں نے بھی ابو کی شہادت تک ہی نہیں' شہادت کے بعد بھی وفا کا حق ادا کر دیا۔

○ امام حسن البنا رحمہ اللہ کے خلاف سازشیں کیسے شروع ہوئیں؟

● آپ کی شہادت سے پہلے ہر طرف ان کے قتل کی بات کی جانے لگی تھی۔ کبھی ہمیں یہ خبر ملتی کہ ہمارا گھر دھماکے سے اڑا دیا جائے گا۔ ابو ان باتوں پر حیرت کا اظہار کرتے اور بڑے اطمینان سے کہتے کہ: ''کیا سب کچھ صرف مجھے قتل کرنے کے لیے کریں گے۔ کیا پوری کی پوری ریاست میرے قتل کی سازشوں میں ملوث ہو جائے گی۔ مجھے قتل کرنے کے لیے اتنے تردد کی کیا ضرورت ہے۔ میرے لیے تو ایک کرایے کا قاتل کافی ہے جو کہیں سے چھپ کر گولیاں چلائے اور بس''، ہم یہ سن کر گھبرا جاتے۔ ابو کو ان دنوں جس چیز کی زیادہ تکلیف تھی وہ اخوان کے کارکنان کی

بڑی تعداد میں گرفتاریاں تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے: ''مجھے اخوان کے بچوں کی آہ و بکا ہمیشہ سنائی دیتی رہتی ہے''۔ وہ اخوان کی رہائی کے لیے ہر وسیلہ اختیار کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس ضمن میں وہ مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ الشبان المسلمون کے دفتر میں بعض سرکاری کارندوں سے اپنی آخری ملاقات میں انھوں نے انھیں بتایا کہ وہ شیخ نبراوی صاحب سے ملنے جائیں گے جن کی عمر اس وقت ۷۰ سال کے قریب تھی، لیکن والد صاحب کے وہاں جانے سے پہلے ہی حکومتی ایجنسیوں نے جا کر شیخ نبراوی صاحب کا ڈیرہ تباہ کر دیا۔ پھر انھوں نے ابو سے کہا کہ شیخ الازہر جناب مراغی صاحب ان سے الشبان المسلمون کے مرکز میں ملنا چاہتے ہیں، لیکن یہ سب انھیں شہید کرنے کی سازش ہی کا حصہ تھا۔

○ امام البنا کی شہادت کا دن آپ کے لیے کیسا تھا؟

● وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس کا ایک ایک لمحہ میری یادداشت پر ثبت ہے۔ اس روز ایک پوری بٹالین فوج نے علاقے کو گھیرا ہوا تھا۔ اس علاقے کے ہر گھر کے افراد کے نام و پتے لکھے گئے، اور اس روز وہاں رہایشی افراد کے علاوہ کسی کو آنے یا وہاں سے نکلنے نہیں دیا گیا۔ وہ لوگ ہمارے گھر کی بوسیدہ عمارت کے اندر بھی گھس آئے تھے۔ حالانکہ وہ گرنے کے قریب تھی، لیکن اس کی سیڑھیوں اور چھت پر فوجیوں کی بڑی تعداد براجمان تھی۔ وہ میرے دادا کو لے گئے اور اصرار کرنے لگے کہ وہ قصر عینی ہسپتال سے اپنے بیٹے کی میت وصول کریں اور وہاں سے سیدھا قبرستان چلے جائیں۔ میرے دادا نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ پہلے شہید کی اہلیہ اور بچے اس کا چہرہ دیکھ لیں تو پھر تدفین ہوگی۔ بالآخر دادا کا اصرار مان لیا گیا اور ابو کی میت گھر لائی گئی۔ دادا جان دروازے پر ہمیشہ اپنے مخصوص انداز میں دستک دیا کرتے تھے۔ انھوں نے آکر وہی مخصوص دستک دی اور کھنکارتے ہوئے امی سے کہا: 'دروازہ کھولیں'۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ ہم لوگ ان دنوں اپنے معمول کے خلاف دیر تک جاگتے رہتے تھے کیونکہ ہر طرف دہشت کی فضا قائم کر دی گئی تھی اور ہمیں ابو کی شہادت قریب ہونے کا یقین ہو چلا تھا۔ جیسے ہی دادا کی آواز آئی: 'دروازہ کھولیں' امی کو یقین ہو گیا کہ جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہو چکا۔ دروازے پر دادا جان کی آواز سنتے ہی امی پکاریں: 'بالآخر انھیں مار ڈالا گیا' اور انھوں نے رونا شروع کر دیا۔ دروازہ کھلنے پر دادا نے امی کی ڈھارس

بندھائی اور کہا: 'اللہ سے اجر کی امید پر صبر کریں۔' میرے دادا جی بہت صابر اور اللہ والے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں میری پھوپھیوں کو بھی معلوم ہوگیا، ان کے گھر بھی قریب ہی تھے۔ میری ایک پھوپھی آئیں اور کمرے میں جانے لگیں جہاں ابو کی میت رکھی تھی۔ ان کے ساتھ ہی میں بھی جلدی سے چلی گئی، کسی روکنے والے کو میرا پتا ہی نہیں چلا۔ میں نے ابو کے چہرے سے چادر ہٹائی--- اللہ کی قسم! جب تک میں زندہ ہوں ابو کا وہ مسکراتا ہوا چہرہ نہیں بھلا پاؤں گی۔ ایک پرسکون میٹھی سی مسکراہٹ لیے ہونٹوں میں ابو کے چمکتے ہوئے دانت نظر آرہے تھے۔ میں نے انھیں دیکھا تو بالکل یقین ہی نہیں آیا کہ وہ دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔ میری ایک سہیلی نے جب مجھ سے تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ تمھارے ابو فوت ہوچکے ہیں تو میں نے اسے کہا: نہیں وہ فوت نہیں ہوئے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح اللہ کے پاس چلے گئے ہیں لیکن جلد واپس آجائیں گے۔ میں نے خود ان کا چہرہ دیکھا ہے وہ فوت نہیں ہوئے۔

پھر میرے دادا نے ابو کو غسل دیا۔ انھیں کفن پہنایا۔ گورکن تابوت لے آیا اور ابو کی میت اس میں رکھ دی گئی۔ میرے دادا فوجیوں سے مخاطب ہوئے اور کہا: ''میرے ساتھ میرے بیٹے کا جنازہ تو اٹھوا دو''۔ انھوں نے جواب دیا ''ہمیں آرڈر نہیں ہے''۔ وفاء باجی چلا اٹھیں: ''جنازہ تو اٹھائیں کندھا کون دے گا''۔ لیکن وہ نہیں مانے اس پر میری دادی جان اٹھیں اور کہا: ''اپنے بیٹے کا جنازہ میں خود اٹھاؤں گی''۔ وہ تابوت کی طرف بڑھیں تو اخوان سے تعلق رکھنے والی چند خواتین جو اس وقت اندر آنے میں کامیاب ہوگئی تھیں وہ بھی آگے بڑھیں اور اس دہشت کے عالم میں خواتین نے امام حسن البنا شہید کا جنازہ اٹھایا۔

ابو کی وفات کے ۱۰ سال بعد دادا اللہ کو پیارے ہوئے تو انھیں ابو کے پہلو میں دفن کرنے کے لیے لے جایا گیا[۱]۔ اس وقت ابو کی قبر کھولی گئی تو ایک حیرت ناک منظر تھا کہ ۱۰ سال بعد بھی ابو کا تابوت اسی طرح صحیح سالم تھا۔ میت کے چہرے کے اوپر جو شیشہ لگا ہوتا ہے اس میں سے

۱- مصر میں قبریں اس انداز سے بنائی جاتی ہیں کہ زیر زمین چھت بنا کر اس کے نیچے تابوت رکھ دیے جاتے ہیں۔ تاہم، قبر اندر سے کچی ہی رہتی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی جگہ ایک سے زیادہ تابوت رکھے جاتے ہیں۔ اہراماتِ مصر میں بھی یہی روایت اپنائی گئی تھی۔

نظر آیا کہ صرف تابوت ہی محفوظ نہیں بلکہ چہرے سے کفن کھلا ہوا تھا اور ابو کا چہرہ بالکل صحیح سالم تھا۔ اسی طرح آنکھیں موند رکھی تھیں۔ داڑھی کے بالوں کی جگہ کچھ نشان تھے۔ یہ اب سے تقریباً ۱۰ سال پہلے کا واقعہ ہے۔

○ **امام کی شہادت کے بعد آپ کی والدہ مرحومہ کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا ہوگا؟**

● میرے بھائی سیف نے ہمارا اور امی کا بہت خیال رکھا۔ کم سنی کے باوجود انھوں نے جان لیا کہ اب گھر کی صورت حال مخصوص نوعیت کی ہے۔ ابو کی شہادت کے بعد بھی ۲۴ گھنٹے ہماری نگرانی جاری رہی ___ اور تو اور ان کی قبر کی بھی نگرانی کی جاتی تھی، جو وہاں دعا کے لیے جاتا گرفتار کرلیا جاتا۔ میری والدہ مرحومہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھیں۔ انھوں نے ہمیں گھر میں ہی رکھا ___ کھیلنے کے لیے بھی دوسرے بچے ہمارے گھر میں آجاتے‘ ہم باہر نہیں جاتے تھے۔ ہم نے یہ وقت خوب مطالعے میں گزارا۔ ابو کی لائبریری سے بھرپور استفادہ کیا۔ میں اس وقت تک سوتی نہیں تھی جب تک ابو کی لائبریری سے لی ہوئی کتاب مکمل نہ کرلیتی۔

✲✲✲

حسن البنا، اخوان اور مغربی مفکرین

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد °

۲۰ویں صدی، مغربی مفکرین کی تحریرات میں عموماً 'سیاسی اسلام' کی صدی قرار دی جاتی ہے۔ اسلام نے اس صدی میں مسلم امت کو نہ صرف مغربی سامراج کی غلامی سے نکلنے میں قوت محرکہ فراہم کی، بلکہ دنیا کے نقشے پر اس صدی میں وہ تحریکات اسلامی ابھریں جن کا مشترکہ ہدف اور مقصد ایک صالح اخلاقی معاشرے اور نظام حکم کا قیام تھا۔ ان تحریکات نے روایتی اسلامی تعبیر سے ہٹ کر اپنا رشتہ براہ راست قرآن و سنت سے جوڑتے ہوئے دین کی حرکی تعبیر اپنے ادب، تنظیم اور نظام تربیت کے ذریعے امت مسلمہ کے سامنے رکھی۔ امت مسلمہ نے جو اپنے سیاسی، معاشی، معاشرتی، نفسیاتی زوال کی چبھن کو محسوس کر رہی تھی اور جس کے دیکھتے ہی دیکھتے مغربی سامراج کے زیر اثر اس کے اتحاد کی علامتی خلافت کی جگہ مغربی لادینی نظام کو رائج کر دیا گیا تھا۔ وہ اُمت جو الجزائر سے انڈونیشیا تک کہیں فرانسیسی، کہیں پرتگالی، کہیں اطالوی اور کہیں انگریزی سامراج کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ اُمت نے اس صالح مقصد کے حصول کے لیے نئی فکر اور تعبیر پر الجزائر سے انڈونیشیا تک استقبال کیا۔ مختلف ناموں اور عنوانات سے اٹھنے والی اس تحریک نے امت کے سنجیدہ، تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو امت مسلمہ کے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھے، امید کی ایک کرن دکھائی اور یوں لوگ ساتھ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔

° وائس چانسلر رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

اس تناظر میں امام البنا نے اپنی تحریک اصلاح کا آغاز کیا۔ ان کی حیات، تحریک کے تاریخی ارتقا، اشاعت فکر، اداروں کے قیام، سیاسی اتار چڑھاؤ، مختلف عناصر کے ساتھ اتحاد اور ٹکراؤ کو ایک لمحے کے لیے نظر انداز کرتے ہوئے، اس مقالے میں ہمارا مقصد صرف یہ دیکھنا ہے کہ بعض معروف مغربی مفکرین امام البنا اور ان کی تحریک کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ممکنہ اختصار کے ساتھ ہم صرف چند اشارات کی شکل میں اس موضوع سے بحث کریں گے۔

مغربی مفکرین بالعموم ۲۰ویں صدی کی اسلامی تحریکات کو روایت پرست، رجعت پسند، بنیاد پرست عسکریت پسند، ملوکیت کی پشت پناہ اور اس سے ملتے جلتے متضاد القاب سے یاد کرتے ہیں۔ عموماً یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ یہ تحریکات ایک تصوراتی اسلام (Utopia) کی طرف دعوت دیتی ہیں، جب کہ زمینی حقائق کو نظر انداز کر جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسے ماضی کی طرف پلٹنے کی دعوت دیتی ہیں جو تاریخ کے اوراق میں دفن ہو چکا ہے۔ ان پر یہ الزام بھی دھرا جاتا ہے کہ یہ اس بوسیدہ ڈھانچے کو کوہ کنی کرنے کے بعد ایک حیات نو بخشنے کی خواہش میں گرفتار ہیں اور یہ تحریکات تاریخ کی رفتار اور تبدیلیوں سے کوئی آگاہی نہیں رکھتیں۔ ان مفروضات کو کلید تصور کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے کہ ان تحریکات کی پکار سے صرف وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جو متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ، خیالات میں گم رہنے والے اور اپنے مروجہ معاشروں سے عدم اطمینان رکھنے والے افراد ہیں۔ اس قسم کے تصورات کی بنا پر اسلامی تحریکات کو بادی النظر میں بآسانی بنیاد پرست اور قدامت پرست یا روایت پسند کا عنوان دے دیا گیا۔

بعض جدید مغربی مفکرین نے ایک قدم آگے بڑھ کر نہ صرف اصلاح اور تبدیلی کی قیادت کے جذبے سے سرشار ان اسلامی تحریکات کو، بلکہ خود اسلام کو امن عالم اور جدید مغربی لادینی سیاست و معیشت پر مبنی نظام کے لیے ایک خطرہ قرار دیتے ہوئے اسلام کے ساتھ کسی مکالمے یا تبادلۂ خیال کے امکان کو رد کرتے ہوئے ٹکراؤ اور قوت کے ذریعے زیر کرنے کی تلقین سے بھی گریز نہیں کیا۔ بعض مغربی بنیاد پرست مفکرین مغرب کی عسکری اور معاشی برتری سے سرشار نہ صرف اسلامی احیا کی تحریکات کو بلکہ خود اسلام کو راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے اپنا ہدف بنا بیٹھے۔ اس سلسلے میں معروف امریکی ماہر سیاسیات پروفیسر سیموئیل پی ہن ٹنگٹن کا صرف ایک جملہ مغرب کی مذہبی بلکہ

سیاسی وعسکری قیادت کے حالیہ ذہن کی عکاسی کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ کہتا ہے:

The underlying problem for the West is not Islamic Fundamentalism, it is Islam ,a different civilization whose people are convinced of the superiority of their culture and are obsessed with the Inferiority of their power.[1]

مغرب لیے بنیادی مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں، اسلام ہے۔ یہ ایک مختلف تہذیب ہے جس کے ماننے والے اپنی ثقافت کی برتری پر یقین رکھتے ہیں اور اقتدار سے محرومی کا احساس ان پر چھایا ہوا ہے۔

اتنے واشگاف الفاظ میں اسلام کو بجائے خود ایک خطرہ قرار دینا علمی بوکھلاہٹ اور ایک بنیاد پرست ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔

ایک ہی تیر سے کئی شکار کرتے ہوئے ایک دوسرے مغربی مصنف جان لافن نے اسلامی تحریکات اصلاح کو ایک جانب مغرب کے لیے خطرہ اور دوسری جانب خودان ممالک کے حکمرانوں اور حکمران طبقوں کے لیے سخت مہلک قرار دیا ہے۔ پھر ان کا موازنہ یورپ کی اشتراکی تحریک سے کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ: ان کے ہتھکنڈے بھی وہی ہیں جو اشتراکی تنظیمات کے ہوتے ہیں یعنی یہ پیشہ ورجنونی اور 'روایتی ترقی پسند' ہیں جو ہر لحہ حملہ کرنے کی تاک میں صبر و استقامت سے منتظر رہتے ہیں۔ اس کے اپنے الفاظ میں یہ بات یوں کہی گئی ہے:

" The third group of millitant leader, the "traditional progressives", can for the West be the most dangerous of all, though short-term they are even more dangerous to the present political leaders of Arab regimes. Professional zeaolts , these men are more worldly wise than the ayatullahs . They know that their Islamic Ideal can be reached and held ---through political action.

1- Samuel P.Huntigton , *The Clash of Civilization and the Remaking of World Order* , London ,Penguin Books,1997-p217

They use violance as a deliberate means to a desired end. Their strength is their group discipline and motivation. I have always been struck by the similarity of their orgnization with that of European Communists - the same emphasis on self contained cells the courier contact with other cells, the policy of working and watching while being ready to strike. The most obvions samples are the Muslim Brotherhood in Arab World and Jamaat-e-Islami in Pakistan.[2]

جنگ جو قائدین کا تیسرا گروہ: 'روایت پسند ترقی پسند' مغرب کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے' اگرچہ مختصر مدت میں وہ عرب حکومتوں کے موجودہ سیاسی قائدین کے لیے اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہ پیشہ ور انتہا پسند' آیت اللہ (ملاؤں) سے زیادہ دنیاوی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا اسلامی نصب العین سیاسی عمل کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے اور قائم رکھا جاسکتا ہے۔ وہ مطلوبہ ہدف حاصل کرنے کے لیے تشدد کو سوچے سمجھے ذریعے کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ ان کی طاقت' ان کا گروہی نظم وضبط اور جذبہ ہے۔ مجھے ان کی اور یورپی کمیونسٹوں کی تنظیمی مماثلت ہمیشہ غیرمعمولی محسوس ہوئی: خود مکتفی چھوٹے چھوٹے گروہوں کی وہی اہمیت اور دوسرے گروہوں سے کوریئر کے ذریعے رابطہ، حملے کے لیے تیار رہتے ہوئے دیکھنے اور جائزہ لینے کی حکمت عملی۔ اس کی نمایاں مثال عرب دنیا میں اخوان المسلمون اور پاکستان میں جماعت اسلامی ہے۔

اگر اس بیان کا تجزیہ کیا جائے تو چار نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں:

امام البنا کی تحریک اشتراکی ماڈل پر ایک شدت پسند عسکری جماعت تھی جو حملہ آور ہو کر ملکی نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے ایک ایک لمحہ گن کر گزار رہی تھی۔ ثانیاً مغرب اور مغرب کی

2- John Laffin, *The Dagger of Islam,* New York, Bantim Book, 1981, P 168-169

حمایت کی بنا پر جو حکمران مسلمان ممالک پر مسلط ہیں، یہ ان کی دشمن تھی۔ ثالثاً اس کا اصل ہدف کسی نہ کسی طرح اقتدار پر قبضہ کر کے اپنی من مانی اسلامی تعبیر کو دوسروں پر زبردستی نافذ کر دینا تھا اور رابعاً اس کی اصل قوت اس کے وہ کارکن تھے، جنھیں اشتراکی طرز کے کمیون (commune) یا حلقوں میں تربیت دے کر مذہبی فدائی بنا دیا جاتا تھا جو جنون کی حد تک اطاعت امیر پر ایمان رکھتے تھے اور اس بنا پر اس دور میں سب سے زیادہ مہلک خطرے اور اسلحے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خردمندی کے نام پر مذکورہ بالا قیاسات اور مفروضوں کی بنیاد پر کسی تحریک کا تصوراتی خاکہ بنا لینا کہاں تک درست ہے اور اس قسم کے جذباتی، غیر حقیقی، متعصبانہ اور رنگ آلود بیانات معروضیت کی کسوٹی پر کہاں تک درست ثابت ہو سکتے ہیں؟ ان سوالات کا جواب بجائے انفرادی قیاس آرائی میں تلاش کرنے کے، خود ایک تحریک کے دستور اس کے زعما کی تحریرات اور اس کی اعلان کردہ حکمت عملی میں تلاش کیے جائیں تو شاید ایسی تحریکات کے ساتھ زیادہ انصاف کیا جا سکے۔

یہ بات دکھ اور افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ مغرب کے اکثر مصنف اپنے طولانی دعووں کے باوجود بہت کم معروضیت پر عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے اکثر مفروضات ثانوی ذرائع معلومات اور پہلے سے مرتب کردہ احساسات پر تعمیر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض ایسے مغربی مفکرین بھی ہیں جو ان تحریکات اصلاح اور ان کے قائدین کے حوالے سے رائے رکھنے میں جادۂ اعتدال سے قریب تر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مثلاً معروف کناڈین محقق اور میکیگل کے ادارہ تحقیقات اسلامی کے بانی، ڈائرکٹر پروفیسر ولفرڈ کینٹ ول اسمتھ جنھوں نے کچھ عرصہ لاہور کے فورمین کرسچن کالج اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیے، جو عربی اردو اور دیگر اسلامی زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے، وہ اخوان المسلمون پر لگائے گئے ایک فکری الزام کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"To regard the Ikhwan as purely reactionary would , in our judgement be false. For there is at work in it also a praise worthy constructive endeavour to build a modern society on the basis of justice and humanity, as an extrapolation from the best Values that have been

experienced in the tradition from the past.[3]

اخوان کو صرف رجعتی قرار دینا ہماری راے میں غلط ہوگا۔ اس کے اندر عدل وانسانیت اور ماضی کی روایات سے تجربے کی بنیاد پر حاصل کردہ سنہری اقدار کی بنیاد پر ایک جدید معاشرے کے قیام کے لیے ایک قابلِ تعریف تعمیری کوشش بھی بروے کار ہے۔

اسمتھ کے اس معتدل بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اخوان المسلمون' امام البنا اور اسی طرح سید مودودی کا دورِ حاضر میں ایک عادلانہ اسلامی سیاسی نظام اور معاشرے کے قیام کی کوشش کو رجعتی تحریک کہنا ان تحریکات کے ساتھ ظلم ہے۔ ایک جانب اس فکر کے حامل مغربی مفکر نظر آتے ہیں تو دوسری جانب ایسے مفکرین کی ایک بڑی تعداد ہے جو البنا اور ان کی تحریک کو بنیاد پرست قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں۔

یہ بات کہ امام البنا عسکریت پسند جنگ جو تھے اور انھوں نے اپنی تحریک کو ایک تشدد پسند جماعت بنانا چاہا، یا وہ شمشیر بے نیام کے ذریعے نظام عدل و امن کو قائم کرنا چاہتے تھے، مغربی مصنفین کا ایک پسندیدہ موضوع ہے اور امام البنا، اخوان المسلمون اور اسی رو میں جماعت اسلامی پاکستان اور دیگر دستوری اصلاحی اسلامی تحریکات کو لپیٹتے ہوئے یہ حضرات اکثر ان تحریکات کی 'جنگ جویانہ' صلاحیت پر اتنے مختلف بلکہ متضاد زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں کہ ان تحریکات کے اصل خدوخال اردگرد کے گردآلود ماحول میں دھندلا جاتے ہیں اور کبھی ابھر کر سامنے نہیں آنے پاتے۔

"This is the movement which , in one form or another, has been the most prominent-fundamentalist current in sunni Islam since its Inciption in 1928. He launched the Brotherhood as movement for education and reform of hearts and minds.[4]

3- Wilfred Cantwell Smith *Islam in Modern History*, New York -Mentor Books-1957, P-161.

4- Sami Zubaida. *"Islamic Fundamentalism in Egypt and Iran"* in lionel Caplan, *Studies in Religious Fundamentalisms*, - London, The Macmillan press,1987,P-34.

یہ وہ تحریک ہے جو ایک یا دوسری حیثیت میں' ۱۹۲۸ء میں اپنے آغاز کے بعد سے سنّی اسلام کی سب سے نمایاں بنیاد پرست لہر رہی ہے۔ انھوں [امام البنا] نے اخوان کو دل و دماغ کی اصلاح و تعلیم کے لیے تحریک کی حیثیت سے شروع کیا۔

امام البنا اور اخوان پر 'بنیاد پرست' ہونے کا خیالی الزام اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ غیر شعوری طور پر بعض اخوانی بھی خود کو بنیاد پرست سمجھنے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں۔

بنیاد پرستی کے الزام کے ساتھ ہی بار بار یہ بات بھی دہرائی جاتی ہے کہ امام البنا اور تحریک اخوان المسلمون گردش ایام کو پیچھے کی طرف دھکیل کر انسانیت اور مسلم دنیا کو ایک ایسے دور کی طرف لے جانا چاہتی ہے جو ماضی کا ایک ورق بن چکا ہے اور جو ۲۱ویں صدی کی ٹیکنالوجی، مادی ترقی اور علوم میں نئی ایجادات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لیے یہ دعوت، ترقی کی جگہ علمی، فکری اور مادی زوال کی دعوت ہے اور اس بنا پر 'روشن خیال' دنیا کے لیے ایک شدید خطرے کی حیثیت رکھتی ہے۔

The Muslim Brothers world view was articulated in conservative Islamic terms calling for the restorating an Ideal society of the distant past.[5]

اخوان المسلمون کا تصور جہاں (ورلڈ ویو) قدامت پسند اسلامی اصلاحات میں بیان کیا گیا تھا جس میں ماضی بعید کے مثالی معاشرے کو بحال کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔

جن محققین نے براہ راست امام البنا کے خطبات اور تحریرات کا مطالعہ کیا ہے، وہ یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ گو درمیانی دور میں اخوان کے بعض اقدامات عسکری نوعیت کے تھے، لیکن مجموعی طور پر نفوس کا تزکیہ و اصلاح ہی دعوت کا مرکزی نکتہ رہا۔ چنانچہ ایک مفصل تجزیاتی تحریر میں پروفیسر جان ایل اسپوزیٹو نے اخوان کی دعوت کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے۔[6]

5- Joel Beinin *"Islamic Response to The Capitalist Penetration"* in Barbara Freyer Stowasser, *The Muslim Impulse*, Washington DC, Croom Helm,1987, p-96

6- John L. Esposite *"Trailblazers of the Islamic Resurgence"* in Haddad, Voll'Esposito, Moore and Sawan, ed . *The Contemporary Islamic Revival*, New York, Green Wood Press1991, p 39.

امام البنا کی شخصیت کا ارتقا اور ان کا تصوف سے نہ صرف متاثر ہونا بلکہ اس کو عملاً اس حد تک اختیار کرنا کہ ان کی تعلیمات اور نظام تربیت میں ایک بڑا حصہ قرآن کریم کی تلاوت، اذکار و اوراد اور قیام الیل کے ذریعے نفوس کی اصلاح سے تعلق رکھتا ہے، ان کی شخصیت اور طرزِ عمل ہر زاویے سے ایک روحانی پیشوا سے ملتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس غالب پہلو کے باوجود ان کی دعوت کا ایک جزوی نکتہ جس سے وہ خود بہت زیادہ مطمئن نہ تھے، اور ان کی عسکریت ہی اکثر مغربی مفکرین کی توجہ کا مرکز بنی ہے۔

امام البنا کی شخصیت اور جماعت اخوان المسلمون پر غیر مسلم محققین کی تحریرات میں نمایاں ترین اور اولین مصادر پر مبنی ایک تحقیقی کتاب جس کا مصنف ایک عرصے تک مصر میں امریکی خفیہ ادارے کے رکن کی حیثیت سے متعین رہا، بار بار اس بات کا تذکرہ کرتا ہے کہ:

"The two continous Influnces in history so far had been classical Islamic learning and emotional discipline of sufism.[7]

تاریخ پر کلاسیکل اسلامی علوم اور تصوف کے جذباتی پہلو دونوں کے اثرات مسلسل رہے۔

امام البنا کے رسائل مدلل طور پر تزکیۂ نفس، تزکیۂ خاندان اور تزکیۂ معاشرہ پر متوجہ کرتے ہیں لیکن چونکہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرح امام البنا کا پہلا دعوتی نکتہ بھی یہی ہے کہ اسلام مکمل جامع اور عملیت پر مبنی نظام حیات ہے۔ اس لیے تصوف کے واضح اور غالب اثرات کے باوجود ان کی تحریک اور شخصیت کو سیاسی حوالے سے زیادہ نمایاں کیا جاتا رہا۔ بظاہر اس کا سبب مغربی اور مغرب زدہ اذہان کا 'مذہب' اور 'سیاست' کو دو الگ خانوں میں تقسیم کرنا ہے، جس کے بعد 'مذہب' سے وابستہ کسی بھی فرد کے سیاسی عمل میں حصہ لینے کو اصول سے انحراف سمجھا جاتا ہے، جب کہ امام البنا ہوں یا سید مودودی، دونوں کی دعوت کا مقصد روایتی مذہبیت اور روایتی روحانیت سے بغاوت کرتے ہوئے، ایک انقلابی فکر کے ذریعے علامہ محمد اقبال کی طرح، اسلامی فکر اور معاشرے کی تشکیل جدید کرنا تھا۔ مغربی نگارشات میں اس اختیار کردہ جدید (innovative) اور غیر روایتی

7- Richard P.Mitchell, *The Society of the Muslim Brothers*, Oxford University Press, London.1969. p 30

طرزِ عمل کو بہ تکرار 'قدامت پرستی' اور 'روایت پرستی' کہنا دراصل اصطلاحات کو گڈمڈ کر کے قارئین کی فکر کو پراگندہ کرنا ہے۔ جس طرح امام ابن تیمیہ نے اپنے دور کی روایت پرستی کو رد کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ نہ صرف مختلف تعبیراتِ فقہ حتیٰ کہ صحابہ کرام کے اجماع کو بھی وہ مقام نہیں دے سکتے جو مقام اتباع قرآن وسنت کا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فقہ کے تخلیقی عمل کو اجماعِ صحابہ کا پابند بھی کرنا پسند نہیں کیا۔ یہ طرزِ فکر ہر زاویۂ نظر سے 'انقلابی' اجتہادی تھا اور روایت پرستی کے رد پر مبنی تھا، لیکن بہت سے حضرات نے اسے 'سلطنت' کا عنوان دے کر بزرگوں کی اطاعت کہنا شروع کر دیا۔ بالکل اسی طرح امام البنا نے سلف صالح سے پوری عقیدت کے باوجود دورِ جدید کے معاملات میں اجتہاد پر زور دیا۔ مولانا مودودی کا بھی یہی جرم روایت پرست فقہا اور قدامت پسند صوفیا کے نزدیک ناقابل معافی فعل تھا کہ وہ معاشی، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور قانونی معاملات میں براہِ راست قرآن وسنت کی روشنی میں جدید حل تلاش کر کے ایک اسلامی ریاست اور معاشرے کی تشکیل چاہتے تھے۔

امام البنا اور سید مودودی کا حالات کا تجزیہ اور معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی مسائل کا قرآن وسنت کی روشنی میں حل تلاش کرنا نہ صرف روایت پرست فقہا اور قدامت پرست صوفیا بلکہ جدیدیت کے علم بردار مغربی مفکرین کے لیے بھی قابل قبول نظر نہیں آتا۔ اسی لیے قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کو، نامعلوم خدشات اور وجوہ کی بنیاد پر یکا یک بنیاد پرستی کی دعوت کا عنوان دے دیا جاتا ہے:

"Thus Banna's reaction to the crisis milieu was to advocate a return to the basis of Islam the call to fundamentlism.Banna's da'wah was a direct descendent of earlier revival movements.[8]

بحرانی حالات میں حسن البنا کا ردعمل اسلام کی اصل کی طرف رجوع کی وکالت تھا، یعنی بنیاد پرستی کی طرف دعوت۔ حسن البنا کی دعوت ماقبل احیائی تحریکوں کا راست ورثہ تھی۔

8- R.Harain Dekmejian, *Islam in Revolution Fundamentalism in the Arab World,* Syracuse University Press, London, 1985, P 80.

بنیاد پرستی اپنے اصطلاحی یورپی پس منظر میں مغربی لادینی تہذیب کے لیے ایک خطرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بنیاد پرستی کی اصطلاح کا تعلق اسلام سے ہو یا عیسائیت سے، ہر شکل میں یورپی ذہن اس کے ساتھ نباہ کرنے سے اپنے آپ کو قاصر پاتا ہے، جب کہ سادہ لوح مسلمان مفکرین بنیاد پرستی کے لفظی مفہوم یعنی دین کی بنیادی تعلیمات پر عمل کرنے کو اس کا صحیح مفہوم سمجھتے ہوئے یورپی ذہن کی اس نفسیاتی بیماری کا صحیح طور پر ادراک نہیں کرپاتے، بلکہ بعض اوقات فخر سے کہتے ہیں کہ "الحمد للہ ارکان اسلام پر عمل کرتے ہیں اس لیے بنیاد پرست ہیں"۔ مفاہیم کا یہ غلط اختلاط ایک بڑی فکری رکاوٹ بن کر مغرب کو ایسے نتائج اخذ کرنے پر آمادہ کردیتا ہے جن کا حقیقتِ واقعہ سے کوئی تعلق نہیں پایا جاتا اور سادہ لوح مسلم مفکرین بھی مغربی فکر کی بعض فنی اصطلاحات سے کماحقہٗ واقفیت نہ ہونے کے سبب اس مسئلے کو سلجھانے میں کوئی پیش رفت نہیں کرپاتے۔

امام البنا جس تصوف کے قائل ہیں وہ قوم کو جگانے والا، تزکیہ نفوس کے ذریعے معاشرتی عدل قائم کرنے والا اور مظلوم کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے جہاد پر آمادہ کرنے والا عمل ہے۔ اسی بنا پر ان کے حلقہ ہائے ذکر قائم کرنے اور اخوان کو الماثورات کا اہتمام کرنے کی ہدایت کے باوجود ان کی جو تصویر کشی مغربی مفکرین کرتے ہیں وہ نہ صرف مبالغہ آمیز بلکہ گمراہ کن حد تک غلط ہے۔ دو معروف تصنیفات ہماری رائے کی توثیق کرتی ہیں۔ ایک، اسحاق موسیٰ الحسینی کی تصنیف، جو اخوان المسلمون کی تحریک پر سند کا درجہ رکھتی ہیں۔[9] دوسرے، استاذ سعید حویٰ کی تصنیف الاخوان المسلمون بھی اس پہلو پر مستند اور براہ راست معلومات فراہم کرتی ہے۔[10]

بنیادی طور پر مغربی مصنفین گھوم پھر کر جس پہلو کو اجاگر کرتے ہیں، اس کا تعلق یورپ کی تاریخ کے بعض اہم ادوار سے ہے۔ ان کے خیال میں یورپ کی معاشی، علمی، اور سیاسی ترقی واستحکام کا تعلق براہ راست مذہب کو پس پشت ڈال کر زندگی کے معاملات میں مادی اور ٹکنالوجیکل ترقی کو رہنما بنانے سے ہے۔ اس لیے اسلامی تحریکات کا احیاے دین کی دعوت دینا ان اہلِ مغرب کے

9- Ishaq Musa al Hussain, *The Muslim Brothers,* Beirut, al-Bayan, 1956, P 4, 9,11,92,97,160,168.

10- Saeed Hawwa, *The Muslim Brothers* translated by Abdul Karim Shaikh'Delhi, Hindustan Publications, 1983.

نزدیک تاریک ماضی کی طرف لوٹنے کے مترادف ہے اور اسی بنا پر وہ ان تحریکات کو بنیاد پرست قرار دیتے ہیں۔ امام البنا نے اپنے رسائل میں یہ بات وضاحت سے بیان کی ہے کہ ان کا تصور دین، روایتی مذہبیت اور روایتی روحانیت دونوں سے مختلف ہے۔ وہ سید مودودی کی طرح دین کی شامل و کامل تعریف کرتے ہیں اور مذہب کو محض عبادات اور رسومات تک محدود تصور نہیں کرتے۔

اس پہلو سے دیکھا جائے تو دونوں تحریکات میں غیر معمولی فکری قربت کے باوجود انتظامی اور حکمت عملی کے بعض امور میں جزوی اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو چیز دونوں تحریکات کا امتیاز کہی جاسکتی ہے وہ دونوں کے قائدین میں غیر معمولی قوت کار اور شخصیت کی جاذبیت ہے، جس کی بنا پر البنا ہزارہا ارکان کے لیے ایک مرشد اور رہنما کی حیثیت اختیار کر گئے۔ بعض مغربی مصنفین بھی اس راز سے واقف نظر آتے ہیں اور برطانوی مستشرق بشپ کینتھ کریگ اس طرف اشارہ کرتا ہے:

" The secret of its success lay in the force and dedication of its Ideas and in the extraordinary energy almost in its quality of al-Banna himself.He combined the meticulousness of a watch maker with the drives of a prophet.[11]

اس کی کامیابی کا راز اس کے نظریات کی طاقت اور خلوص اور حسن البنا کی طرح کی غیر معمولی توانائی تھا۔ ان میں ایک گھڑی ساز کی باریک بینی اور ایک نبی کی قائدانہ قوتوں کا امتزاج تھا۔

اگر غور کیا جائے تو ان دو صفات سے متصف شخص کو جنگ جو یا شدت پسند کہنا ایک منطقی تضاد ہی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن امام البنا کی دعوت و شخصیت سے واقفیت کے باوجود تان آ کر ٹوٹتی اسی بات پر ہے کہ البنا دور جدید میں پائی جانے والی تشدد پسند تحاریک کے محرک تھے۔ امام البنا کا معاشرتی اصلاح کا تصور خود بعض مغربی مستشرقین کی زبان میں کچھ یوں نظر آتا ہے کہ امام البنا کی دعوت کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ قرآن کی جدید تعبیر کی ضرورت ہے اور سائنسی حقائق کے علم کے ساتھ قرآن کے

11-Kenneth Cragg, *Counsels in Contemporary Islam,* Edinbourgh Edinbrough University Press, 1965, P 113.

مفہوم کو بیان کیا جانا چاہیے۔ ثانیاً، مغربی سامراج سے نجات کی خواہش کا یہ مطلب نہیں کہ مغربی ایجادات اور تحقیقات سے استفادہ نہ کیا جائے۔ ثالثاً، سرمایہ دارانہ اور اشتراکیت پر مبنی معاشی نظام سے نکل کر ایک سرمایہ کار (enterprenuer) کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ وسائل تک دسترس حاصل کرے اور معاشی میدان میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ رابعاً، امت کے اندر مسلکی اختلافات سے بلند ہو کر صرف قرآن و سنت کی بنیاد پر یک جہتی کا قیام عمل میں لایا جائے، خامساً، اسلامی معاشرے کو خود کفیل بنانا تا کہ وہ فطری انداز میں ترقی کر لے۔ سادساً، قومی افق پر اعتماد اور قومی صفات کا پیدا کرنا، تا کہ سامراجی دور کے منفی اثرات سے نجات حاصل کی جا سکے۔[12]

البنا کی دعوت کو سمجھنے اور اتنے اچھے انداز میں بیان کر دینے کے بعد بھی اگر یہی مغربی مصنفین یہ نتیجہ نکال بیٹھیں کہ البنا ایک 'جنگ جو'، 'تشدد پسند' رہنما تھے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یعنی مستشرقین نے البنا کی شخصیت کے حوالے سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو تعریفی بھی ہیں اور ان کی من مانی تعبیر بھی کی جا سکتی ہے، مثال کے طور پر:

"Hassan al-Banna, more than any Individual, can be considerd the atvair of the twentieth Century Sunni revivalism. He was the unique embodiment of the Sufi spiritualist, Islamic scholar and activist leader who possessed a rare ability to evoke masses., support by translating doctrinal complexities into social action.[13]

کسی بھی فرد سے زیادہ' حسن البنا کو ۲۰ویں صدی کے سنّی اسلام کے احیا کا روحِ رواں قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ صوفی روحانی شیخ، مفکرِ اسلام، اور سرگرم قائد کا منفرد اظہار تھے

12-Kenneth Cragg, مندرجہ بالا حوالہ، p 144-117

13-R.Hrain Dekmejian , *Islamic Revolution, Fundamentalism in the Arab World*, Syracuse, 1969. p.80-81.

جو عوام کو اُبھارنے اور عقیدے کی پیچیدگیوں کو عوامی اقدامات میں تبدیل کرنے کا شاذ ملکہ رکھتے تھے۔

امام البنا کی ان قائدانہ روحانی صفات کی بنا پر اسی مصنف کا یہ تبصرہ ہے کہ مشہور مغربی ماہر نفسیات ارکسن (Ereckson) نے ایک متاثر کرنے والے قائد کی جو صفات بتائی ہیں وہ سب امام البنا میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

امام البنا نے جس تدریجی حکمت عملی سے اپنی دعوت کا آغاز کیا اور ایک وسیع تر حلقہ کو براہِ راست مخاطب کیا، وہ انبیا کے طریقِ دعوت کے عین مطابق نظر آتا ہے۔ البنا نے نہ صرف عوام الناس، وکلا، انجینیروں، اطبا، تاجروں بلکہ خود فرماں رواؤں کو دعوتی خطوط کے ذریعے اپنی جماعت میں شمولیت کی دعوت دی بلکہ ایک مرحلے میں فوج کے نوجوان افسران میں دعوت کی مقبولیت اس حد تک پہنچی کہ ۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب میں اخوان کی حیثیت ایک شریک کار کی قرار پائی۔

اگر تقابلی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ حکمت عملی سید مودودی کی تجویز کردہ حکمت عملی سے کچھ مختلف نظر آتی ہے۔ سید مودودی ایک نظریاتی جماعت اور برسراقتدار گروہ میں ایک فاصلے کے قائل نظر آتے ہیں اور وقت کی قید سے آزاد ہو کر ایک طویل فریم ورک میں فرد، خاندان، معاشرے اور ریاست میں تبدیلی و اصلاح کے حوالے سے بے انتہا پرامید نظر آتے ہیں، جب کہ حسن البنا نے اس اصولی موقف کے ساتھ زمینی حقائق کو اہمیت دیتے ہوئے تبدیلی قیادت کے عمل کے جلد واقع ہونے کے لیے بعض مفاہمتی اقدامات کو اختیار کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کیا۔

اس کے باوجود رچرڈ پی مچل کا خیال ہے کہ، اگرچہ البنا نے اسلامی معاشرے کے ساتھ اسلامی ریاست کے قیام پر یکساں زور دیا، لیکن وہ اسلامی ریاست سے کیا مراد لیتے تھے، اس میں نظمِ حکومت کس قسم کا ہوگا، اس کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کس نوعیت کے ہوں گے؟ کیا مغربی سیکولر جمہوریت کے بعض عناصر جوں کے توں اسلامی ریاست میں شامل کر لیے جائیں گے۔؟ غرض اس نوعیت کے سوالات جو تفصیل طلب ہیں، ان کے بارے میں امام البنا نے کسی متعین رائے کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے مقابلے میں سید مودودی نے اسلامی ریاست کے حوالے سے ایک

جامع اصولی اور عملی نقشہ مرتب کیا، اور دستوری اور انتظامی حیثیت سے جو تبدیلیاں لانی ضروری تھیں ان پر قلم اٹھایا۔[۱۴]

حسن البنا کو حالات کا پورا علم تھا اور اپنی قوت کا اندازہ بھی تھا۔ اس بنا پر انھوں نے حالات کو تبدیل کرنے میں جلد بازی کی جگہ ایسی حکمت عملی اختیار کرنا چاہی جو دور رس نتائج پیدا کر سکے۔ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہو سکے یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ لیکن یہ بات شواہد کی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ یہ تدریجی حکمت عملی ایک وسیع تر وقت کے فریم ورک سے وابستہ تھی۔[۱۵]

مچل کی اس رائے سے ہمیں واضح اختلاف ہے کہ چونکہ بعض سیاسی مسائل پر امام البنا کی رائے متعین نہ تھی یہ قیاس کر لیا جائے کہ اسلامی معاشرت اور ریاست کے بارے میں امام البنا کے ذہن میں کوئی نقشۂ کار ہی نہ تھا۔ امام البنا اپنے دور میں حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد ایک اصلاحی تحریک کو لے کر اٹھے، جسے مسلم امت کی سیاسی اور معاشی زبوں حالی کا پورا ادراک تھا۔ اس مناسبت سے علمی حلقوں میں اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے علی عبدالرازق کی کتاب نظام الحکم فی الاسلام جس میں انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن وسنت سے کسی واضح اسلامی ریاست کا نقشہ نہیں بن سکتا، زیر بحث تھی، جب کہ رشید رضا نے خلافت کے عنوان پر ایک عالمانہ کتاب لکھ کر یہ سمجھانا چاہا کہ کس طرح تاریخ کے حوالے سے اسلامی ریاست کا وجود ممکن ہے۔ اس لیے شیریں ہنٹر کا یہ خیال یا لیری پوسٹن کا یہ سمجھنا کہ امام البنا کے سامنے معاشرے اور ریاست کے حوالے سے کوئی واضح منصوبہ بندی اور نظام کا نقشہ موجود نہ تھا[۱۶] ایک گمراہ کن تصور نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ امام البنا نے اسلامی ریاست کے عنوان سے کوئی کتاب نہ لکھی ہو، لیکن ان کی دعوت کا بنیادی ہدف معاشرے کے ساتھ ساتھ ریاست کی اصلاح اور

۱۴- ملاحظہ ہو اسلامی ریاست از سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرتب: پروفیسر خورشید احمد، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور

15-Shirin Hunter , ed . *The Politics of Islamic Revivalism*, Indiana University Press1988, p 29-30.

16-Lary Posten, *Islamic Da`wah in the West :Muslim Missionary Activities,and Dynamics of Conversion to Islam*, Oxford University Press, 1992, p 69.

تبدیلی قیادت واقتدار تھا، جو ان کی دیگر تحریروں میں واضح نظر آتا ہے۔

امام البنا کی شخصیت، نظام تربیت اور خصوصاً اذکار اور تزکیۂ نفس پر توجہ پہ غور کیا جائے تو آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کی ابتدائی تربیت اور امام غزالی سے متاثر ہونے کی بنا پر ان کا رجحان تصوف کی طرف رہا، لیکن یہ وہ تصوف نہ تھا جو معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کو اہمیت نہ دیتا ہو۔ البتہ مغربی مفکرین کو اس میں جو دقت پیش آتی ہے وہ امام البنا کے مائل بہ تصوف ہونے کے باوجود سیاسی زندگی میں فعال ہونا، پھر بذات خود الیکشن میں حصہ لینا اور اپنی دعوت کے نکات میں اس بات کا کھل کر اعتراف کرنا کہ ہم اسلامی ریاست کا قیام چاہتے ہیں۔

یہی وہ پہلو ہے جس کی بنا پر ۲۰ویں صدی کی اسلامی تحریکات کو Political Islam یا سیاسی اسلام، کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ یہ کام نہ صرف مغربی مصنفین بلکہ ان سے متاثر بعض معروف مسلم دانش وروں نے بھی کیا، جو اسلام کی محض روایتی مذہبی تعریف پر یقین رکھتے تھے۔ وہ اس پورے عمل کو دین کی سیاسی تعبیر قرار دیتے ہیں۔ امام البنا اور ان کی تحریک کے بارے میں یہ خیال درست نظر نہیں آتا کہ وہ دور جدید میں اسلامی ریاست کا واضح تصور نہیں رکھتے تھے۔ ان کی تحریرات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی حاکمیت، شورائیت، امانت اور صلاحیت کی بنیاد پر قائم ہونے والی ریاست کے قائل تھے۔ اگر امام البنا کو زندگی کی مزید مہلت ملتی تو وہ لازمی طور پر ان اصولوں پر مبنی مفصل خاکہ تیار کرتے۔ اس کے مقابلے میں سید مودودی کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ وہ نہ صرف اصولی طور پر بلکہ عملی طور پر، ایک اسلامی ریاست کے خدوخال، اس میں پارلیمنٹ، عدلیہ اور انتظامیہ کے اختیارات اور اہل کاروں کی خصوصیات کے حوالے سے اپنے خیالات کو تفصیل سے تحریری شکل میں پیش کرسکے۔

امام البنا جس معاشرے اور ریاست کی تعمیر کے لیے کوشاں تھے، اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ ظاہر ہے یہ کام ریاست کی قوت نافذہ کے بغیر نامکمل رہتا، نہ صرف یہ بلکہ ان کی جانب سے بار بار کھلے الفاظ میں بیرونی سامراج سے نجات کی دعوت میں بھی یہ بات شامل تھی کہ مقامی آمروں، بادشاہتوں اور موروثی نظام کی جگہ قرآن وسنت کا دیا ہوا نظام نافذ ہونا چاہیے۔

اپنے آخری ایام میں ان کو اس بات کا احساس ہو چلا تھا گو بعض حالات میں عسکری تنظیم کے بغیر مسائل کا حل ممکن نہیں ہوسکتا جس طرح کہ فلسطین میں اخوان المسلمون نے عملاً حصّہ لے کر مسجد اقصیٰ کا دفاع کیا، لیکن اندرونی معاملات میں مسائل کا حل، سیاسی حکمت عملی، مکالمہ اور مسلسل تعلیم و تربیت ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ امام البنا اور ان کی تحریک کو اپنی دعوت کے اصولوں کے لیے ایک امن پسند، صلح جو اور داعیِ اصلاح ماننے کے باوجود، صرف جہادِ فلسطین میں شرکت اور برطانوی اور اطالوی سامراج کی مخالفت کی بنا پر بنیاد پرست اور شدت پسند کہا گیا۔ بالکل اسی طرح پاکستان میں جہادِ کشمیر کی حمایت کرنے والی جماعت اسلامی کو بنیاد پرست اور شدت پسند ہونے کا الزام دیا جاتا رہا۔ گو زمینی حقائق اس بات کے گواہ ہیں کہ ان تحریکاتِ اسلامی نے ہمیشہ دستوری ذرائع سے اصلاح حال اور تبدیلیِ اقتدار کی دعوت دی اور اس بنا پر ان تحریکات کا جمہوریت پسندی کا ریکارڈ وقت کی سب سے زیادہ جابر و ظالم ریاست امریکا سے کئی ہزار گنا زیادہ جمہوری اور شفاف ہے۔

امام البنا جس طرح اپنی تعلیمی، تذکیری اور تربیتی حکمت عملی کے نتیجے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ افراد میں عوام الناس کی سطح پر اپنی دعوت کو پھیلانے میں کامیاب ہوئے، اس کی کوئی اور مثال ۲۰ویں صدی میں نظر نہیں آتی۔ دیگر تحریکاتِ اسلامی کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے اور ان کی قیادت کو تجزیہ کرنے کے بعد یہ سوچنا چاہیے کہ کیا وجہ ہے کہ نصف صدی سے اوپر کام کرنے کے باوجود عوام میں ان کا وہ نفوذ اس درجے میں کیوں نہ ہوسکا، جو امام البنا نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۸ء تک محض ۲۰ سال میں حاصل کرلیا تھا اور جب ۱۹۴۹ء میں وہ شہید کیے گئے تو اخوان المسلمون دنیاے اسلام کے نقشے پر ایک بین الاقوامی تحریک بن چکی تھی۔

٭٭٭

میں ہم سفر رہا

شیخ عبدالمعز عبدالستار ○

○ سوال: اخوان اور امام البنا سے آپ کا تعارف کب اور کیسے ہوا؟

● جواب: دور طالب علمی ہی سے مسئلہ فلسطین کے ساتھ ہمارا جذباتی تعلق تھا۔ انھی دنوں خبر ملی کہ عزالدین القسام کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس وقت تک ہم اخوان المسلمون کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ طلبہ نے فیصلہ کیا کہ فلسطین کے لیے فنڈ جمع کر کے جناب محبّ الدین الخطیب کے ذریعے عزالدین القسام تک پہنچا دیا جائے۔

اسی دوران، امام حسن البنا کی جانب سے محمد البنا اور محمود الحافظ ہمارے پاس آئے۔ امام کا طریقہ کار تھا کہ جب بھی گرمیوں کا موسم آتا تو آپ اپنے ساتھیوں کو مختلف علاقوں میں داعی بنا کر بھیجتے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ ہمارے نصیب میں حسن البنا کے بھائی محمد البنا اور ان کے ساتھ محمود الحافظ آئے۔ ان کے پاس اخوان المسلمون کا دعوتی لٹریچر بھی تھا۔

اخوان المسلمون کے لٹریچر میں اخوان کا یہ عقیدہ واضح کیا گیا تھا کہ: ''ہمارے تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نبی ہیں۔ جزا و سزا کا دن برحق ہے۔ قرآن کریم اللہ کی آخری کتاب ہے، جس میں دین اور دنیا کی بھلائی ہے۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو قرآن کریم کی جماعت میں شامل کروں گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام

○ ملاقات عبدالغفار عزیز۔ ترجمہ: عزیر صالح

رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت کا مطالعہ کروں گا"۔

میں اس وقت ثانویہ کے چوتھے سال میں تھا۔ محمد البنا بھی میرے ساتھ چوتھے سال میں تھے، لیکن اگلے سال جب ہم ثانویہ سے فارغ ہوئے تو وہ شعبہ ادب میں چلے گئے اور میں نے کلیہ اصول الدین میں داخلہ لے لیا۔

میں بات کر رہا تھا کہ ہم نے فلسطین کے لیے فنڈ اکٹھا کیا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ یہ فنڈ محب الدین الخطیب کو بھیجا جائے۔ محب الدین الخطیب الفتح جریدہ نکالا کرتے تھے۔ انھوں نے مسئلہ فلسطین کے متعلق لکھا اور لوگوں کو اس مسئلے کے حقیقی پس منظر سے روشناس کرایا۔ اس وقت مسئلہ فلسطین کے متعلق زیادہ تر دو ہی شخص محب الدین الخطیب اور رشید رضا لکھا کرتے تھے۔ محب الدین الخطیب الفتح میں اور رشید رضا المنار میں لکھا کرتے تھے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ خود عالم عرب میں بھی لوگ مسئلہ فلسطین سے بے خبر تھے۔

محمد البنا اور محمود الحافظ ہمارے پاس آئے اور کہا کہ: "فلسطین کے مسئلے سے ہمارا تعلق ہے۔ ہمارے اور مجاہدین کے درمیان روابط ہیں۔ ہم انھیں اسلحہ اور مالی امداد پہنچاتے ہیں۔ آپ بھی فنڈ اکٹھا کر کے دیں ہم آگے پہنچا دیں گے"۔ ان کے کہنے پر جمع شدہ فنڈ لے جا کر میں نے محب الدین الخطیب کے سپرد کر دیا۔ ان حضرات کا شمار اخوان المسلمون کے بنیادی، اہم ترین ارکان اور اوّلین داعیوں میں سے ہوتا تھا۔ انھوں نے مجھے اخوان المسلمون کی بعض کتابیں اور رسالے بھی دیے۔ پھر میں اپنے شہر واپس آ گیا۔

○ آپ اس وقت کہاں رہتے تھے؟

● ہم فاقوس میں تھے، فاقوس مشرقی ضلع اسماعیلہ سے صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ برطانوی افواج کی چھاؤنیاں فاقوس کے قریب تھیں۔ سمگلر، برطانوی فوجی چھاؤنیوں سے اسلحہ اسمگل کر کے ہمیں فروخت کرتے تھے، خود ہندستانی فوجی بھی ہمیں اسلحہ بیچ دیتے تھے، ہم یہ اسلحہ فلسطین پہنچاتے تھے۔

○ آپ بتا رہے تھے کہ آپ نے اخوان المسلمون کا لٹریچر پڑھا؟

● جی ہاں، اخوان کے ساتھیوں سے ملنے والی کتب کے بعد میں نے اخوان المسلمون

کے مرکز سے مزید کتب لیں، اخوان کا مرکز اس وقت 'شارع سد' پر سیدہ زینب کے علاقے میں واقع ایک گھر میں تھا۔ ان گھروں کا شمار تاریخی اور آثار قدیمہ میں ہوتا ہے۔ گھر کا صحن بہت کھلا تھا۔ جہاں درخت اور پودے لگے ہوئے تھے۔ یہ گھر سڑک پر نہیں بلکہ گلی کے اندر تھا، اس وقت تک اخوان المسلمون کے ساتھ ہمارا تعلق صرف اتنا ہی تھا۔ پھر ایک سال گزر گیا۔ میری خواہش تھی کہ امام البنا سے ملاقات ہو لیکن سال بھر نہ میں امام حسن البنا سے مل سکا اور نہ میرا اخوان المسلمون سے مزید رابطہ ہوا۔ پھر میں جامعہ الازہر کی کلیہ اصول الدین میں داخل ہو گیا۔

حج کے موقع پر جامعہ ازہر نے حج کے لیے ازہری طلبہ کا ایک وفد بھیجنے کا اعلان کیا۔ حکومت نے اس وفد سے تعاون کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ بحری جہاز کی کمپنی وفد سے آدھا کرایہ وصول کرے گی۔ مصری حکومت نے وفد میں شریک ہر فرد کو ۱۰ مصری پاؤنڈ دینے کا اعلان کیا۔ دوسری جانب سعودی حکومت نے ٹیکس وغیرہ نہ لینے کا اعلان کیا۔

ہمارے لیے یہ فریضہ حج ادا کرنے کا سنہری موقع تھا۔ میں بھی حج وفد میں شامل ہو گیا۔ ہمارے دوست شیخ خلف السید نے حج پر جانے والوں کو اپنے گھر پر چائے کی دعوت دی۔ وہ اس وقت ہمارے ساتھ طالب علم تھے۔ بعد میں وہ مجمع البحوث الاسلامیہ کے ڈائرکٹر بنے۔ چائے کی نشست کے دوران میں انھوں نے بتایا کہ الشیخ حسن البنا نے جامعہ ازہر کے حج وفد کے لیے دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ آپ کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے کہا اللہ تیرا بھلا کرے میری تو ان سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ تم نے موقع ضائع کر دیا، چائے کا کپ تو بعد میں کبھی پی لیتے لیکن ان سے ملاقات ---؟ انھوں نے کہا کہ فکر نہ کریں شیخ حسن البنا حج وفد کو الوداع کہنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر بھی جائیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خود طلبہ اور اساتذہ کے وفود کو خدا حافظ کہیں۔

مصر کی کسی جماعت یا تنظیم نے حاجیوں کو دعوت نہیں دی تھی۔ صرف امام حسن البنا نے حج پر روانہ ہونے والوں کی دعوت کا اہتمام کیا، انھیں ریلوے اسٹیشن پر الوداع کہا۔ ہم اسٹیشن پر امام حسن البنا سے ملے۔ میں ان سے مل کر بے پناہ خوش تھا۔ امام حسن البنا، کی شخصیت سنت کے مطابق ڈھلی ہوئی تھی، ان کی داڑھی سیاہ تھی۔ انھوں نے ملتے ہوئے مجھے گلے لگا لیا، میرے لیے مسنون دعا پڑھی: استودعکم اللّٰہ دینک و امانتک و خاتم عملک و زودک اللّٰہ بالتقوی۔

میں آپ کے دین آپ کی امانتوں اور آپ کے انجام کار کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کے تقویٰ میں اضافہ فرمائے۔ پھر انھوں نے مجھے وہی بات کہی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے کہی تھی۔ انھوں نے فرمایا: "اپنی دعاؤں میں اپنے بھائی کو نہ بھولنا"۔ میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔

امام حسن البنا کا ایک تعارف ان کی کتب پڑھ کر ہوا تھا، لیکن میں نے انھیں تصوراتی طور پر پہچانا تھا، حج پر جانے والے ان کے ساتھیوں کے درمیان رہ کر مجھے خود امام البنا کو عملی طور پر جاننے کا موقع ملا۔ جیسے ہی ہم بندرگاہ پہنچے تو کچھ نوجوان ہماری بس کی طرف لپکے۔ انھوں نے ہمارا سامان اتارنا شروع کر دیا۔ ان میں سے بعض نوجوان بس کے اوپر چڑھ گئے تھے اور وہ نیچے والوں کو سامان پکڑاتے۔ میں نے سمجھا شاید یہ بحری جہاز کے ملازمین ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اخوان المسلمون کے اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے، جو اپنے بھائیوں کی بے لوث خدمت کے لیے کوشاں تھے۔ ہم بحری جہاز پر سوار ہو گئے۔ جہاز والوں نے ہماری پذیرائی کی۔ ہم ازہری طلبہ کی مالی حالت کمزور تھی، اس لیے تیسرے درجے میں سوار ہوئے۔ جامعہ کے اساتذہ صاحب استطاعت تھے، وہ دوسرے درجے میں سوار ہوئے۔ ہمارا سامان: ایک تکیہ، ایک کمبل، ایک جاے نماز اور ایک بیگ پر مشتمل تھا۔ اخوان المسلمون کے ان نوجوانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو قرآن نہ پڑھتا اور تہجد نہ ادا کرتا ہو۔ بحری جہاز میں ایک کشادہ صحن تھا۔ یہ تمام نوجوان ہمارے ساتھ صحن میں باجماعت نماز ادا کرتے۔ ان میں سے ایک شخص کو اذان دینے کا بہت شوق تھا، وہ ڈاکٹر عبدالمنعم فتحی تھے۔ عبدالمنعم فتحی اس وقت میڈیکل کالج میں سال اول کے طالب علم تھے۔ بعدازاں وہ میڈیکل کالج کے فیکلٹی ڈین بنے۔ اشتراکی روس میں ان کے ہاتھ پر لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔

○ امام حسن البنا نے آپ کو حج کے لیے الوداع کہا، آپ کی ان سے یہ پہلی ملاقات تھی---؟

● جی ہاں یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ حج کے سفر کے دوران میں، میں نے اخوان المسلمون کے نوجوانوں کے حسن سلوک سے حسن البنا کی شخصیت کو پہچانا۔ ان نوجوانوں میں

کس قدر جذبہ تعاون تھا اور ان میں کس قدر شرافت تھی، وہ بھائیوں کی پکار پر مدد کے لیے کس طرح بے چین ہو جاتے تھے۔

○ ظاہر ہے آپ اس وقت تک اخوان المسلمون میں شامل نہیں ہوئے تھے؟

● نہیں میں اس وقت تک اخوان المسلمون میں شامل نہیں ہوا تھا۔ البتہ زبانی طور پر تو میں اخوان المسلمون میں اس وقت شامل ہوگیا تھا جب محمد البنا ہمارے پاس آئے تھے۔ ہمارا ان سے رابطہ تھا اور انھی کے ذریعے اخون المسلمون کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ ہم نے مقامی تنظیم بھی بنائی تھی۔ میرے ایک ساتھی کو اس تنظیم کا خزانچی اور دوسرے ساتھی کو صدر بنایا گیا تھا۔ ہمارے پاس اخوان المسلمون کا لٹریچر اور ترانے تھے، اس کے علاوہ ہمارے علاقے میں دعوت کا کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا۔ بعد میں ہم الگ الگ کالجوں میں چلے گئے تھے۔

جب ہمارا قافلہ سعودی عرب پہنچا تو سعودیہ کے شاہ عبدالعزیز کی جانب سے ہماری رہایش کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ وفد ۳۵ افراد پر مشتمل تھا جس میں ۴ اساتذہ اور باقی طلبہ تھے۔ البتہ ازہر یونی ورسٹی کے دوسرے وفود کو شامل کر کے یہ تعداد ایک سو تک پہنچ جاتی تھی۔ شاہ عبدالعزیز کی جانب سے ترکوں کے اسکول کی ایک بڑی عمارت میں ہماری رہایش کا انتظام تھا۔ سعودی عرب کے فوجی جوانوں کی حالت خستہ تھی۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سعودی عرب میں تیل کے ذخائر دریافت نہیں ہوئے تھے۔

○ یہ کس سال کی بات ہے؟

● یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ بادشاہ نے ہماری مہمان داری کی، ہمارے لیے ایک سو بکرے، چینی، چائے، قہوہ اور دیگر اشیاے خورد و نوش بھیجی گئیں۔ ہم اکٹھے ایک جگہ رہے۔ اخوان المسلمون کے ساتھیوں نے کھانا پکانے، بازار سے سامان لانے اور برتن وغیرہ دھونے کے لیے نظام کار وضع کیا۔ جس کے تحت مختلف ساتھیوں کے حصے میں مختلف کام آئے۔ کسی کی ذمہ داری کھانا پکانا تھا۔ کسی کی برتن دھونے اور بازار سے سامان لانے کی۔ میں برتن دھونے والی ٹیم میں تھا۔ میری باری کے دن اخوان المسلمون کا ایک نوجوان میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں تمھاری

جگہ پر برتن صاف کر دیتا ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ”اس کی ضرورت نہیں ہے، میں برتن دھو سکتا ہوں“۔ اخوان المسلمون کے نوجوان دوسروں کی خدمت میں اپنے آپ کو مصروف رکھتے۔ امام حسن البنا کے تربیت یافتہ نوجوانوں اور یونی ورسٹی کے دوسرے طلبہ کے درمیان بہت فرق تھا۔ سامان خورد ونوش میں ہمارے پاس اس وقت صرف بس بکرے ہی تھے۔ آج کی طرح دیگر ممالک کی کوئی چیز سعودی عرب میں نہیں ملتی تھی۔ دوسرے طالب علم کھانے میں طرح طرح کے عیب نکالتے۔ اخوان کے ساتھی انھیں سمجھاتے کہ: ”ہم یہاں پر صرف کھانے کے لیے نہیں آئے۔ یہ لوگ جو ہمیں کھانے فراہم کر رہے ہیں، ہماری مہمان نوازی کر رہے ہیں، ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، ان کے لیے دعا کرنی چاہیے“۔ اخوان کے نوجوان کھانے میں کبھی کوئی عیب نہ نکالتے تھے۔ انھیں اگر کھانا پسند ہوتا تو کھا لیتے ورنہ چھوڑ دیتے۔ اگر تاخیر سے پہنچنے کے باعث ان میں سے کسی ساتھی کو کھانا نہ ملتا تو کبھی یہ نہ پوچھتے ان کا کھانا کہاں ہے۔ جب پھل وغیرہ تقسیم کیے جاتے اور کسی ساتھی کو پھل نہ ملتا تو وہ کبھی جھگڑا نہ کرتے۔ ان نوجوانوں کے صبر، شکر، ایثار اور ہمدردی کے بہت ہی حیران کن قصے ہیں، کہاں تک ان تفصیلات کا تذکرہ جاری رکھوں!

○ جی---آپ جاری رکھیے یہ بہت مفید اور دل چسپ باتیں ہیں۔

● ہم فریضہ حج کی ادا کر کے فارغ ہوئے تو مدینہ منورہ جانے کی تیاری کی۔ تمام طالب علم بسوں پر سوار ہو گئے۔ ہمیں کسی بس میں نہ بیٹھنے دیا گیا۔ جس بس کے پاس جاتے وہ کہتے کہ: ”کوئی جگہ نہیں، یہ بس صرف شعبہ ادب کی ہے“۔ دوسری بس والوں نے کہا کہ: ”یہ کلیۃ العلوم کی بس ہے“۔ تیسری بس والوں نے کہا کہ: ”یہ میڈیکل کالج یا انجینیرنگ ڈیپارٹمنٹ کی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ منورہ روانگی کی تیاری ہے، لیکن بس پر سوار ہونے کے لیے جھگڑا ہو رہا ہے۔ چار و ناچار ہم اساتذہ کے پاس گئے اور پوچھا کہ ہماری بس کون سی ہے، شیخ غرباوی نے احمد امین سے کہا کہ ہم اکٹھے آئے ہیں اور اکٹھے واپس جائیں گے“۔ احمد امین نے جواب دیا: ”آپ کی بس موجود ہے۔ آپ اس میں جا کر سوار ہو جائیں“۔ ہم نے کہا کہ: ”لیکن وہ بس ہے کہاں ذرا ہمیں بھی دکھا دیں“۔ احمد امین نے کہا کہ: ”تم نے اس طرح بات کر کے میری بے عزتی کی ہے“۔ ہم نے جواب دیا کہ صرف اتنا ہی تو پوچھا ہے کہ ہماری بس کہاں ہے۔ اس

میں بے عزتی کی کیا بات ہے۔احمد امین نے کہا کہ ہمارے ہاں اس طرح بات کرنے کو بے عزتی سمجھا جاتا ہے۔غرباوی صاحب نے ہم سے کہا چھوڑیے، یہ لوگ نہیں جانتے کہ وہ اللہ کے نزدیک کتنی بڑی بات کے مرتکب ہو رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ومن یردفیه بالحاد بظلم نذقه من عذاب الیم۔ ”اس مسجد (حرام) میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا اسے ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے“۔ شیخ غرباوی ہمیں وہاں سے لے گئے۔ انھوں نے کمپنی سے بات کر کے بس کا انتظام کیا۔ہم سب سے آخر میں چلے لیکن یہ اللہ کا فضل و کرم تھا کہ سب سے پہلے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔اخوان المسلمون کے طلبہ نے جھگڑا کرنے والے طلبہ کو سمجھایا تھا کہ بس پر سوار ہونا ان کا بھی حق ہے، لیکن دوسرے طلبہ نے بات تک نہ سنی۔جن صاحب نے شیخ غرباوی سے کہا تھا کہ تم نے ہماری بے عزتی کی ہے، ان کی بس راستہ گم کر بیٹھی، اور تین دن تک صحرا میں بھٹکتی رہی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت مکہ سے مدینہ تک سڑک پختہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ گاڑیاں ریت پر چلتی تھیں۔ گردوغبار سے آگے جانے والی گاڑیاں نظر نہ آتی تھیں۔ بس کا ڈرائیور راستہ گم کر بیٹھا اور ایسی وادی میں پہنچ گیا جس کا نام وادی النار یعنی آگ کی وادی تھا۔ واللہ اس کا نام وادی جہنم تھا۔ان دنوں ہیلی کاپٹر وغیرہ بھی نہیں ہوتے تھے کہ صحرا میں گم شدہ گاڑیوں کو ان کے ذریعے تلاش کر لیا جائے۔گم شدہ گاڑی کی تلاش کے لیے بدوؤں کو بھیجا گیا۔ بالآخر تین دن کے بعد انھیں تلاش کر لیا گیا۔لیکن معلوم ہے بھوک اور پیاس سے ان کا حال کیا ہو چکا تھا؟ خورد و نوش کی تمام اشیا ختم ہو چکی تھیں اور وہ پینے کے لیے اپنا پیشاب تک برتن میں محفوظ کرنے پر مجبور تھے۔

اس وقت مدینہ منورہ کے دروازے شام کے وقت بند کر دیے جاتے تھے۔شام سے پہلے شہر میں داخل ہو گئے تو ٹھیک، ورنہ مدینہ میں داخلے کے لیے صبح تک انتظار کرنا پڑتا۔ہم غروب آفتاب سے پہلے مدینہ پہنچ گئے اور حکومت نے جہاں پر ہماری رہایش کا انتظام کیا تھا سیدھا وہاں چلے گئے۔ یہ قصہ اخوان المسلمون کے نوجوانوں کی سیرت کی ایک مثال ہے۔اُن نوجوانوں کی مثال ہے جنھوں نے امام حسن البنا سے تربیت حاصل کی۔ جو نیکی، بھلائی، تعاون، قربانی اور ایثار کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتے۔ وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے اور اللہ ان کا حامی و ناصر

تھا، سبحان اللہ۔

ہم حج سے واپس مصر آئے تو میری سب سے اولین خواہش اس شخصیت سے ملاقات تھی جنھوں نے ان نوجوانوں کو تربیت دی تھی۔ یہ نوجوان جو میری ڈیوٹی پر خود برتن صاف کرتے، جو میرا سامان اٹھاتے، جو باجماعت نماز ادا کرتے، جو قرآن پاک کی تلاوت کرتے، جو ذکر اللہ میں مشغول رہتے، جو تہجد پڑھتے، صبر اور شکر کے راستے پر چلتے، ان نوجوانوں کا شیوہ نیکی، بھلائی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔ انھی نوجوانوں کے شیخ سے ملنا میری سب سے بڑی خواہش تھی۔ میں اس وقت قاہرہ میں ثُمن روڈ پر مقیم تھا۔ اسی روڈ پر ایک طالب علم رہتا تھا، جمال عامر۔ وہ فیکلٹی آف فارمیسی کا طالب علم تھا اور امام حسن البنا کے نمایندے کی حیثیت سے ہمارے شہر کا دورہ بھی کر چکا تھا۔ ایک دفعہ اسی روڈ پر میری اس سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا تم کس جگہ مقیم ہو؟ میں نے بتایا کہ اسی شارع پر رہتا ہوں۔ اس نے کہا میرا گھر بھی یہیں پر ہے اور بتایا کہ آج منگل کا روز ہے۔ آج الشیخ حسن البنا کا ہفتہ وار درس ہے۔ میں نے اس پر بارك الله فيك کہا اور ہم درس سننے چلے گئے۔ اس وقت اخوان المسلمون کا مرکز (دارالاخوان) عقبہ میں تھا۔ عقبہ، قاہرہ کا سرسبز علاقہ ہے۔ مختلف علاقوں، عباسیہ مصرالجدید، الشافعی، سیدہ زینب اور شُبرہ سے آنے والی ٹرامیں یہیں آکر ملتی ہیں۔ اخوان اسی گھر میں آکر آپس میں ملتے تھے۔ یہ قدرے کشادہ مکان تھا۔ اس میں پانچ کمرے تھے اور ایک وسیع و عریض صحن تھا، جہاں پر کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور امام حسن البنا درس قرآن کریم دے رہے تھے۔ یہ مرکز از ہر روڈ کے ساتھ ملی ہوئی سڑک پر واقع تھا۔

○ یہ درس کس وقت تھا؟

● مغرب کی نماز کے بعد درس تھا۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے تو امام حسن البنا درس دے رہے تھے۔ ان کی گفتگو منظم و مرتب تھی۔ ان کے الفاظ گویا لڑی میں پروئے ہوئے موتی تھے۔ وہ بہت کم جذباتی ہوتے۔ ان کی گفتگو دل کو بھاتی اور عقل کو اپیل کرتی۔ وہ مسلمانوں کی عظمت اور اسلام کی بڑائی کی بات کرتے۔ ان کا اسلوب جدید تھا اور اس روایتی اسلوب سے ہٹ کر تھا جو ہم دوسری جماعتوں کے لوگوں اور علما کے خطبوں میں سنا کرتے تھے۔ اس وقت مصر کی جماعتیں فروعی

مسائل میں گھری ہوئی تھیں، ان کی دعوت چند مخصوص موضوعات تک محدود تھی۔ ایک جماعت صرف نماز اور سنت کی دعوت دیتی تو دوسری جماعت کا زور صرف عقیدے پر ہوتا، تیسری جماعت قبروں پر جانے سے روکنے کے لیے اپنی طاقت صرف کرتی۔ حتیٰ کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگاتے۔ جہالت عام تھی، لوگ ان کی باتوں میں آجاتے۔ لوگوں سے جو کچھ کہا جاتا، وہ جہالت کی وجہ سے مان لیتے تھے، مگر امام حسن البنا جو پیغام دے رہے تھے۔ اس میں عقیدے اور عبادت کی دعوت تھی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت تھی۔ مسلمانوں کے معیار کو بلند کرنے کی دعوت تھی۔

درس ختم ہوا تو ایسے محسوس ہوا کہ مجھ میں نئی روح پھونک دی گئی ہے۔ پھر ہم ان سے ملنے کے لیے آگے بڑھے۔ انھوں نے دو ماہ کے بعد بھی مجھے پہچان لیا۔ بڑی گرم جوشی سے گلے لگایا اور کہا خوش آمدید۔ امام کو محمد البنا نے ہمارے بارے میں بتا دیا تھا کہ یہ کچھ نوجوان ہیں جو جذبہ رکھتے ہیں اور انھوں نے فلسطین کے لیے فنڈ اکٹھا کیا ہے۔ اس طرح میرے بارے میں ان کو کچھ اندازہ تھا۔ دفتر سے نکلنے سے پہلے ہی میں ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکا تھا کہ: ''میرا ایمان اللہ پر ہے، میرا عمل میرے دین کے لیے ہے، مجھے اللہ کے راستے میں جہاد کرنا ہے۔ ایمان، عمل اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں''۔

○ **انھوں نے آپ سے بیعت کا کہا تھا یا آپ نے ان سے درخواست کی تھی؟**

● نہیں نہیں: میں نے خود ان سے بیعت کی درخواست کی تھی۔ انھوں نے ہم سے بیعت کا نہیں کہا تھا۔ جب ہم نے کہا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے ہمیں بیعت کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ ایمان، عمل اور جہاد کی اہمیت بتائی اور ہماری بیعت قبول کرلی۔ پھر ہم اخوان کے مرکز میں گھومتے پھرے۔ اس میں مختلف شعبے تھے۔ ایک شعبہ اسکاؤٹس کے لیے تھا۔ ایک شعبہ فلسطین کا تھا۔ ایک شعبہ عالم اسلام کے لیے تھا۔ مصر میں کوئی ایسی تنظیم نہیں تھی جو لوگوں کا اس طرح استقبال کرتی ہو۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ دارالاخوان میں ایک شعبہ فلسطین کے متعلق تھا۔ جس میں مسئلہ فلسطین کو اجاگر کرنے، یہودیوں کے بائی کاٹ کی مہم اور فنڈ اکٹھا کرنے کا کام ہوتا تھا۔ میں ذاتی طور پر مسئلہ فلسطین میں بہت دل چسپی لیتا تھا۔

پھر میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دن آیا۔ مصر میں میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ مصر کی ہر وزارت میں بڑے بڑے شامیانے لگائے جاتے جن میں محفل اذکار کا اہتمام ہوتا۔ سب لوگوں کے دل متوجہ ہوتے ہیں، ایسے میں انھیں سیرت کا حقیقی پیغام پہنچانے اور سمجھانے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس لیے اخوان المسلمون بھی ان تقریبات میں پوری گرم جوشی سے حصہ لیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس سال ہم نے ان تقریبات میں انگریزوں اور یہودیوں سے بائی کاٹ کے حوالے سے لٹریچر تقسیم کیا۔ برطانوی انگریزوں ہی نے یہودیوں کو سرزمین فلسطین دینے کا وعدہ کیا اور اس طرح عالم اسلام کے سینے میں خنجر گھونپا تھا۔ انگریزوں ہی نے مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہوئے فلسطین میں اس شجر خبیثہ کا بیج بویا تھا۔ انگریزوں ہی نے مال و دولت، اسلحہ اور ہر طریقے سے یہودیوں کی مدد کی تھی۔

○ آپ نے دارالاخوان کو دیکھا۔ امام حسن البنا کے ہاتھ پر بیعت کی، اخوان المسلمون سے منسلک ہونے کے بعد کیا سرگرمیاں رہیں؟

● یہودیوں کا بائی کاٹ کرنے کے حوالے سے شائع شدہ پمفلٹ اور پوسٹر تقسیم کرنے کی ذمہ داری لگائی گئی۔ پوسٹر پر ان تمام یہودیوں کے نام تھے جو اسکندریہ، قاہرہ، صعید یا دوسرے شہر وں میں تجارت کر رہے تھے۔ یہودی معدنیات، ادویہ، پرفیومز، کاسمیٹکس ہر قسم کا کاروبار کرتے تھے۔ اس پوسٹر پر مصر میں کام کرنے والی یہودی کمپنیوں کے نام تھے۔ میری اور صالح العشماوی کی ذمہ داری یہ پمفلٹ تقسیم کرنے اور پوسٹر لگانے کی تھی۔

○ صالح العشماوی اس وقت اخوان کے سیکرٹری تھے؟

● جی ہاں! صالح العشماوی اس وقت سیکرٹری تھے۔ وہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ہونے والے جلسوں میں پوسٹر تقسیم کرنے گئے۔ ان جلسوں میں مصر کے مختلف علاقوں کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ میری اور ایک اور ساتھی جن کا نام طاہر عبدالحسن تھا کے ذمے شارع ازہر کے کھمبوں اور دیگر جگہوں پر پوسٹر چسپاں کرنا تھا۔ اسی طرح ان مغربی علاقوں میں پوسٹر چسپاں کرنا تھے، جہاں پر یہودیوں کے محلے تھے۔ ہم پوسٹر لگاتے ہوئے جامعہ ازہر تک پہنچ گئے۔ جامعہ ازہر میں طلبہ کی بھرپور تعداد تھی اور وہ امتحانات کی تیاری کر رہے تھے۔ ہم جامعہ ازہر گئے تو

ہاسٹل میں مقیم ایک طالب علم نے کہا کہ: ''آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کو اجر دے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں''۔ وہ اصرار کر کے ہمارے ساتھ ہولیا۔ اس نے پوسٹر اٹھا لیے۔ طاہر عبدالمحسن پوسٹر لگانے میں میری مدد کرتے۔ ہم شارع ازہر پر پوسٹر لگانے کے بعد میدان کبری کے علاقے میں گئے۔ وہاں پر بجلی سپلائی کا ایک کمرہ تھا جس پر انگلش میں لکھا ہوا تھا danger یعنی خطرہ۔ ہم نے کہا خطرہ کیسا اس پر بھی پوسٹر لگاتے ہیں۔ جب ہم نے وہاں پوسٹر لگانا چاہا تو ایک پولیس والا آ گیا اور فرمانے لگا ''پوسٹر لگانا منع ہے''۔ ہم نے کہا نہیں یہ پوسٹر ممنوعات میں سے نہیں ہے یہ کوئی خراب پوسٹر نہیں بلکہ یہ تجارتی اطلاع سے متعلق ہے۔ اس نے کہا نہیں تم یہ پوسٹر نہیں لگا سکتے۔ افسوس کہ وہ نیا طالب علم اس مکالمے سے گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ پولیس والوں نے پیچھا کر کے اسے پکڑ لیا۔ ہم نے پولیس والوں سے اس کی جان چھڑانے کی کوشش کی، لیکن بے سود۔ حتیٰ کہ ہم تھانے پہنچ گئے۔ وہاں تھانے والوں نے کہا کہ تم سب کو اندر کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے اس ساتھی کو دو ہفتے تک قید میں رکھا گیا۔ افسوس کہ حکومت یہودیوں کا بائی کاٹ کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرنے پر مصر تھی۔ ہم نے اس ساتھی کو جیل میں کمبل، بستر، کھانا مٹھائی وغیرہ سب کچھ بھیجا۔ اسے ایسے کمرے میں رکھا گیا تھا جہاں کچھ نہ تھا۔ وہ زمین پر سوتا تھا۔ بعدازاں جب مجھے گرفتار کیا گیا تو میں جیل کے کمرے میں اپنا چوغا اتار کر نیچے بچھا لیا کرتا تھا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ چوغے کا کتنا فائدہ ہے۔

○ توگویا پوسٹر لگانا مرکز میں آپ کی پہلی ذمہ داری تھی؟

● جی ہاں! یہودی مصنوعات کے بائی کاٹ کی مہم میں شرکت، پوسٹر لگانا اور فنڈ جمع کرنا اخوان المسلمون کی تنظیم میں میرا پہلا عملی قدم تھا۔ اخوان المسلمون کے ساتھیوں نے فلسطین کے فنڈ جمع کرنے کے لیے رسیدیں چھپوائی ہوئی تھیں۔ ہم یہ رسید بک لے کر قہوہ خانوں میں گئے، جہاں مصر کے بڑے بڑے مال دار لوگ بیٹھتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ امیر کبیر لوگ کھلے دل سے تعاون کریں گے، لیکن اللہ کی قسم ان بڑے بڑے لوگوں کا دل بہت چھوٹا تھا۔ میں اور عبدالمحسن ایک قہوہ خانے میں ایک شخص کے پاس گئے تو اس نے دو یا شاید پانچ پیسے دیے۔ طاہر عبدالمحسن نے اس سے کہا کہ: ''گستاخی معاف ہم بھکاری نہیں ہیں کہ تم ہم کو دو پیسے تھما رہے ہو''۔ میں نے

طاہر سے کہا کہ چھوڑو جھگڑا نہ کرو، اللہ کہیں اور سے انتظام کر دے گا، ہم وہاں سے نکل آئے سڑک پر چل رہے تھے، کہ ایک چوکیدار نے ہمیں دیکھا۔ وہ کچھ چلنے کے بعد ہماری طرف مڑا۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ہم نے بتایا: ''فلسطین کے لیے فنڈ جمع کر رہے ہیں۔'' اس نے جیب میں جو کچھ تھا نکال کر ہمیں دے دیا۔ ایسے غریب اور متوسط لوگ، فلسطین کے لیے ہم سے تعاون کرتے تھے۔ یہ ایسے ایمان والے لوگ تھے جن کے دل میں بھلائی اور خیر کا جذبہ موج زن تھا۔ مجھے اس مہم کے دوران بہت سے حقائق جاننے کا موقع ملا۔ یقینی بات ہے کہ بعض امیر لوگوں کے دلوں میں بھی بھلائی کا جذبہ ہے۔ لیکن ان کا تناسب غریب اور متوسط لوگوں سے بہت کم ہے۔

○ مسئلہ فلسطین کے حوالے سے اخوان کا کردار ناقابل فراموش ہے، اس ضمن میں کچھ اور تفصیل......؟

● اقصیٰ کی آزادی کے لیے ہمارے فلسطینی بھائیوں نے جو بھی جدوجہد کی اخوان اسی کا حصہ تھے۔ ملک کے اندر بھی یہ مسئلہ ہماری سرگرمیوں کا مرکز ومحور تھا ایک بار اخوان المسلمون نے وزیراعظم کے خلاف مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ طے پایا کہ قاہرہ شہر کے وسط (شارع فوادالاول) سے مظاہرے کا آغاز کیا جائے گا۔ وہاں امریکیوں کا پڑاؤ تھا۔ ہم نعرے بلند کر رہے تھے:

فلسطین زندہ باد،   یہودی مردہ باد،   انگریز مردہ باد

اچانک پولیس کی گاڑیاں اخوان المسلمون کو گرفتار کرنے آگئیں۔ لوگ یہ منظر دیکھ کر بڑے حیران ہوئے کہ اخوان المسلمون کے نوجوان بلاخوف، خود پولیس کی گاڑیوں پر چڑھ گئے۔ انھوں نے انگریزوں اور یہودیوں کے خلاف نعرہ بازی کی۔ یہ بڑی دل چسپ بات تھی کہ پولیس آپ کو گرفتار کرنے آتی ہے اور آپ خود کود کر گاڑی پر چڑھ جاتے ہیں۔

حکومت کو احساس ہوا کہ یہ تو ایک ہمہ گیر اور منظم جماعت بن گئی ہے۔ اس نے جماعت کو ختم کرنے کے لیے کارروائی شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے اخوان المسلمون کو ثابت قدم رکھا اور یہ قافلہ رواں دواں رہا۔ اخوان، فلسطین کی مدد کے لیے لکھتے، فلسطین کے لیے تقریریں کرتے، ان کے لیے دعائیں کرتے، ان کے لیے فنڈ جمع کرتے۔ تب مسئلہ فلسطین عروج پر تھا۔

ہم نے مصر میں موجود یہودی تاجروں اور کمپنیوں کے بائی کاٹ کا فیصلہ کیا، ہمارے ساتھی

یہودیوں کی دکانوں کے سامنے کھڑے ہوتے اور خریداروں کو یہودیوں کی دکانوں سے خریداری کرنے سے روکتے۔ ان کو کہتے: ''تم اپنی دولت یہودیوں کو دے رہے ہو، اس سے وہ تمھیں قتل کریں گے۔ تمھارے مسلمان بھائیوں کو قتل کریں گے اور تم سے مسجد اقصیٰ کو چھینیں گے۔'' یہودیوں کی دکانیں بڑی بڑی تھیں۔ یہ دکانیں نہیں بلکہ بازار تھے۔ ان میں گھریلو استعمال کی ہر چیز فروخت ہوتی تھی اور مصر کے تمام بڑے شہروں سکندریہ، قاہرہ، المنصورہ، ہر جگہ ان کی شاخیں تھیں۔ جب ہم دکانوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جاتے اور خریداروں سے کہتے: ''خریداری کر کے تم یہودیوں کی مدد کر رہے ہو، یہودی جو کچھ کر رہے ہیں، کیا تمھیں اس کی خبر نہیں''۔ لوگ ہماری بات سنتے اور مانتے تھے لیکن حکومت کی طرف سے ہمارا پیچھا اور نگرانی کی جاتی اور ہمیں گرفتار کر لیا جاتا۔

○ سنا ہے امام البنا نے آپ کو اپنے نمایندے کے طور پر فلسطین بھی بھیجا؟

● جی ہاں: یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ امام البنا کو شامی حکومت کی طرف سے دعوت ملی کہ ہم شام سے فرانسیسی فوجوں کے انخلا کی پہلی سالگرہ کے موقع پر جشن فتح منا رہے ہیں۔ اخوان بھی استعمار کے خلاف مضبوط موقف رکھتے ہیں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں۔ امام البنا نے مکتب ارشاد کے تمام ارکان سے کہا کہ شامی صدر القوتلی کی دعوت پر شریک ہوں گے۔ ہم سب نے تیاری شروع کر دی پاسپورٹ بنوا لیے گئے، بکنگ کروا لی گئی ہمیں جمعرات کے روز دمشق جانا تھا۔ سوءِ اتفاق کہ اسی روز فلسطین کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان کر دیا گیا۔

امام البنا نے کہا کہ فلسطین میں صف ماتم بچھی ہے ایسے میں جشن فتح کیسا۔ سو دمشق جانے کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا اور مجھے امام نے کہا کہ تم ہماری طرف سے فلسطین جاؤ، وہاں کی صورت حال کا جائزہ لو اور ہمارے بھائیوں کو ہماری طرف سے حوصلہ و تسلی دینے کی سعی کرو۔ میں اسی روز شام پانچ بجے کی ٹرین سے قاہرہ سے غزہ کے لیے روانہ ہو گیا اور غزہ سے ہوتے ہوئے اگلے روز صبح ۱۰ بجے فلسطین کے اہم شہر ''یافا'' پہنچ گیا۔ ۱۲:۳۰ بجے خطبہ جمعہ شروع ہونا تھا۔ ساتھی مجھے یافا کی مرکزی جامع مسجد لے گئے اور خطبہ جمعہ کے لیے منبر پر بٹھا دیا۔ میں نے فلسطینی عوام پر طاری مایوسی کو امید و حوصلے میں بدلنے کی سعی کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ آزمایش کڑی ہے لیکن یقین رکھو کہ تم

تنہا نہیں نہ ہی قبلہ اول صرف تمھارا ہے، امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قبلہ اول اور اس کا دفاع کرنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑے گی۔ فلسطینیوں کو متحد و منظم کرنے کی کوششوں میں مزید اضافہ کردیا گیا۔ بدقسمتی سے اس وقت وہاں ان کی کوئی قیادت موجود نہیں تھی۔ مفتی اعظم امین الحسینی کو بھی ملک چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا تھا۔ فلسطین پہنچنے کے ایک ہفتے بعد میں نے مسجد اقصیٰ میں خطبہ جمعہ دیا اور پھر میں نے قریہ قریہ بستی بستی پروگرام کرنا شروع کردیے۔ میں نے ہر جگہ دیکھا کہ بیرون ملک سے لا کر بسائے گئے یہودیوں اور نسل در نسل وہاں مقیم فلسطینیوں کی آبادیوں میں بے حد تفاوت تھا۔ یہودیوں کو برطانیہ اور دیگر مغربی ملکوں کی طرف سے بے بہا سرمایہ، آلات اور اسلحہ فراہم کیا جارہا تھا۔ وہ دھڑا دھڑ زمینیں خرید کر آباد ہو رہے تھے، جب کہ فلسطینیوں پر غربت اور بھوک مسلط تھی۔

○ آپ وہاں کتنا عرصہ رہے؟ اور امام البنا کو کیا رپورٹ دی؟

● میں ایک ماہ کی چھٹی لے کر گیا تھا۔ تب میں وزارت اوقاف میں ملازم تھا۔ لیکن میں فلسطین میں دو ماہ رہا۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ مفتی اعظم امین الحسینی اور دیگر فلسطینی رہنما، حلمی پاشا، شیخ ابوسعود سب ملک سے باہر تھے۔ امین الحسینی کو انگریزوں نے گرفتار کرنا چاہا تو وہ عراق چلے گئے تھے اور الرشید علی گیلا کے عہد انقلاب میں وہیں رہے۔ بعد میں وہ پولینڈ چلے گئے پھر عالمی جنگ کا پورا عرصہ وہیں رہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں جب سربوں نے بوسنیا، ہرزیگووینا کے مسلمانوں کو دھوکا دیا اور ان کے خاتمے کی کوشش کی تو مفتی اعظم نے بوسنیا کے مسلمانوں کی بہت مدد کی۔ اسی دوران انھوں نے اتحادیوں کے مخالف رہنماؤں سے ذاتی گہرے تعلقات قائم کیے۔

اسی لیے میں نے ضروری سمجھا کہ میں فلسطین میں رہوں اور فلسطینیوں میں مایوسی اور احساس شکست کے بجائے امید اور مزاحمت کا حوصلہ پیدا کروں۔ میں نے وہاں سے امام البنا کو تفصیلی رپورٹ ارسال کرتے ہوئے بتایا کہ یہاں اسرائیلی ریاست قائم کرنے کے تمام تر انتظامات عملاً پورے کیے جاچکے ہیں اب صرف اعلان ہونا باقی ہے۔ اس عالم میں فلسطینیوں اور عالم اسلام کی ذمہ داری میں بہت اضافہ ہوچکا ہے میں نے کچھ عملی تجاویز بھی ارسال کیں۔ اسی دوران مفتی اعظم مصر کے سرکاری دورے پر آئے وہ مرشد عام امام البنا سے بھی آکر ملے۔ امام البنا نے انھیں

میرا تجزیہ اور تجاویز دکھائیں تو انھوں نے ان سے کامل اتفاق کیا۔

○ اس وقت پڑوسی ممالک کی حکومتوں کا کیا رویہ تھا؟

● ایک طرف فلسطینی ماتم عروج پر تھا لیکن عین انھی دنوں اردن میں عیش و عشرت اور جشن طرب کی محفلیں تھیں۔ کیونکہ انگریزوں نے ہر مسلم حکمران کو مخصوص کردار سونپ رکھا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ کوئی فلسطینی عوام کی مدد کو پہنچتا وہ اپنے حال میں مست اور اپنے اپنے حصے کا کام کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر اردن کے امیر عبداللہ کو جو اس وقت امیر شرق اردن کہلاتا تھا، انگریزوں نے اچانک شاہ شرق اردن کا لقب دے دیا تا کہ اس کے باپ کو خوش کیا جاسکے جو عثمانی خلافت کے خاتمے کے بعد خلیفة المسلمین بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ 'امیر شرق اردن' کے بجائے 'شاہ شرق اردن' کہلوانے سے سرخاب کا کون سا پَر لگ جانا تھا یہ خود وہ بھی جانتا تھا۔ لیکن اس موقع پر پورے اردن میں بڑا جشن منایا گیا۔ میں اس وقت فلسطین میں تھا۔ مجھے وہاں دعوت نامہ موصول ہوا۔ میں اس ارادے سے چلا گیا کہ وہاں کوئی ذمہ دار مل جائے تو اسے فلسطین کی صورت حال سے آگاہ کروں، وہاں پہنچا تو بہت بڑے پیمانے پر خوردونوش اور نشاط و طرب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ عجیب امر یہ تھا کہ یہ جشن امیر سے بادشاہ بننے کا تھا اور اس تقریب کا مرکزی میزبان برطانوی جنرل گیلپ تھا۔ اسی نے سب سے پہلے مسلمانوں کا استقبال کیا اور اسی نے سب سے آخر میں خدا حافظ کہا۔

۱۹۴۵ء میں عرب لیگ تشکیل دی گئی تھی اس کے پہلے سیکرٹری جنرل عبدالرحمٰن عزام بھی وہاں تھے اور تقریباً تمام ممالک کے سفرا بھی تھے۔ جشن کے دوران ایک بڑے ہال میں تقاریر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مجھے دعوت خطاب ملی تو میں نے حمد و صلوۃ کے بعد کہا کہ میں آج فلسطین کے مفتی امین الحسینی کو سلام عقیدت پیش کرتا ہوں کہ وہ فلسطین کے لیے .... اتنا ہی کہا تھا کہ پورا ہال زبردست نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں حالانکہ ہر کوئی جانتا تھا کہ آج بننے والے ملک عبداللہ اور مفتیِ فلسطین کے درمیان سخت کشیدگی پائی جاتی ہے۔ مفتیِ اعظم کی وفاداری اللہ اور اس کے رسولؐ سے تھی، جب کہ شاہ اردن کی تمام وفاداری اپنے عرش و اقتدار اور انگریزوں سے تھی۔ اسے شاہ کا لقب بھی اسی لیے دیا گیا تھا کہ فلسطین کے مغربی کنارے کو اردن سے ملاتے ہوئے شرق اردن اور غرب اردن کو ایک مملکت بنا دیا جائے۔ شاہِ وفادار کو اس کا اقتدار

اور باقی ماندہ فلسطین کو اسرائیل مان کر مسئلہ فلسطین سے نجات حاصل کرلی جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ساری سازش ناکام بنادی ان کی یہ ناکامی جہاد و مزاحمت کے باعث ہوئی؟

اہل فلسطین نے مسلسل قربانیاں دے کر بھی علم جہاد کو سرنگوں نہیں ہونے دیا حالانکہ انگریزوں اور ان کے غلاموں نے جہاد سے نجات کی ہر ممکن کوشش کی۔ برصغیر میں جس طرح قادیانیت کا ناپاک پودا کاشت کر کے جہاد ساقط کرنے کی کوشش کی گئی اسی طرح مشرق وسطیٰ میں بہائیت سے یہ کام لینے کی کوشش کی گئی۔ یہودیوں نے بہائیت کی بنیاد رکھی۔ بہاء کی قبر فلسطین کے شہر عکا میں تھی اور عباس بہاء کی قبر حیفا میں دونوں کو بڑی شان و شوکت سے نوازا گیا۔ کیونکہ بہائیت میں جہاد کو حرام قرا دیا گیا ہے۔ مصر میں بھی اس کا بڑا مرکز بنایا گیا۔ شاہ فاروق کو بھی انھی صہیونی سازشوں کی تکمیل کے لیے استعمال کیا گیا۔ افسوس صد افسوس شاہ فاروق کا محل یہودیوں کا مددگار و معاون تھا، ملکہ کی خصوصی خادمہ یہودیہ تھی اور خود شاہ فاروق کے گرد یہودیوں اور عیسائیوں کا جھمگٹا تھا۔

○ **اخوان المسلمون میں اسی مصری معاشرے کے نوجوان تھے۔ امام حسن البنا نے ان نوجوانوں کو کس طرح تبدیل کیا، کیا ان کے پاس پارس تھا؟**

● الکلمہ الطیبۃ، اچھی نصیحت اور حکمت کے ساتھ دعوت: ادع الٰی سبیل ربک بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن (اے نبیؐ اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے سے جو بہترین ہو)۔ وہ قائل کرنے والے انسان تھے۔ وہ اپنی رائے میں متشدد نہیں تھے۔ وہ نوجوانوں کے ساتھ رابطہ رکھتے۔ انھوں نے نوجوانوں کے لیے ہفتہ وار درس رکھا ہوا تھا۔ نوجوانوں کے لیے اسرہ کا خاص نظام بنایا۔ ہر پانچ نوجوانوں کا ایک اسرہ بنایا۔ اسرہ کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ہفتے میں ایک بار اکٹھے ہوتے۔ ان کے درمیان تعلق رہتا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ یہ تعاون نہ صرف روحانی تھا بلکہ مادی بھی تھا۔ اسرہ کے افراد کسی دن نفلی روزہ رکھنے کا پروگرام بنا کر اکٹھے افطار کرتے۔ مل کر مطالعہ کرتے۔ ایک کتاب متعین

کر لی جاتی جسے مل کر پڑھتے اور استفادہ کرتے۔ اسرہ کے اوپر ذرا وسیع تر نظام تھا، جسے کتیبہ کا نام دیا گیا تھا۔ کتیبہ پانچ اسروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ گویا ہر کتیبہ تقریباً ۲۵ نوجوانوں پر مشتمل ہوتا۔ کتیبہ کے افراد مہینے میں ایک دفعہ اکٹھے ہو کر شب بیداری کرتے۔ شیخ حسن البنا یا اخوان المسلمون کا کوئی اور رہنما ان کے پروگرام میں شریک ہوتا۔ وہ قیام اللیل کرتے، تہجد ادا کرتے اور قرآن کی اس آیت کے مصداق رات گزارتے:

''تتجا فی جنوبہم عن المضاجع یدعون ربہم خوفا وطمعاً۔ ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں''۔ اپنے مسائل اور مشکلات ایک دوسرے سے بانٹتے اگر کسی کو کوئی مشکل ہوتی، کسی کے بچے کی پڑھائی کا مسئلہ ہوتا یا گھر میں کوئی بیمار ہوتا تو ہر ایک دوسرے سے حسب استطاعت تعاون کرتے، اس کو مشورہ دیتے۔

○ یہ کتیبے ہر مہینہ جمع ہوتے تھے ؟

● جی ہاں ! کتیبے ہر مہینے جمع ہوتے ، البتہ اسرہ کے افراد ہر ہفتے میں ایک بار اکٹھے ہوتے۔

ان دنوں جماعت کے سیکرٹری جنرل احمد حسن الباقوری تھے۔ احمد حسن جامعہ ازہر کی یونین کے صدر بھی رہے تھے۔ انھوں نے ہی اخوان کے اسکاؤٹس کا ترانہ لکھا جو اخوان میں بہت مقبول ہوا:

یارسول اللہ هل یرضیک أنا — اخوۃ فی اللہ للإ سلام قمنا

ننفض الیوم غبارالنوم عنا — لانهاب الموت لا بل نتمنی

أن یرانا اللہ فی ساح الفداء

إن نفسا ترتضی الاسلام دیناً — ثم ترضی بعده أن تستکینا

اوتری الإسلام فی أرض مهینا — ثم تهوی العیش نفس لن تکونا

فی عداد المسلمین العظماء

حبذا الموت يريح البائسين ويرد المجد للمستعبدين
فلنمت نحن فداء المسلمين سادة الدنيا برغم الكاشحين
وليسد فى الأرض قانون السماء
ان للدنيا بنا أن تطهرا نحن أسدالله لا أسد الشرى
قد قطعنا العهد ألا نقبرا أونرى القرآن دستور الورى
كل شىء ماسوى الدين هباء
أيقظت جمعية الإخوان فينا روح آباء كرام فاتحينا
أسعدوا العالم بالإسلام حينا فاستجبنا للمعالى ثائرينا
وتسابقنا إلى حمل اللواء
غيرنا يرتاح للعيش الذليل وسوانا يرهب الموت النبيل
إن حيينا فعلى مجد أثيل أوفنينافإلى ظل ظليل
حسبنا أنا سنقضى شهداء

○ آپ امام کے ہم سفر بھی رہے؟

● جی ہاں! میں ان کا ساتھی اور معاون بن گیا۔ میں ان کے ساتھ مختلف علاقوں کے دوروں پر جاتا۔ میں ان کے ساتھ اشبیک، بنھا، المنصورہ، زقازیق کے شہروں میں گیا، وہ ہمیشہ اپنے ساتھ کسی ساتھی کو لے جاتے تھے۔ اخوان المسلمین کے ساتھیوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو اسے امام حسن البنا کے سامنے رکھا جاتا۔ جس کے لیے ہم تعاون کرتے۔

○ آپ امام کے ساتھ صعید کے دورے پر بھی گئے؟

● امام حسن البنا کا معمول تھا کہ وہ گرمیوں میں صعید یعنی بالائی مصر کا دورہ کرتے۔ وہ دو ماہ تک وہاں ٹھہرتے۔ صعید قاہرہ سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔ قاہرہ اور اسوان کے درمیان تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ آنا جانا اتنا آسان نہ تھا، اس لیے امام البنا سال میں ایک ہی دفعہ گرمیوں کے موسم میں ان شہروں کا دورہ کیا کرتے تھے۔ صعید، موسم گرما میں مصر کا سب سے گرم علاقہ ہوتا ہے، حسن البنا یہ پورا عرصہ اسی علاقے میں گزارا کرتے تھے۔

میں ان کے ساتھ صعید کے دورے پر بھی گیا ہوں۔ یہ ایک یادگار سفر تھا۔ اسی سفر میں ان سے میری قربت ہوئی۔ اس یادگار سفر کے کچھ واقعات ملاحظہ ہوں:

یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے کہ امام حسن البنا نے مجھ سے فرمایا: ''تیار ہو جایئے، آپ ہمارے ساتھ اس سال صعید مصر جائیں گے''۔ صعید میں شدید گرمی ہوتی تھی۔ لوگ گرمی سے بھاگ کر اسکندریہ اور رأس البر جاتے، جب کہ امام حسن البنا اس کے برعکس گرمی میں داخل ہوتے۔ میں نے امام حسن البنا سے پوچھا سفر کے لیے کیا درکار ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا صرف ۲ جنیہ (مصری پاؤنڈ)۔ تب قاہرہ سے اسوان کا کرایہ دو جنیہ تھا۔ ایک جنیہ جانے کا اور ایک جنیہ واپسی کا۔ اخوان المسلمون کے بعض اور ساتھی بھی اس سفر میں شریک ہونا چاہتے تھے، جن میں ڈاکٹر محمد الظہر ولی، استاد طاہر، الشیخ محمود عوض اور دیگر ساتھی شامل تھے۔ ریل کا ٹکٹ تیسرے درجے کا تھا۔ تیسرے درجے کا سفر نہایت کٹھن اور ماحول بہت خراب ہوتا تھا۔ مسافروں کا سامان، خیمے، بیگ اور طرح طرح کی چیزیں بکھری ہوئی ہوتیں۔ سیٹوں کے درمیان چلنا ممکن نہ تھا۔ مسافروں کا ہجوم ہوتا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود امام حسن البنا تیسرے درجے ہی میں سفر کیا کرتے تھے۔

ہم نے دو جنیہ دے دیے۔ ڈاکٹر محمد الظہر ولی نے کہا کہ اگر ہم اسی کرایے میں دوسرے درجے میں سوار ہو جائیں تو کیا خیال ہے۔ امام حسن البنا نے پوچھا وہ کیسے؟ انھوں نے کہا کہ ریلوے میں ایسی ٹکٹیں ہیں جو کلومیٹر کے حساب سے ہوتی ہیں۔ جنھیں کلومیٹر ٹکٹیں کہا جاتا ہے۔ دو تصویریں اور ٹکٹیں لیں۔ ریلوے آفس چلے جائیں۔ وہ کچھ پیسے لے کر ان ٹکٹوں پر دوسرے درجے کی مہر لگا دیں گے۔ امام حسن البنا نے اس کام کے لیے میری ذمہ داری لگائی۔ میں ٹکٹیں لے کر ایک دفتر سے دوسرے دفتر کا چکر لگاتا رہا۔ کبھی جواب ملتا کہ متعلقہ آدمی موجود نہیں ہے تو کہیں جواب ملتا کہ کل آ جانا۔ بالآخر میں ناکام واپس لوٹا۔ امام حسن البنا، نے پوچھا: کیا بنا؟۔ میں نے جواب دیا بہت سے دفتروں کے چکر لگائے لیکن کچھ نہ بنا۔ وہاں پر موجود مرکز کے سیکرٹری جناب عبدالحکیم نے کہا کہ ریلوے میں میرا ایک دوست ہے میں اس کو لکھ دیتا ہوں وہ اس سلسلے میں آپ کی مدد کرے گا۔ اگلے روز میں یہ رقعہ لے کر اس شخص کے پاس پہنچا۔ وہ ایک نہایت ہی شریف اور بااخلاق انسان تھا۔ وہ ریلوے دفتر میں میرے ساتھ گیا۔ وہاں پہنچے تو وہی سلسلہ جس

سے مجھے کل واسطہ پڑا تھا۔ متعلقہ آدمی نہیں ہے، ملازم نہیں ہے، کل آ جانا، جیسے جوابات ملے۔ دفتروں میں چکر لگاتے پورا دن گزر گیا لیکن کچھ نہ بنا۔ البتہ اس شخص نے تعاون کی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ واللہ میں نے اس سے زیادہ شریف، بااخلاق اور باہمت شخص نہیں دیکھا تھا۔ واپس حسن البنا کے پاس لوٹا، تمام قصہ سنایا۔ انھوں نے کہا کہ اپنے آپ کو تکلیف میں مت ڈالو۔ اللہ کی مرضی یہی ہے کہ ہم سبنسہ (ٹرین کے آخر میں لگا مال بردار ڈبہ) میں سفر کریں۔

نہ درجہ اول، نہ دوم اور نہ درجہ سوم ہم ریل کے سب سے آخری ڈبے میں سوار ہوں گے۔ ریل گاڑی کا آخری ڈبہ صرف سامان کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اس ڈبے میں کرسی ہوتی ہے نہ کوئی بیٹھنے کی جگہ۔ امام البنا نے کہا: ''لگتا ہے اللہ کی مرضی یہی ہے کہ ہم اسی ڈبے میں سوار ہوں گے''۔

جب ہم اگلے دن صبح ریلوے اسٹیشن پہنچے تو گاڑی پر مسافروں کا بہت ہجوم تھا۔ اول، دوم اور سوم سب ڈبے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ کھڑکیوں سے لٹکے ہوئے تھے، حتیٰ کہ گاڑی کے پایدان پر بھی پاؤں رکھنے کی جگہ نہ تھی، اس دوران میں ہمیں آخری ڈبے والے نے دیکھا، اس کو ہم پر ترس آیا۔ اس نے کہا: ''محترم ادھر آ جایئے، اگلے اسٹیشن تک اس ڈبے میں سوار ہو جایئے''۔ یہ ریل گاڑی صرف بڑے اسٹیشنوں پر رکتی تھی۔ قاہرہ سے چلتی تو صرف جیزہ، بنی سویس اور اسیوط جیسے تقریباً چھے اسٹیشنوں پر رکتی۔ اس ریل گاڑی کو ایکسپریس کہا جاتا تھا۔ ہم آخری ڈبے میں سوار ہو گئے۔ بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ ہمیں کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑا۔ ہم نے کوشش کی کہ کسی جگہ پر بیگ رکھ کر اسی کے اوپر امام حسن البنا کو بٹھایا جائے، لیکن اتنی جگہ بھی میسر نہ تھی۔ جب گاڑی منیہ کے اسٹیشن پر رکی تو بعض مسافر اترے۔ امام حسن البنا نے ایک روز پہلے کہا تھا کہ واللہ ہم آخری ڈبے ہی میں سفر کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم پوری کردی۔ اس وقت سے مجھے اس شخص سے ایک طرح کا خوف محسوس ہونا شروع ہو گیا۔ کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اگر وہ اللہ کی قسم کھا لیتا تو اللہ اس کی قسم کو پورا کر دیتا۔ میں نے دیکھا وہ کبھی ایسی ویسی بات نہ کیا کرتے تھے۔ ہم چھوٹے چھوٹے لوگ تیسرے درجے میں سفر کرنا ناپسند کرتے ہیں، لیکن حسن البنا جس نے پوری نسل کی تعمیر کی، جس نے نوجوانوں کی زندگیوں کو بدلا، جو مصر کا ایک ایک شہر اور ایک ایک قصبہ پھرا، شمال و جنوب میں کوئی ایسا شہر یا گاؤں نہیں جس میں یہ خبر نہ ہو کہ یہ آدمی تیسرے درجے میں سفر کرتا ہے۔ حالانکہ

تیسرے درجے میں اور خود اس قیامت کی گرمی میں سفر ناقابل برداشت تھا۔

○ صعید مصر میں کتنا عرصہ قیام رہا؟

● تقریباً ڈیڑھ ماہ تک ہم وہاں ٹھیرے۔ پھر دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ جب جنگ چھڑی تو ہم اقسس میں تھے۔ انگریز حسن البنا کا پیچھا کرتے۔ اسٹیشنوں پر ان کے کارندے ہوتے جو امام البنا کی خبریں پہنچاتے۔

○ جنگ شروع ہونے پر کیا آپ واپس لوٹ آئے یا آپ نے دورہ جاری رکھا؟

● ہم نے دورہ جاری رکھا۔ اسوان تک پہنچے۔ اسوان میں اخوان المسلمون کے ساتھی تھے۔ وہاں صالح بکر حرب تھے جو مصر کے وزیر جنگ رہے ہیں۔ وہ حسن البنا سے محبت کرتے تھے۔ اسوان عباس محمود العقاد کا شہر ہے۔ امام حسن البنا اسوان میں تعلیم یافتہ طبقے سے خصوصی ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ مسجد میں عام لوگوں سے بھی ملتے۔ میدانوں میں خیمے لگا کر رہنے والے لوگوں سے بھی ملتے۔

○ جنگ میں امام حسن البنا اور اخوان المسلمون کا کیا موقف تھا؟

● جب جنگ چھڑی تو جرمنی نے اپنی فوجیں الجزائر اور طرابلس، لیبیا میں اتار دیں۔ انگریز شکست کھا گئے۔ انگریزوں کی شکست پر مصر میں جلوس نکالے گئے۔ ان جلوسوں میں انگریزوں کے خلاف اور جرمنی کے حق میں نعرے لگاتے ہوئے کہا جاتا: ''اے رومیل قدم بڑھاؤ اے رومیل..... (رومیل جرمن افواج کا کمانڈر تھا) تاہم اخوان المسلمون ایسے نعرے لگانے والوں میں سے نہیں تھے۔ ہم ایک قابض کو دوسرے قابض کی جگہ نہیں بٹھانا چاہتے، نہ ایک ظالم کو دوسرے ظالم سے تبدیل کرنے کے خواہاں ہیں۔ اگرچہ جرمن اس وقت جابر و ظالم تھے۔ البتہ ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ انھوں نے انگریزوں کو شکست دی۔ انگریزوں کو ذلیل کیا۔

اسی دوران میں انگریزی افواج کے خفیہ ادارے کے سربراہ کلومیس کلیتون نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ وہ معروف جنگی مجرم تھا لیکن اس نے مصر میں ایک مسلمان لڑکی سے شادی

کر لی۔ وہ مصریوں کے دل جیتنا چاہتا تھا۔ جب جلوس نکلے کہ اے رومیل آگے بڑھو تو اس نے امام حسن البنا سے ملاقات کرنا چاہی۔ کلومیل کلیتون امام حسن البنا کے پاس آیا۔ اس نے اس سوال سے اپنی بات شروع کی: ''اخوان المسلمون انگریزوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟'' سوال بڑا عجیب تھا۔ امام حسن البنا کی دو صفتیں نمایاں تھیں: سچائی اور اپنی دعوت کے لیے ہر لمحہ مستعد اور بیدار رہنا۔ امام سچائی اور تجرد کی خوبیوں سے مالا مال تھے۔ دوسری تجرد یعنی نہ دنیا، نہ اقتدار، نہ حکومت اور نہ کوئی اور چیز بس صرف اللہ کی رضا۔

امام حسن البنا نے کلومیل کلیتون سے کہا: اخوان المسلمون اس لیے انگریز حکمرانوں سے نفرت کرتے ہیں کہ انگریز ہماری زمین اور ہمارے ملک، ہماری دولت پر قابض ہیں۔ آپ کا سوال عجیب ہے کہ ہم انگریزوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔ تم انگریز لوگ مصریوں سے ایک ٹن کپاس تین جنیہ میں خریدتے ہو۔ اگر یہی کپاس تم خود کاشت کرو تو ایک ٹن پر ۱۰ جنیہ خرچہ آئے۔ کیا یہ تمھارے لیے جائز ہے، کوئی بھی قوم اس ظلم کو برداشت نہیں کرے گی۔ تم جانتے ہو کہ جاپان نے ایک ٹن کپاس ۷ جنیہ میں خریدنے کی پیش کش کی ہے، لیکن تمھاری حکومت آڑے آتی ہے۔ ہم آپ سے کیسے نفرت نہ کریں''۔ کلومیل کلیتون نے بحث کرنا چاہی کہ: ''اخوان المسلمون ایسے ہیں ویسے ہیں''۔

امام نے جواب دیا: ''خدا لگتی بات یہ ہے کہ اخوان المسلمون سچے ہیں، وہ جھوٹ نہیں بولتے، اگر تم ہم سے انصاف کرو تو ہم تم سے محبت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جس قیمت میں دوسرے ہم سے کپاس خریدتے ہیں تم بھی اسی قیمت پر ہم سے کپاس خریدو۔ تم قابض ہو، غاصب ہو''۔ اس کے بعد انگریز خفیہ ادارے کے سربراہ نے مصر میں اپنے سفیر اور دوسرے ذمہ داران سے ملاقات کی۔ ملاقات کے بعد کپاس کی قیمت تین جنیہ سے بڑھا کر آٹھ جنیہ کر دی گئی۔ اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں کہ شیخ حسن البنا سے ملاقات کے بعد کپاس کی قیمت میں اضافہ کر دیا گیا۔

انگریز مہمان نے امام حسن البنا سے پوچھا اخوان المسلمون کے پاس اتنا بڑا مرکز ہے۔ اتنی رقم کہاں سے آئی؟ تو امام حسن البنا نے ازراہ تفنن جواب دیا رومیل (جرمن کمانڈ) نے پیسے دیے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: ''اخوان المسلمون کے ساتھی ایک ایک پیسہ جمع کرتے ہیں۔

ہماری جماعت کے پاس جو کچھ ہے وہ اخوان المسلمون کے ساتھیوں کے تعاون سے ہے۔ اخوان المسلمون کے ساتھی اپنے اخراجات سے بچا کر پیسے جمع کرتے ہیں''۔ پھر آپ نے فرمایا: ''میرے جسم پر جو لباس آپ دیکھ رہے ہیں اس کی قیمت تقریباً ۶۰ قرش (پیسہ) ہے، جب کہ تمھارے لباس کی قیمت ۶۰ جنیہ (پاؤنڈ) ہے''۔

کلومیل نے کہا کہ بادشاہ سلامت نے اخوان کی مدد کے لیے ۱۰ ہزار مصری پاؤنڈ کی مدد ارسال کی ہے۔ یہ ایک بڑی رقم تھی لیکن امام حسن البنا نے اس برطانوی ذمہ دار سے کہا: ''بڑے احترام سے عرض کروں گا کہ آپ پہلے شخص ہیں جس کے منہ سے سن رہا ہوں کہ شاہِ انگلستان نے اخوان المسلمون کے بیت المال کے لیے دس ہزار جنیہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ بہت شکریہ لیکن ہم آپ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے یہ رقم لینے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ رقم ہم بادشاہ سلامت کے لیے بطور تحفہ پیش کرتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ مال حرام ہے۔ امام حسن البنا نے ۱۰ ہزار جنیہ کی پیش کش مسترد کر دی اور کہا کہ اگر آج ہم آپ سے رقم لیں گے تو کل دوسروں سے بھی لے سکتے ہیں۔ پھر ہم آپ کو بھی دھوکا دے سکتے ہیں۔

یہ برطانوی فوج کے خفیہ ادارے کے سربراہ کلومیل کلیتون کا قصہ ہے جو امام حسن البنا سے کہنے آیا تھا کہ آپ برطانیہ سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔؟

○ **اس کا قبولِ اسلام ؟**

● وہ یقینی طور پر دکھاوا تھا۔

○ **صعید کے سفر کے بعد کیا آپ اکثر اوقات امام حسن البنا کے ساتھ ہی رہے؟**

● جی ہاں میں اکثر دوروں میں ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ امام حسن البنا مصر کے پارلیمانی انتخابات میں امیدوار بنے۔ بادشاہ نے نحاس پاشا کو برطرف کر کے احمد ماہر کو وزیر نامزد کیا تو اس نے ۱۹۴۵ء میں پارلیمنٹ کے انتخابات کرائے۔ اخوان المسلمون نے اصرار کر کے حسن البنا کو امیدوار نامزد کیا۔ میں انتخابی مہم میں بھی ان کے ہمراہ رہا۔

○ **کیا اخوان المسلمون کی جانب سے امام حسن البنا اکیلے امید**

وار تھے ؟

● جی ہاں! اخوان المسلمون کی جانب سے امام حسن البنا اکیلے امیدوار تھے۔

○ کس حلقے اور کس شہر سے؟

● اسماعیلیہ سے۔ہم انتخابات کے موقعے پر اسماعیلیہ گئے۔شیخ حسن البنا کا مخالف امیدوار سلمان عید تھا۔ وہ اصل میں عریش کا تھا، لیکن اسماعیلیہ میں رہایش پذیر تھا۔ انگریز ہر طرح سے اس کی حمایت کر رہے تھے۔انگریزی افواج علانیہ طور پر سڑکوں پر آ گئی۔ مصری فوج اور پولیس بھی اس کے ساتھ تھی۔ اسماعیلیہ میں برطانوی فوج کی بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ انتخابات کے دن اخوان المسلمون کے پولنگ ایجنٹوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ بیلٹ بکسوں کوخود ہی ووٹوں سے بھر دیا گیا۔ مصر کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے اخوان المسلمون کے ساتھیوں نے پولنگ اسٹیشنوں میں گھس کر دھاندلی روکنے کا ارادہ کیا، لیکن امام حسن البنا نے انھیں منع کر دیا کہ خون خرابا ہوگا۔ امام نے کارکنوں سے فرمایا: ''میرے لیے آپ کے خون کا ایک قطرہ پوری پارلیمنٹ سے زیادہ قیمتی ہے، انھوں نے کہا کہ ہم نے انتخابات میں حصّہ لے کر دنیا پر ثابت کیا ہے کہ ہم امن کے داعی ہیں، ہم لڑائی کے ذریعے نہیں، پارلیمنٹ کے ذریعے سے تبدیلی چاہتے ہیں''۔ امام حسن البنا نے اخوان المسلمون کے ساتھیوں کو برطانوی فوج اور مصری پولیس سے ٹکرانے سے منع کر دیا۔ انھوں نے کہا: ''ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ و جو چاہیں کریں، کہیں جا کر تو جواب دیں گے''۔

امام حسن البنا نے اپنی ذات یا کسی مفاد کے لیے پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصّہ نہیں لیا تھا بلکہ اس لیے حصّہ لیا کہ پارلیمنٹ میں اسلام کی مضبوط آواز بلند ہو۔ پارلیمنٹ میں اسلام کا نمایندہ ہو۔ یہی امام حسن البنا کا موقف تھا وہ تشدد کو ناپسند کرتے تھے۔ بہر حال امام اور اخوان المسلمون کو اندازہ تھا کہ اس انتخابات کا نتیجہ ہمارے خلاف ہی آئے گا۔

○ اس وقت اخوان المسلمون کے خلاف قید و بندکی مہم جاری تھی ؟

● جی ہاں، امام حسن البنا بھی گرفتار ہوئے تھے اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن البنا اور بہت سے کارکنوں کو بھی گرفتار کیا گیا جن میں' مَیں بھی شامل تھا۔ پھر جب امام حسن البنا کو شہید کیا گیا میں

اس وقت بھی قید میں تھا۔ امام حسن البنا کی شہادت پر جیل میں گھنٹیاں بجائی گئیں اور ہمیں حکومت کے حق میں بیان دینے کے لیے کہا گیا۔ ہم نے انکار کر دیا اور کہا: ''مسلمانوں کے خون کی حرمت کعبے کی حرمت سے زیادہ ہے''۔ حسن البنا کو شہید کیا گیا ہے۔ ان کا قتل ظلم ہے۔ وہ مظلوم تھے۔ ہم کیسے کہہ دیں کہ وہ شر پسند تھے''۔ یہ کہنے پر ہمیں قید میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے ایسی کوٹھڑیوں میں رکھا گیا جن میں چٹائی تک نہیں تھی۔ صبح کے وقت ایک روٹی اور دال لائی جاتی۔ ہم جب تک اس کمرے میں رہے ہم نے سورج نہیں دیکھا۔ وہ کمرہ نہایت گندا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم گند میں رہیں۔ ہمیں اس کوٹھڑی میں ایک ماہ تک رکھا گیا۔ پھر ہکتر کی فوجی چھاؤنی میں منتقل کر دیا گیا۔ ہکتر فوجی چھاؤنی امریکیوں کے زیرِ انتظام تھی۔ امریکی فوجی اپنی عادات اور مزاج کے اعتبار سے جانور تھے۔ قضائے حاجت کے لیے پردے کا انتظام تک نہ تھا۔ ایک یہاں پر بیٹھا ہے تو دوسرا وہاں پر۔ پاکیزگی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اخوان المسلمون کے ساتھی ایک ایک کر کے چادر تان کر کھڑے ہو جاتے تاکہ قضائے حاجت کے وقت ستر ہو سکے۔

انھوں نے ہمیں سوشلسٹوں کے ساتھ رکھا۔ ان دنوں سوشلسٹ عناصر متحد تھے اور ان کے سربراہ کا نام ہنری کریز تھا جو مصر کے مال داروں میں شمار ہوتا تھا۔ ایک روز امریکیوں نے اخوان المسلمون کے ساتھیوں کو مزہ چکھانے کی ٹھانی۔ اخوان کے ایک ساتھی نے فوجی افسر سے ذرا کھردرے الفاظ میں بات کی، مقصود فوجی کی شان میں کوئی گستاخی نہیں تھی، بلکہ اپنے حق کی بات تھی۔ اس پر وہ بپھر گئے، ایسا لگ رہا تھا کہ فوجی معرکہ درپیش ہے۔ بڑی تعداد میں فوجی آ گئے۔ مجھے اس چھاؤنی سے سوشلسٹوں کے ساتھ حوالات میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جیل میں سب سے تکلیف دہ بات یہ ہوتی ہے کہ انسان کو کسی غیر قوم کے ساتھ رکھا جائے۔ قرآن پاک میں سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کو کہا تھا کہ لأعذبنه عذاباً شديداً أو لأذبحنهٗ ''میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر دوں گا''۔ علما اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ہدہد کو سلیمان علیہ السلام نے جو سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ اسے غیر جنس کے پرندوں کے ساتھ رکھا جائے گا۔ ہمیں سوشلسٹوں کے ساتھ رکھا گیا۔ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے مختلف چیز تھے۔ مزاج کے اعتبار سے پست فطرت انسان۔ سگریٹ ٹکڑے تک کے لیے ایک دوسرے سے خیانت کرتے تھے۔ اپنے بھائی کی چوری کر لیتے،

ایک دوسرے کا کھانا اچک کر کھا جاتے۔ آپس میں جھگڑتے۔ مختصراً یہ کہ وہ مادی جانور تھے۔ ہمیں حوالات سے فوجی چھاؤنی کے ڈائریکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ اس چھاؤنی میں شیخ یوسف قرضاوی اور دوسرے ساتھی بھی تھے۔ مجھ اکیلے کو حوالات میں لے جایا گیا۔ فوجیوں نے مجھے لاٹھیوں اور سریوں سے مارا۔ بہت شدید مارا، لیکن اللہ کی قسم، بری طرح مارنے کے بعد جب مجھے واپس لایا گیا تو کوئی درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میری آنکھ کے نیچے لوہے کا راڈ لگنے سے نشان پڑ گیا تھا لیکن الحمدللہ آنکھ کو کچھ نہ ہوا۔ اخوان پریشان تھے کہ وہ کیا کریں۔ جب میں واپس لوٹا تو مجھے حوالات میں دیگر اخوانی ساتھیوں سے الگ رکھا گیا، مجھ پر پانی بھی بند کر دیا گیا۔ اخوان کے ساتھی بہت پریشان تھے اور مجھ تک پانی پہنچانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ میرے دروازے کے نیچے پتا رکھ کر اس پر پانی ڈالتے تاکہ مجھ تک پہنچ جائے۔ ہماری سب سے بڑی مشکل گرمی تھی۔ شدید گرمی، کمرے کی چھت لوہے کی تھی۔ کمرہ گرم ہو جاتا تھا۔ تازہ ہوا کے داخلے کی کوئی صورت نہ تھی۔ دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ ہم تازہ ہوا لینے کے لیے اپنی ناک ٹوٹی ہوئی جالیوں کے سوراخوں پر رکھتے تھے۔ یہ امام حسن البنا کی شہادت کے کچھ ہی زمانہ بعد کی بات ہے۔

○ آپ نے امام حسن البنا کے ساتھ زندگی گزاری۔ ان کی شخصیت میں آپ نے اہم صفات کیا پائیں؟

● امام حسن البنا کی شخصیت کی اہم صفات لوگوں کا دل جیتنا ہے۔ لوگوں کو اسلام کی دعوت کے گرد جمع کرنا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسن البنا ہمیشہ ایسے راستوں سے دور رہتے جو قانون سے متصادم ہوں۔ امام حسن البنا نے کہا سب کچھ قانون اور نظام کے مطابق ہوگا۔ ہم اسی کیمپ میں تربیت حاصل کرنے جاتے جو اسکاؤٹس کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس میں خیمے تھے اور اسپورٹس کا سامان تھا۔ ہم وہاں پر بادشاہ کے اسکاؤٹس کی حیثیت سے جاتے، تب تک ولی عہد تھا۔ وہ بادشاہ نہیں بنا تھا۔

ایک اور مثال دیتا ہوں۔ اخوان کے ایک ساتھی احمد حسن نے بہادری دکھانا چاہی، اس کے ساتھی جوا خانہ میں گئے اور توڑ پھوڑ کی۔ اسی طرز پر اخوان کے بعض دیگر ساتھیوں نے بھی

کارروائی کرنا چاہی، مگر امام حسن البنا نے انھیں ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا: ''یہ ہمارا نہیں، حکومت کا کام ہے۔ ہمارا کام دعوت ہے۔ ہم دعوت کا کام کریں گے، ہم پارلیمنٹ کے ذریعے جوا اور شراب رکوائیں گے''۔ امام حسن البنا لوگوں کی رہنمائی حکمت اور دانش سے کرتے تھے۔ وہ اتحاد کے داعی تھے۔ وہ تفرقہ پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے، وہ انتشار پھیلانے کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم پارلیمنٹ کے ذریعے تبدیلی لائیں گے۔ قانون کے ذریعے تبدیلی لائیں گے، ہم لڑائی نہیں کریں گے، فساد نہیں کریں گے، لیکن امن پسندی اور روشن خیالی کے راگ الاپنے والوں کو دیکھیں اسی امن کے علَم بردار کو قتل کر دیا۔

○ آپ نے ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ کا نام پہلی دفعہ کب سنا؟

● ہم نے ان کا نام ۴۰ کے عشرے میں سنا۔

○ آپ کو ان کے بارے میں ان کی تصنیفات کے ذریعے علم ہوا۔

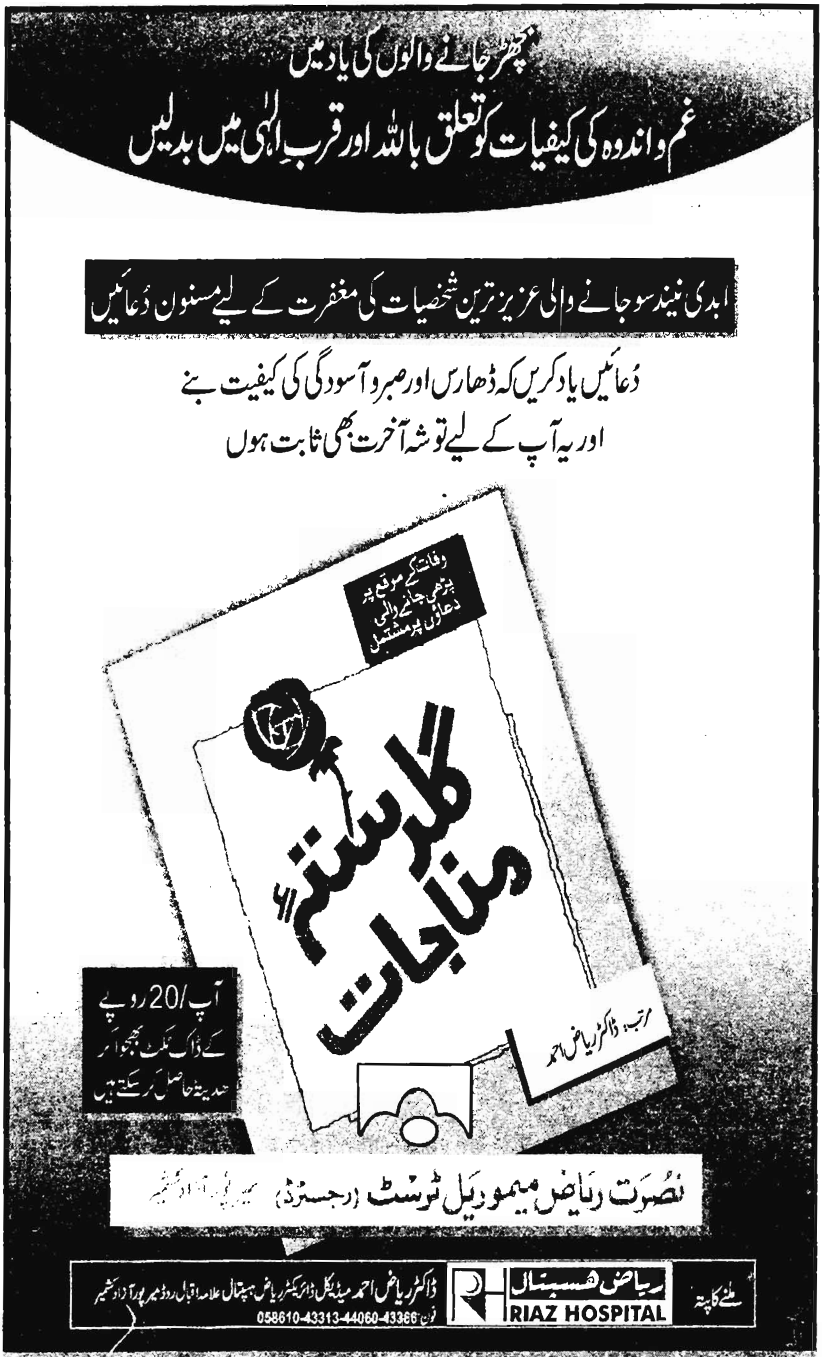
● جی ہاں ان کی کتابوں کے ذریعے مثلاً قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔

○ تحریک اسلامی کے مستقبل کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

● اسلامی تحریک کا مستقبل یقیناً مامون و محفوظ ہے، ان شاء اللہ۔ دعوت کے لیے اپنا سب کچھ خاص طور پر اپنا سارا وقت کھپا دینے کی ضرورت ہے۔ فقہ اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو سمجھ دار لیکن متحرک و فعال ہونا چاہیے، وہ لوگ جو علم دین و دنیا رکھتے ہوں، انھیں آگے لانا چاہیے۔

❋❋❋

تمھاری شکست کے دو ہی اسباب ہیں: آپس میں اختلاف، اور نیتوں کا فتور۔ تم جب بھی آپس میں لڑے، تمھاری ہوا اکھڑ گئی۔ جب بھی تمھاری نیتیں بگڑیں اور دلوں میں دنیا کی محبت نے آخرت کی جگہ لے لی، تو تم تائید ربانی کے حصول میں پیچھے رہ گئے۔ **حسن البنا شہید**



بچھڑ جانے والوں کی یاد میں
غم و اندوہ کی کیفیات کو تعلق باللہ اور قربِ الٰہی میں بدلیں
ابدی نیند سو جانے والی عزیز ترین شخصیات کی مغفرت کے لیے مسنون دُعائیں
دُعائیں یاد کریں کہ ڈھارس اور صبر و آسودگی کی کیفیت بنے
اور یہ آپ کے لیے توشہ آخرت بھی ثابت ہوں
وفات کے موقع پر پڑھی جانے والی دعاؤں پر مشتمل
گلدستۂ مناجات
مرتب: ڈاکٹر ریاض احمد
آپ /20 روپے کے ڈاک ٹکٹ بھجوا کر ہدیۃً حاصل کر سکتے ہیں
نصرت ریاض میموریل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
ملنے کا پتہ
ریاض ہسپتال
RIAZ HOSPITAL
ڈاکٹر ریاض احمد میڈیکل ڈائریکٹر ریاض ہسپتال علامہ اقبال روڈ میرپور آزاد کشمیر
فون 058610-43313-44060-43366

PYRAMEDIA

اللہ کی نشانیاں

اور اُس کی نشانیوں میں سے

یہ ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکا یک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔

اور اُس کی نشانیوں میں سے

یہ ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری جنس سے بیویاں بنائیں تا کہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اور اُس کی نشانیوں میں سے

آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔

اور اُس کی نشانیوں میں سے

تمھارا رات اور دن کو سونا اور تمھارا اُس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں۔

اور اُس کی نشانیوں میں سے

یہ ہے کہ وہ تمھیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اُس کے ذریعہ سے زمین کو اُس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

اور اُس کی نشانیوں میں سے

یہ ہے کہ آسمان اور زمین اُس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جونہی کہ اُس نے تمھیں زمین سے پکارا، بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔ (الروم: ۲۰ - ۲۵)

دینی کالم کیسے لکھا جائے

امام حسن البنا شہید

جریدۃ الاخوان المسلمین کے اس دینی شعبے کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے۔ میں نے اس کی بے شمار مشکلات اور صعوبتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اسی کی مدد اور توفیق کی اُمید پر اس ذمہ داری کو قبول کیا ہے۔ اس شعبے کے مباحث کا تعلق عقائد، فقہ و اصولِ فقہ، تصوف و اخلاق، دینی مواعظ اور فتاویٰ جیسے موضوعات کے ساتھ ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ روزِ اول سے اس جریدے کے قارئین کرام کے سامنے وہ طریقہ تحریر اور اسلوبِ نگارش رکھ دوں کہ جس پر چلنے کا میں نے عزم کیا ہے۔ مجلّے کی مجلسِ ادارت اس شعبے کو ایک علمی سلسلہ بنانا چاہتی ہے جس کے فکر و استدلال میں ایک تسلسل ہو، جس کے ذریعے ایک مسلمان اپنے دین کے ان احکام کو معلوم کر سکے، جن کا جاننا اس کے لیے ضروری ہے۔

○ جون ۱۹۳۳ء میں اخوان المسلمون نے اپنے ہفت روزہ جریدۃ الاخوان المسلمین کا آغاز کیا تو اس کے دینی سیکشن کی ذمہ داری امام حسن البنا کے سپرد کی گئی۔ اس وقت تک اکثر علما، ایک قدیم اسلوب تحقیق و تحریر کے پابند تھے۔ امام نے نیا اسلوب اختیار کرتے ہوئے شروع ہی میں وضاحت کر دی کہ ان کی تحریروں کا انداز اور طریقہ کار کیا ہوگا۔ اس ضمن میں انھوں نے پوری شرح و بسط کے ساتھ ایک مفصل مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ فکری تجدید کے میدان میں ایک مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالے نے علوم اسلامیہ کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے۔ اس میں تفسیر، عقائد ،فقہ، تصوف، مواعظ اور فتاویٰ پر وقیع مباحث آ گئے ہیں مگر تفسیر پر ایک مستقل مضمون بھی اس اشاعت میں شامل ہے جو الگ سے شاملِ اشاعت ہے۔ باقی ترجمہ و تلخیص پیش خدمت ہے۔ ترجمہ: سید حامد عبدالرحمٰن الکاف، صنعا، یمن

مجھے امید ہے کہ قارئین کرام میری ان گزارشات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور پھر جب کسی موضوع کے بارے میں انھیں کوئی شبہہ لاحق ہوگا تو ان گزارشات کی طرف رجوع کریں گے۔ مذکورہ فنون کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے میں درج ذیل امور محترم قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں:

۱- ہر دور میں لکھنے کا ایک طریقہ ہوا کرتا ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے ذوق، فہم اور مطالعے کے طریقوں سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ ایسے ہی اسلوب کو اختیار کیا جائے۔ اس مناسبت سے سابقہ زمانوں کی تالیفات کا اپنے زمانے کے مطابق، ایک رنگ اور مزاج ہوتا تھا، اور اس مزاج کی وہ عکاسی کرتی تھیں۔ اسلامی لٹریچر کی تدوین کے پہلے دور میں تالیفات کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں کتاب کو متن اور سند تک محدود رکھا جاتا تھا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ بہت مختصر انداز میں بعض حواشی لکھ دیے جاتے جن میں اپنی رائے کا اظہار کیا جاتا تھا۔ مؤطا امام مالک، مسند احمد اور حدیث کی اولین کتابیں اسی طرز پر مرتب کی گئیں۔ بعد ازاں مؤلفین احکام کی تلخیص، ترتیب اور ان پر عملی مسائل کی تطبیق کی طرف متوجہ ہوئے، جیسا کہ امام شافعیؒ کی کتاب الاُم اور سرخسیؒ کی کتاب المبسوط کا انداز ہے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جس میں مؤلفین احکام کو بیان کرتے، فروعی مسائل میں بکثرت استنباط کرتے اور سابقہ مؤلفین کی کوششوں پر اعتماد کرتے ہوئے بعض شروط کا ذکر کرتے یا پھر اُن لفظی باریکیوں کی وضاحت کرتے تھے جن کے ذریعے مفصل تعلیقات، حاشیہ نویسی اور شروح لکھنے کا دور آیا۔ اس طرح آپ دیکھیں گے کہ ہر دور کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ اپنی مخلوقات میں، اللہ کی یہی سنت رہی ہے۔ کسی حکیم کا مقولہ ہے کہ: اپنی اولاد کو جبراً اپنے ضابطوں کا پابند نہ بناؤ، کیونکہ وہ ایک ایسے زمانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں جو تمھارے زمانے سے مختلف ہے۔

۲- ہمارا دور تصنیف و تالیف اور علوم و معارف کی ترقی کا دور ہے، اس دور میں ترتیب و تہذیب کے نئے اسلوب سوچے گئے اور عبارت کو سہل بنانے کے نئے نئے طریقے دریافت کیے گئے۔ لیکن ہم دینی کتابوں کے میدان میں جہاں تھے وہیں ہیں۔ ہم نے جدید دور کی کوششوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ ہمارا اعتماد اور انحصار پوری طرح سابقہ کتابوں پر ہے۔ ہم نے اپنے

زمانے کی کوئی خدمت نہیں کی ہے۔ ہم ابھی تک اپنے اسلاف پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ اس علمی قناعت کے راستے کو چن کر ہم دینی علوم سے بہت کم فائدہ اٹھا سکتے ہیں، کیونکہ (سابقہ زمانے کی) کتابوں کی تالیف، ترتیب اور لکھنے کا طریقہ بہرطور آج کے دور سے مختلف ہے۔

۳- یہ حقیقت کئی مواقع پر روز روشن کی طرح نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے: مثلاً:

● اگر آپ خرید و فروخت کے کسی مسئلے کو فقہ کی کتابوں میں تلاش کرنا چاہیں تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ متعلقہ مسئلے کو تلاش کرنے اور اس مقام تک پہنچنے کے لیے آپ کو بہت محنت درکار ہوگی۔ اس کے بعد بکھرے ہوئے احکام کو جمع کرنے کے لیے آپ کو مزید وقت صرف کرنا پڑے گا۔

● بعض جدید معاملات ایسے ہیں کہ جن سے فقہ کی بڑی بڑی کتابیں یک سر خالی ہیں۔ مثلاً بینکوں کے کاروبار اور نوٹوں کے معاملات وغیرہ، یہ سب ایسے امور ہیں جن کی تحلیل و تحریم کا تعلق دین اور فقہ سے ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم انھیں اپنی جامع اور مستند کتابوں میں نہیں پاتے۔ اس کا سبب بالکل واضح ہے۔ یہ مسائل ہمارے متقدمین کے زمانوں میں موجود ہی نہیں تھے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ائمہ کرام کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں جدید مسائل کا حل ڈھونڈیں۔

● بعض مسائل و احکام کی بے حد تفصیل جن کا آج وجود ہی نہیں ہے جیسے غلامی کے مسائل کی اس کثرت سے مثالیں پیش کرنا کہ شاید ان کتابوں کا کوئی باب ان کے ذکر و بیان سے خالی نہ ہو۔ اسی طرح ان کتابوں میں پرانے اوزان، پیمانوں اور مسافتوں کی مثالیں پائی جاتی ہیں، جب کہ ہم عصر حاضر کے اوزان، پیمانوں اور مسافات کے محتاج ہیں۔

● اگر آج کا تعلیم یافتہ نوجوان آپ سے کسی ایسی کتاب کے بارے میں دریافت کرے جس میں عقائد اسلام کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہو یا جس میں عبادات کے احکام ایسے طریقے سے ذکر کیے گئے ہوں کہ وہ اس کے ذہن کو اپیل کریں، تو آپ کس کتاب کا نام تجویز کر سکتے ہیں؟ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ ایسی مختصر اور اطمینان بخش تحریر کا طالب ہے جس کو کم سے کم وقت میں پڑھا جا سکتا ہو، کیونکہ جدید تعلیمی نظام میں اس کو ایسا ہی سکھایا گیا ہے اور اس نے ایسا ہی سیکھا ہے۔ میرا مقصد متقدمین کو تنقید کا نشانہ بنانا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے، انھوں

نے اپنے اپنے زمانوں میں تصنیف و تالیف کا کام ٹھیک اس اسلوب میں سرانجام دیا جس طرح اس وقت کی ضرورت تھی۔ اس خدمت کے لیے ہم ان کے احسان مند ہیں کہ انھوں نے ہمارے لیے یہ عظیم علمی ذخیرہ چھوڑا ہے، جو دلائل اور احکام سے بھرپور ہے۔ تاہم اس مقام پر میں معاصر علما کی ہمتوں کو للکارنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے زمانے میں دین کی خدمت بجالائیں اور تصنیف و تالیف کا کام عصر حاضر کے لوگوں کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر انجام دیں۔ جس طرح ایک بوڑھے کسان نے کہا ہے: ''ہم سے پہلے کے لوگوں نے بویا تو ہم نے کھایا اور اب ہم بو رہے ہیں تاکہ ہمارے بعد آنے والے کھا سکیں''۔ ہم نہیں چاہتے کہ اسلامی علوم کے روایتی علمی حلقوں میں ہم ایک ایسا حلقہ بن کر رہ جائیں جو غفلت کا شکار ہو چکا ہے اور جس کے بارے میں ہمارے بچے اور پھر ان کے بچے یہ کہیں کہ وہ بے عملی اور تساہل پسندی کے شکار اور فرض ادا نہ کرنے والے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم ایک ایسا حلقہ بنیں جو اسلامی علوم کو اپنے اسلاف کی طرح ایک بہترین اسلوب میں ڈھالے تاکہ وہ بعد میں آنے والوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

اس لیے جریدۃ الاخوان المسلمین میں ان شاءاللہ مَیں جو اسلوب اختیار کروں گا وہ بعض اوقات ہماری دینی کتب سے مختلف ہوگا، لیکن وہ لازمی طور پر علوم اسلامیہ کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اس سمندر سے ہی اپنی غذا اور قوت حاصل کرے گا کہ جس کی تہہ میں اسلاف کی دانش، محنت، تحقیق اور تفقہ فی الدین کے لعل و جواہر موجود ہیں۔

اگرچہ یہ اسلوب نگارش اپنی ترتیب اور نظم میں اچھوتا اور نیا ہوگا، لیکن اپنے اصول و احکام اور قواعد و ضوابط میں ہرگز جدید نہیں ہوگا کیونکہ اسلام کے یہ اصول ثابت اور غیر متبدل ہیں اور ان میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوتا۔ بلکہ میں اپنے قابل احترام قارئین سے توقع کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس کانٹوں بھرے راستے پر چلنے میں مدد دیں، تاکہ ہم مل کر حقیقت کو دریافت کرسکیں۔ میرے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی کہ کوئی معزز قاری میرے طریق کار کی اصلاح کرے یا اپنے اس بھائی کو کوئی اچھا مشورہ دے۔ ان شاءاللہ میں ہر ایسی نصیحت کو قبول کروں گا اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں گا۔

○ اوّلاً، **عقائد**: ہم اس موضوع پر لکھتے ہوئے دو بنیادی امور کا خیال رکھیں گے:

پہلا یہ کہ: قرآن کریم اور رسول اللہؐ کے اس طریقے پر اعتماد جسے وہ دینی عقائد کو قلوب میں

اتارنے اوران کواحساسات سے لبریز کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے ہیں۔ الفاظ کی گہرائیوں میں جانے، تحقیقات کے سمندر میں غوطہ زن ہونے، اور مختلف مذاہب و آرا کا تذکرہ کرنے کے بجائے دل ودماغ کو گرفت میں لینا۔ فلاسفہ، اصحابِ منطق اور اہلِ کلام کی اصطلاحات کے بکھیڑوں میں الجھ کر رہ جانے کے بجائے صاف، سادہ اور پراثر طرزِ تحریر کو اختیار کرنا کہ سلف صالحین کا طریقہ یہی ہے۔

دوسرا، اس بات کا خاص طور پر اہتمام کرنا کہ انسانی زندگی پر ان عقائد کے اثرات کو بیان کیا جائے تاکہ قاری یہ جان سکے کہ اس کے نفس پر یہ اثرات کس حد تک موجود ہیں؟ اگر ان عقائد کا اثر اس کی زندگی پر گہرا ہے تو وہ اللہ کی اس نعمت پر شکر بجالائے۔ اگر یہ اثرات کمزور ہیں، تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کا مداوا کرے اور اپنے ایمان کو مضبوط بنائے۔ یاد رہے کہ ہمارے اسلاف کے عقائد، ان کے احساسات اور جذبات میں پوری طرح جذب ہو کر ان کی زندگیوں پر غلبہ حاصل کر چکے تھے۔ اس کے برعکس جب یہ عقائد جنگ و جدل اور قیل و قال میں تبدیل ہوئے تو امت کا ایمان کمزوری کا شکار ہو گیا اور اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

ہم اس اصول کی پیروی جدید شبہات کا جواب دینے، ان کی تردید کرنے اور بعض جدید نظریات سے اسلامی عقائد پر استدلال کرتے ہوئے کریں گے، اس لیے نہیں کہ ہم خلط مبحث کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ ہم اُن سے استنتاج و استنباط کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مصداق: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۵۳) ہم ان کو آفاق اور خود ان کے اپنے نفوس میں اپنی نشانیاں (کچھ اس طرح دکھائیں گے) کہ ان پر یہ بات (پوری طرح) واضح ہو جائے گی کہ وہ صحیح اور سچی نشانیاں (آیات) ہیں۔

○ ثانیاً، **فقہ**: جہاں تک فقہ کا تعلق ہے تو اس پر قلم اٹھانا کئی وجوہ سے ایک مشکل کام ہے۔ ایک تو اس کی جزئیات کی کثرت ہے، دوسرے اس کے اسلوب کی پیچیدگیاں اور پھر اصول میں اختلافات اور ان میں سب سے اہم پہلو فقہی مذاہب کا تعدد اور پھر خود ان کے اندر اختلاف در اختلاف کا ہونا ہے۔ یہ اختلافی آرا، امت میں کچھ اس طرح سے جم گئی ہیں کہ ان کے خلاف جانا لوگوں کے نزدیک گویا کہ ایک قسم کا کفر والحاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں ذرا سی بات بھی کی جائے تو وہ بڑی شدت سے بحث پر اتر آتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا میں کسی خاص فقہی مذہب کے بارے میں اپنے مطالعے کے مطابق لکھوں تاکہ لوگ اس سے استفادہ کرسکیں؟ لیکن اس طرح تو اپنے آپ کو خود ہی ایک حلقے تک محدود کرلینا ہے ، اور باقی لوگ محرومی کا شکار ہوں گے۔ یا پھر میں ان سب کے لیے سارے فقہی مذاہب کے مطابق لکھوں؟ یہ ایک طرف تو نہایت مشقت طلب کام ہوگا اور دوسری طرف قاری بھی پریشان اور مضطرب ہو جائے گا، بالخصوص عام طبقات سے تعلق رکھنے والا قاری۔ علاوہ ازیں اس میں ابحاث کی کثرت کے نتیجے میں خود کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ سے جو اسلامی قانون کے بنیادی مآخذ اور سرچشمے ہیں، ان سے قطع تعلقی بھی دکھائی دیتی ہے۔

پھر کیا میں احکام کی آیات و احادیث لکھوں حالانکہ قارئین ابھی اجتہاد کے فہم و قبول کے درجے تک نہیں پہنچ سکے ہیں؟ نہ ان کے اوقات میں اتنی گنجایش ہے کہ استنباط اور فہم کی کوشش کرسکیں۔ جب تک وہ اپنے فہم کو منظم نہ کرلیں اور اصولی ضوابط سے آشنا نہ ہوجائیں، ان کے لیے استفادہ کرنا تو دور کی بات ہے، وہ خود انتشار کا شکار ہوکر رہ جائیں گے۔ تو کیا پھر میں اپنے فہم کے مطابق ان آیات اور ان احادیث کی شرح بیان کروں؟ نہیں، اس طرح تو علیحدہ سے ایک نیا فقہی مذہب وجود میں آجائے گا۔ نئے مذہب کی تاسیس سے تو کہیں آسان یہ ہے کہ مجھے ایک پہاڑ کو زمین کے دوسرے کونے تک پہنچانے کے لیے کہا جائے۔ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں۔

اسی طرح کے مختلف امور پر میں عرصہ دراز تک غور و فکر کرتا رہا ہوں۔ اور اب مجھے پورا اطمینان ہو چکا ہے کہ فقہ پر کچھ اس طرح قلم اٹھایا جائے کہ اس سے امت کی تعلیم و تربیت ہو، اور وہ اس سے حقیقی فائدہ اٹھا سکے۔ جب آپ ایک ایسے مجمعے کو فقہ کی تعلیم دیتے ہیں، کہ جس میں کم تعلیم یافتہ بھی ہیں اور پڑھے لکھے لوگ بھی، تو ایسے میں آپ کے لیے نہایت دشوار ہوتا ہے کہ کس چیز کو اختیار کریں اور کون سا راستہ منتخب کریں؟ بلاشبہہ اس حیران کن صورت حال کا عوام کو جہالت کی تاریکی میں دھکیلنے میں بڑا ہاتھ ہے، خصوصاً عبادات کے دائرے میں۔ اپنی وزارت اوقاف کو لے لیجیے۔ اُس نے اِس مشکل کو حل کرنے کا بیڑا اٹھانے کا اعلان کیا، جس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی نے بڑی کوشش کی، لیکن بالآخر اسے بھی چاروں مکاتب فکر کے اصول پر مبنی عبادات کے احکام پر مشتمل کتاب شائع کرنا پڑی، جس کے لیے وہ بہرحال شکریہ کی مستحق قرار پاتی ہے۔ تاہم

مذکورہ کتاب میں بھی عبادات کے مسائل میں مختلف فقہی اقوال جمع کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کیا گیا۔ پھر یہ احکام ایک ایسے انداز میں پیش کیے گئے کہ اس سے فائدہ اٹھانا صرف علما ہی کے بس میں ہے۔ یوں اس کاوش نے عوام کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچایا اور صرف ایک حوالے (reference) کی کتاب ہی مرتب ہو کر شائع ہو سکی ہے۔

میں نے لمبے عرصے تک اس مشکل صورت حال کے بارے میں سوچ بچار کی اور بڑی مشقت کے بعد مجھے اس مشکل سے نکلنے کا جو راستہ نظر آیا وہ میں آپ کے سامنے بیان کروں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کوئی فیصلہ کن بات عرض کر رہا ہوں بلکہ یہ ایک ایسی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے میرے ذہن میں ڈال دی ہے۔ میرے لیے اسے آسان بنا دیا ہے۔ مجھے اسی میں فائدہ نظر آیا ہے۔ اگر اس میں سے آپ کو بھی کوئی فائدہ پہنچے یا پھر آپ کے ذہن میں کوئی نئی بات آجائے تو اس میں مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کرلیں، میرے ساتھ بانٹ دیں۔ اس طرح یہ ممکن ہو جائے گا کہ ہم اور آپ مل کر اس پہاڑ جیسے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں اور فقہ اسلامی کے مطالعے کے لیے ایک کشادہ اور ہموار شاہراہ تعمیر کرسکیں، کیونکہ یہ معاملہ کسی ایک شخص کے بس سے باہر ہے۔

میرے ذہن میں جو طریقہ آیا ہے وہ یہ ہے کہ اس موضوع پر لکھنے کے تین درجات ہونے چاہییں:

پہلا درجہ: اس میں ہم عوام کے لیے وہ کیفیات و احکام کو پیش کریں گے کہ جن پر ائمہ فقہ کا اتفاق ہے۔ ہم فقہی دلائل کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ اس میں ہم ان امور کا انتخاب کریں گے جن کا تعلق ترغیب و ترہیب، دینی اور دنیوی فوائد اور شریعت کے عمومی اسرار و رموز سے ہے۔ اس طرح ایک عام فرد بھی اپنی عبادت کے احکام معلوم کرسکتا ہے، ان میں بہتری لاسکتا ہے اور ان کو اسی طرح ادا کرسکتا ہے جس طرح کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا منشا ہے۔ نیز اس کے ساتھ وہ ان عبادات کے دینی و دنیوی فوائد کا احساس کرسکتا ہے۔

دوسرا درجہ: اس میں ہم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ائمہ کرامؒ کے ذخیرۂ علم کی مدد سے ہر عمل کی کیفیت اس کے احکام کے ساتھ بیان کریں گے۔ ساتھ ہی ان کے دلائل کا بھی ذکر

کریں گے۔ اس حصے کے آغاز میں ایک مقدمہ بھی ہوگا جس میں ہم اصولی اصطلاحات اور ائمہ کے اختلاف کے اسباب بیان کریں گے۔

تیسرا درجہ: اس میں ہم اختصاص کا درجہ رکھنے والے علما کے لیے مختلف فقہی مسائل اور ان کی ترجیح کے مختلف پہلوؤں کو ائمہ کے اقوال کے ساتھ واضح کریں گے۔ اس طرح مسائل میں تحقیق وجستجو کرنے والا اس مسئلے میں سب راجح ومرجوح کو جان سکے گا اور ایک ایسی راے تک پہنچ سکے گا جو اس کے لیے اطمینان بخش ہو۔ واضح رہے کہ یہ حصہ صرف ان علما کے لیے ہوگا جن کے قدم تحقیق وریسرچ کے میدان میں خوب راسخ ہو چکے ہوں، یقیناً ایسے حضرات تعداد میں کم ہوں گے۔

جریدة الاخوان المسلمین میں ہم پہلی دو قسموں کو ترجیح دیں گے۔ رہی تیسری قسم تو ان کے لیے فقہ اور حدیث کی جامع کتابیں کافی ہیں۔

ہم ان تحریروں میں ان شاءاللہ حسب ذیل امور کی رعایت رکھیں گے:

۱- فروعی مسائل میں مفروضوں پر بات کرنے سے گریز کیا جائے گا۔

۲- جہاں تک ہوسکے مشکل اصطلاحات کو استعمال کرنے سے احتراز کریں گے۔

۳- عبارت سہل، سلیس اور سیدھی سادی ہوگی۔

۴- فقہی احکام کو ان کے قواعد، اسرار اور حکمتوں کے ساتھ کچھ اس طرح مربوط کریں گے کہ ان کا روکھا پن جاتا رہے گا۔

○ **ثالثاً، تصوف**: تصوف اگرچہ رسمی طور پر علوم اسلامیہ میں نہیں شمار ہوتا، لیکن وہ امت میں دیگر علوم سے زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ اس کے کلیات اور احکام لوگوں کے قلوب اور نفوس میں گھر کر چکے ہیں۔ اس کی کتابیں اس کے مختلف طبقات میں متداول ہیں۔ اس لیے جو شخص بھی علوم اسلامیہ پر قلم اٹھانا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے صحیح مقام کو پہچانے۔

درحقیقت صحیح تصوف اسلام کا خلاصہ ہے اور سچے صوفیا ہی وہ لوگ تھے، جنھوں نے اس دین کو پھیلانے اور اس کو تقویت دینے کے لیے اسلامی تصوف کو اختیار کیا۔ اس میدان میں ان کے علاوہ کوئی فلسفی یا کسی قسم کا مربی اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔

میری راے میں تصوف کی دو قسمیں ہیں: ایک حقیقی اسلامی تصوف جو اپنے اصول واحکام،

کتاب اللہ اور سنت رسولؐ اللہ سے حاصل کرتا ہے۔ دوسرا ہے فلسفیانہ تصوف، جو اپنے اصول اور مبادی مختلف فلسفوں پر مبنی نظریات سے حاصل کرتا ہے۔ افسوس کہ یہ دونوں تصوف گڈ مڈ ہو گئے ہیں اور اس حد تک خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان میں حق اور باطل کی تمیز کرنا بے حد مشکل ہو گیا ہے، اس تصوف کا اثر یہاں تک بڑھ چکا ہے کہ کتاب اللہ کی تفسیر اور سنت رسول اللہ کی تشریح تک میں فلسفیانہ آرا کو استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اب صوفیا کی اپنی خاص زبان اور ایسی اصطلاحیں وضع ہو چکی ہیں جو ان کے لیے ہی خاص سمجھی جاتی ہیں۔

پھر حقیقی اسلامی تصوف کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک قسم تو وہ ہے جس کا مقصد تربیت نفس، اس کی تہذیب و تطہیر اور اس کو اچھے اخلاق پر ابھارنا اور فضائل میں کمال حاصل کرنا ہے۔ اس کو عام طور پر علم المعاملۃ کا نام دیا جاتا ہے۔ رہی دوسری قسم تو اس کا تعلق ریاضت و عبادت کے ان نتائج اور ثمرات سے ہے جن کا تعلق ذوق، وجد، فیض اور کشف وغیرہ سے ہے۔ یہ دونوں اقسام بھی آپس میں اس حد تک خلط ملط ہو چکی ہیں کہ ان میں تمیز کرنا مشکل ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے بعض مرید نتیجہ اور ثمرات سے تو چمٹنا چاہتے ہیں لیکن اسے حاصل کرنے کے لیے وہ راستہ اختیار نہیں کرتے جو اس کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ اس شوق میں دین کے مطلوب راستے سے ہی غفلت برتنے لگتے ہیں اور شریعت کے احکام کو کوئی حیثیت نہیں دیتے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ تصوف میں بھی انسانی خواہشات اور مختلف سیاسی و اجتماعی اہداف و اغراض گھس آئے ہیں۔ تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں ہے لیکن ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ تصوف[1] کے بارے میں لکھتے ہوئے ہم درج ذیل اصولوں کو مدنظر رکھیں گے، ان شاءاللہ

۱- علم المعاملۃ کے احکام کا ذکر اور کتاب و سنت سے ان کے دلائل پیش کرنا۔

۲- ان کے ایسے نتائج اور ثمرات کا مختصر بیان جو ذوق اور وجدان سے تعلق رکھتے ہیں اور جو راہ سلوک پر چلنے کے لیے مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اہتمام کہ وہ نہ تو کتاب اللہ

۱- یہ وہی اجمال ہے جس کی طرف مولانا مودودی نے اپنی کتاب دینیات، ہدایات اور دیگر مقامات پر صرف اشارہ کیا ہے تفصیل نہیں بیان کی۔ الامام البناؒ نے اس گھنے جنگل میں سے اسلامی تصوف کی سیدھی اور واضح راہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے ان کی ایسی تحریروں کی اہمیت اور ضرورت دوچند ہے۔ (الکاف)

سے متصادم ہوں اور نہ سنت رسولؐ سے ٹکراتے ہوں۔

۳- ان فنی اصطلاحات کی صحیح تشریح جن کی کاشت اور پرداخت اس فن کے شیوخ اور ائمہ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

۴- شیوخ کی سیرتوں اور ان کے کلام و بیان میں مثالی نمونے کی تلاش پر ارتکاز۔

۵- اس علم کے عملی پہلو پر خصوصی توجہ مرکوز کرنا، کیونکہ یہی اس کی بنیاد اور اصل ہے۔ اللہ اس کام کی توفیق عنایت فرمائے۔

○ رابعاً، عمومی خطبات: ان شاء اللہ، اس میدان میں ان امور کو ملحوظ خاطر رکھیں گے:

۱- عبارت سہل ہو جس میں موضوعات اور مضامین وضاحت سے پیش کیے گئے ہوں، ہم قافیہ و ہم وزن الفاظ اور مسجع و مقفع عبارتوں کے استعمال سے اجتناب۔

۲- جملوں کی ساخت اور مقدار متوسط ہو، یعنی وہ نہ تو لمبے ہوں کہ اکتاہٹ پیدا کریں اور نہ اتنے چھوٹے اور مختصر کہ پیغام پہنچانے سے قاصر ہوں اور بات بے معنی ہو کر رہ جائے۔

۳- دلائل قرآن اور حدیث پر مبنی ہوں گے اور صرف ان مسائل سے تعرض کریں گے جن سے سامعین آشنا ہیں تاکہ وعظ دلوں میں ایک مؤثر عامل بن کر داخل ہو۔

۴- ایک وقت میں صرف ایک مسئلے یا ایک فکر پر گفتگو کی جائے، تاکہ وعظ کے احکام، نتائج اور ثمرات کی توضیح اور بیان کا مرکز وہی نکتہ ہو اور اختتام خطاب پر وہ سامعین کے دل و دماغ میں رچ بس جائے۔

۵- موضوعات سامعین کی زندگیوں سے براہ راست اور گہرا تعلق رکھتے ہوں، تاکہ وہ محسوس کریں کہ یہ مواعظ ان کو راہ راست پر چلانا چاہتے ہیں اور ان کو ضرر اور نقصان سے بچانا ہی ان کا مقصد ہے۔

۶- بذات خود یہ موضوعات آپس میں مربوط ہو کر ایسے نکات میں تبدیل ہو جائیں، جن کا ہدف سامعین کو صرف ثقافت اسلامیہ سے بخوبی روشناس کرانا اور ان کو اس کے رنگ میں رنگنا ہوگا۔

۷- وعظ میں ایک نکتے سے دوسرے نکتے کی طرف منتقلی واضح انداز میں ہو اور اس میں

معلوم اور محسوس چیزوں کی مثالیں دی جائیں، تاکہ نامعلوم چیزوں اور امور کا ادراک ہو سکے۔

○ خامساً، فتاویٰ: اب رہا فتوے کا معاملہ تو ہم ان میں ائمہ اور ان کے مذاہب، دلائل کے ساتھ بیان کریں گے اور یہ بات قاری پر چھوڑ دیں گے کہ وہ اس رائے کو اختیار کرے جس پر اس کا دل مطمئن ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم آخر میں خود اپنی رائے بھی قاری کے سامنے رکھ دیں کہ وہ چاہے تو اسے اختیار کرے اور چاہے تو چھوڑ دے۔ میں قارئین کرام اور استفتا کرنے والوں سے درخواست کروں گا کہ وہ خوب یاد رکھیں کہ دین اسلام آسان ہے۔اور یہ بھی کہ اس کے فروع اور جزئیات میں اختلاف موجود ہے۔مگر یاد رکھیے کہ عیب، بذات خود اختلاف میں نہیں، بلکہ کسی ایک رائے پر تعصب کے ساتھ جم جانے میں ہے۔ اس لیے جب ہم فتووں کے آخر میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو ہم لوگوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرتے کہ وہ صرف ہماری رائے پر چلیں، بلکہ ہم اس بات کو خوش آمدید کہتے ہیں کہ وہ ہماری رائے پر بحث کریں، ہم دلیل کی بنیاد پر اپنی رائے سے رجوع کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔

○ سادساً، ماثور دعائیں: اس سے ہماری مراد وہ دعائیں اور اذکار ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کردہ ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جو قاری چاہے ان کو یاد کر کے ان کے ذریعے اپنے رب کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ اس کے ذریعے وہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور آپؐ کے نقش قدم پر چلنے کا اجر پائے گا، وہیں اس کو دعا کا ثواب بھی ملے گا۔ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ (اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہی بہترین ذات ہے جس کے حوالے معاملات اور امور کیے جاسکتے ہیں)۔(الکتاب الاول من سلسلہ تراث الامام البنا، مرتبہ جمعہ امین عبدالعزیز الاسکندریہ، ص ۲۳-۳۵)

✲✲✲

وقت کا فاتح

بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان واسبابِ کار فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم وفاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا، تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سروسامان نہیں، تو اپنے ہاتھوں سے تیار کروں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے۔ اگر آدمی نہیں ملتے، تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں، تو پتھروں کو چیخنا چاہیے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ، درختوں کو دوڑنا چاہیے، اگر دشمن بے شمار ہیں، تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں۔ اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں، تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہوگیا کہ راہ صاف نہیں کرتے!

وہ زمانے کی مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے۔ وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے، اور زمانے کے حکموں پر نہیں چلتا، بلکہ زمانہ آتا ہے، تاکہ اُس کی جنبشِ لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھرلوں! وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے، جس کو پورا کردوں۔

ابوالکلام آزاد

اے ہمارے رب!

ہم اپنے ابیّ [ڈاکٹر محمد نثار احمد] اور امیّ [نادرہ اقبال] کے لیے
تیرے حضور دست بہ دعا ہیں:

رَبِّ اغْفِرْ لِوَالِدَیَّ وَاجْعَلْ دَارَ ھُمَا مَعَ الْاَنْبِیَآءِ
وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا

اے اللہ! ہمارے والدین کی مغفرت فرما، اور انھیں انبیا، شہدا،
اور صدیقین کے ساتھ گھر دے۔ اور یہ ہی اچھے ساتھی ہیں۔

رَبِّ ارْحَمْھُمَا وَاعْفُ عَنْھُمَا وَأَلْبِسْھُمَا حُلَّۃَ الْعَافِیَۃِ
وَارْفَعْ دَرَجَاتَھُمَا وَاجْعَلْ قَبْرَھُمَا رَوْضَۃٌ مِّنْ رِّیَاضِ الْجَنَّۃِ

اے اللہ! دونوں پر رحم فرما، دونوں کو معاف فرما، دونوں کو عافیت کا لباس پہنا،
درجات کو بلند کر، اور ان کی قبروں کو جنت کے باغ کا ایک باغیچہ بنا دے۔

اے ہمارے رب!

- ہم گواہی دیتے ہیں کہ انھیں حقیقی فکر ہماری آخرت کی تھی، انھوں نے ہماری ایسی تربیت کی کہ ہم اور ہماری اولادیں تیری رضا کے لیے زندگی بسر کریں۔
- اے ہمارے رب، انھیں اپنے پاس جنت میں گھر عطا فرما، ہمیں ان کے ساتھ رکھ، تو یقیناً نہایت رحم کرنے والا اور خوب نوازنے والا ہے۔

◂ ڈاکٹر تنویر احمد رازی ___ ◂ ڈاکٹر نعمان احمد ___ ◂ ڈاکٹر حافظ زبیر احمد
◂ ڈاکٹر سمیرا آسی ___ ◂ صبا کوثر ___ ◂ ارم آسیہ

Designed By:
MANSHURAT

قرآن کی تفسیر کا اسلوب

امام حسن البنا شہید°

قرآنِ عظیم، رب العالمین کا کلام ہے، اس ہستی کا کلام کہ اس جیسا کوئی نہیں۔ اس ہستی کا کلام کہ جس کی صفات کی کوئی تشبیہہ نہیں دی جاسکتی اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ کلام، کلامِ مبارک اسی ذات عزوجل کے نور کا مظہر ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں: ''اللہ کے کلام کی ہر کلام پر فضیلت ایسے ہے جیسے خود اللہ کی فضیلت اس کی مخلوق پر ہے'' (ترمذی)۔ اللہ تعالیٰ نے اس کلامِ مجید کو اپنے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے نازل فرمایا تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو رشد و ہدایت کی راہ دکھلائے، اور انھیں جہالت و تاریکی کی ظلمتوں سے نکال کر نور کی شاہراہِ مستقیم پر لائے۔

رسولؐ اللہ کے الفاظ میں: قرآن مجید میں تم سے پہلے گزری ہوئی اقوام کا تذکرہ ہے، بعد والوں کی بابت خبریں ہیں اور تمھارے آپس کے معاملات کے بارے میں احکام ہیں۔ یہ ایک فیصلہ کن قانون اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ قرآن اللہ کی رسی ہے، اس کا نور ہے اور اس کی حکمت سے لبریز سدابہار نصیحت ہے۔ یہ ایسے صراط مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہے جو سیدھا' صاف' روشن اور بالکل واضح ہے۔ اس راستے میں خواہشات کی خارزار جھاڑیاں ہیں، نہ منزل مقصود پر

° امام حسن البنا ایک داعی حق ہی نہیں بلکہ منفرد شان کے حامل مفسرِ قرآن بھی تھے، تاہم ان کا تفسیری کارنامہ مختلف تحریروں اور خطبوں میں موجود ہے۔ امام شہید کے تفسیری منہاج کو جاننے کا ایک بنیادی مصدر یہ مضمون ہے۔ ترجمہ: فصیح اللہ عبدالباقی، راجا محمد ظہور۔ نظر ثانی: عبدالغفار عزیز

پہنچانے اور کامیابی سے ہم کنار کرنے میں کوئی شک۔ علما اس کتاب سے کبھی سیر نہیں ہوتے اور خداترس اس سے کبھی اکتاتے نہیں۔ یہ بار بار پڑھے جانے کے باوجود اپنی تازگی برقرار رکھتا ہے اور اس کے عجائبات کی کوئی حد نہیں ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جسے جب جنوں نے سنا تو وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (الجن ۷۲:۱) ''ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے''۔ جس نے اس کا علم پالیا، وہ سبقت لے گیا۔ جس نے اس کی روشنی میں بات کی، اس نے سچ کہا۔ جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا، اس نے عدل وانصاف کیا۔ جس نے اس کے مطابق عمل کیا، وہ اجر پاکر رہا، اور جس نے اس کتاب کی طرف بلایا، یقیناً اس نے سیدھے راستے کی طرف راہ نمائی کی۔ (ترمذی)

یہ ہے قرآن مجید___ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ پر اس لیے اتارا کہ اہل ایمان اس کی تلاوت کریں تو اس تلاوت کی بدولت ان کے سینے کھل جائیں، ان کے قلوب اس کے نور سے منور ہو جائیں اور وہ روزِ قیامت اس کے ذریعے اللہ کی قربت پائیں۔ قرآن سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی قربت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ پھر یہ قرآن اس لیے بھی ہے کہ اہل ایمان اسے اپنا دستورِ حیات اور نظامِ معاشرت بنالیں۔ یہ قرآن سعادت کی زندگی کے راستے بھی متعین کرتا ہے اور آخرت کی کامیابی اور نجات کا شعور بھی عطا کرتا ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (النحل ۱۶:۹۷) ''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے''۔ ایک اور جگہ پر ارشاد ہے: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ○ (طٰہٰ ۲۰:۱۲۴) ''اور جو میرے ذکر (درس نصیحت) سے منہ موڑے گا، اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی، قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے''۔

پروردگار نے قرآن کریم کی صرف تلاوت کا بھی بے پناہ اجر رکھا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ: ''(تلاوت) قرآن کا ماہر، روشن چہروں اور بزرگی والے نیکوکاروں میں شمار ہوگا''۔ لیکن جس شخص

کے لیے درست تلاوت دشوار ہو اور اس کوشش میں وہ اٹک اٹک کر بھی تلاوت کرے تو اس کے لیے دہرا اجر ہوگا" (مسلم)۔ آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: "جس نے کتاب اللہ کا ایک بھی حرف پڑھا تو اس کے لیے ۱۰ نیکیاں ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الم حرف ہے بلکہ 'الف' ایک حرف ہے 'ل' دوسرا اور 'میم' تیسرا حرف ہے"۔ (ترمذی)

قرآن کریم کی کامل توقیر، اور اللہ تعالیٰ سے اجر جزیل کی آرزو کرتے ہوئے اس کا انتہائی ادب واحترام ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ہر صاحب ایمان کے لیے ضروری ہے کہ ہمیشہ تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھتے ہوئے شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔ 'بسم اللہ الرحمٰن' پڑھے۔ خوب ٹھیر ٹھیر کر اور خوب صورت ترتیل سے تلاوت کرے اور اپنے ذہن وفہم کو مستحضر رکھے، تاکہ جو کچھ اسے کہا جا رہا ہے اسے سمجھ سکے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر وعطا کے وعدے ہوں، تو وہاں رک کر اللہ سے اس کے فضل کی درخواست کرے۔ جہاں اللہ کی طرف سے عذاب وسزا کی وعید ہو، وہاں ٹھیر کر اس سے پناہ طلب کرے۔ قرآن کریم مثالیں دے تو انھیں حقیقت کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرے۔ تلاوت ختم ہو تو صدق اللہ العظیم کہتے ہوئے اللہ کا یہ کلام سراسر سچا ہونے کا اقرار کرے۔ اس بات کی گواہی دے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیغام پورے کا پورا پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ مسلمان پر ایسا کوئی دن تو کبھی بھی نہیں آنا چاہیے کہ جس دن اس نے ایک بار بھی قرآن کریم کی زیارت تک نہ کی ہو۔ حضرت ابوموسیٰ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس بات سے حیا آتی ہے کہ میں نے کسی روز اپنے رب سے باندھے جانے والے عہد کی کم از کم ایک بار بھی زیارت نہ کی ہو۔ زید بن اسلم نے عطا ابن یسار سے اور انھوں نے حضرت سعید الخدریؓ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "اپنی آنکھوں کو بھی عبادت میں سے ان کا حصہ دیا کرو"۔ صحابہؓ نے دریافت کیا: عبادت میں سے آنکھوں کا حصہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: قرآن کریم میں دیکھنا، اس پر غور وفکر کرنا اور اس کے فرامین سے عبرت حاصل کرنا"۔ (ترمذی)

حضرت عبادہ بن الصامت سے مکحول نے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "قرآن کریم کی (ناظرہ) تلاوت بھی میری اُمت کی افضل عبادت ہے"۔ ہر بندۂ مسلم کو چاہیے کہ تلاوت قرآن کو اپنا معمول بنا لے۔ جب بھی قرآن ختم ہو اسے پھر سے پڑھنا شروع کر دے، تاکہ وہ کبھی

بھی اس حالت میں نہ ہو کہ قرآن کریم سے اس کا سلسلہ منقطع ہوجائے۔ اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جب قرآن کریم ختم کرتے تو پھر اس کے آغاز کی چار پانچ آیات کی تلاوت فرماتے، تاکہ تلاوت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوجائے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا: یارسولؐ اللہ! بہترین عمل کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: منزلِ مقصود پر پہنچتے ہی مسافر ہوجانے والے بن جاؤ‘‘۔ سائل نے پوچھا: منزل پر پہنچتے ہی مسافر بن جانا کیسے؟ آپؐ نے فرمایا: اس صاحب قرآن کی طرح کہ جو قرآن کا آغاز کرتا ہے اور چلتے چلتے جیسے ہی اختتام تک پہنچتا ہے پھر آغاز سے شروع کردیتا ہے۔ جب بھی منزل پر پہنچا دوبارہ آغاز کردیا۔ (مستدرک حاکم)

آپؐ نے ہمیں قرآن کریم حفظ کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرمائی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: صاحبِ قرآن روزِ قیامت آکر عرض کرے گا: ’’یا پروردگار! اس (قرآن) کا لباس عطا فرما‘‘۔ اسے بزرگی کا تاج پہنا دیا جائے گا۔ وہ عرض کرے گا: ’’پروردگار! مزید عطا فرما‘‘۔ اسے مزید بزرگی کا لباس پہنا دیا جائے گا۔ وہ عرض کرے گا: ’’پروردگار مجھ سے راضی ہوجا‘‘۔ پروردگار اس سے راضی ہوجائے گا (مستدرک حاکم)۔ صاحبِ قرآن سے کہا جائے گا: قرآن کریم کی تلاوت کرتے جاؤ، بلندیاں طے کرتے جاؤ۔ اسی طرح خوش الحانی سے اس کی تلاوت کرتے جاؤ جیسے دنیا میں کیا کرتے تھے۔ جنت میں تمھاری منزل وہیں ہے، جہاں تک تیری تلاوت کی آخری آیت تجھے پہنچا دے۔ (سنن نسائی)

یقیناً قرآن مجید کی تلاوت بھی باعث اجروثواب ہے، لیکن نزول قرآن کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس میں تدبر کیا جائے، اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھا جائے اور اس کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں جلوہ گر کیا جائے۔ جو صرف تلاوت ہی کو کافی سمجھے، نہ اس میں تدبر کرے اور نہ اس پر عمل، تو اس کے متعلق خدشہ ہے کہ وہ اس وعید کی زد میں نہ آجائے جسے امام بخاری نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے: یامعشر القرآء استقیموا فقد سبقتم سبقاً بعیدا وان اخذتم یمیناً وشمالاً لقد ضللتم ضلالاً بعیداً۔ ’’اے قاریوں کی جماعت! تم سیدھی راہ اختیار کرو، اس لیے کہ تم بہت پیچھے رہ گئے ہو۔ اگر کہیں تم دائیں بائیں ہٹ گئے تو تم بہت دور کی گمراہی میں جا پڑو گے‘‘۔

○ **تفسیر کی ضرورت** : اس وجہ سے ایسی تفسیر کی سخت ضرورت ہے کہ جو عام فہم اور آسان ہو۔ جس سے قرآن کی تعلیمات اور اصل روح کو بآسانی سمجھا جاسکے۔ اگرچہ قرآن فصیح و بلیغ اور آسان زبان میں نازل ہوا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر ۵۴:۱۷) ''ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنادیا ہے، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟'': فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ○ (مریم ۱۹:۹۷) ''پس اے نبی، ہم نے اس کلام کو آسان کر کے تمھاری زبان میں اس لیے نازل کیا ہے کہ تم پرہیزگاروں کو خوش خبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرادو''۔ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○ (الدخان ۴۴:۵۸) ''اے نبیؐ، ہم نے اس کتاب کو تمھاری زبان میں سہل بنادیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں''۔

تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں کے اختلاط، لغوی غلطیوں، لسانی لہجوں کے انحطاط اور غیر فصیح عربی رائج ہونے کی وجہ سے لوگوں کو قرآنی الفاظ، تراکیب اور جملوں کے معانی اور مفاہیم سمجھانے اور اس کی تعلیمات کی تشریح و تفسیر کی ضرورت پیش آئی۔

قرآن کریم یقیناً دین و دنیا کے لیے ایک جامع تصور ہے اور اس میں پروردگار نے دوجہاں کے علوم و معارف کے خزانے یک جا کردیے ہیں، لیکن ان بیش بہا خزانوں سے ہر انسان اپنی اپنی بساط و توفیق کے مطابق ہی فیض یاب ہوپاتا ہے۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی ہر آنے والا دن اور تلاشِ حق کی مخلصانہ کوششیں اس میں سے لعل و جواہر کے نایاب خزانے حاصل کررہی ہیں۔ اور اللہ اپنی کتاب کے عجائب و غرائب ان کے سامنے کھول کھول کر رکھ رہا ہے:

> سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○ (حم السجدہ ۴۱:۵۳) عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے؟

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا گیا: اے اہل بیت ! کیا رسولؐ اللہ نے صرف آپ

لوگوں کو کوئی خاص بات بھی بتائی تھی؟" فرمایا: نہیں، البتہ اللہ کی کتاب کا وہ فہم اور سمجھ بوجھ عطا کیا ہے جس سے اللہ ہر کسی کو نوازے۔ پھر آپ نے ایک صحیفہ نکالا جس میں بعض احکامِ قرآنی کی وضاحت درج تھی۔

○ **تفسیر اور سلف کی کاوشیں**: صحابہ کرام، تابعین عظام اور اسلاف صالحین ہمیشہ قرآن کریم کے معانی اور مطالب سمجھنے کا خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ ہمارے اسلاف نے لوگوں کو قرآن مجید کے حقیقی مقاصد سے روشناس کرنے کا خاص اہتمام کیا۔ ان کے نزدیک صاحبِ فضل وہی قرار پاتا جسے تفسیر کا کچھ علم حاصل ہوتا۔ قرطبی نے اس بارے میں حضرت علیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بار انھوں نے جابر بن عبداللہ کا ذکر کیا اور ان کے علم کی تعریف کی۔ ایک شخص نے کہا: "میں آپ پر قربان جاؤں، آپ نے جابر کی تعریف کی حالاں کہ آپ خود اپنی مثال آپ ہیں۔ فرمایا: کیوں کہ وہ (یعنی جابر) اللہ تعالیٰ کے اس قول کی صحیح تفسیر جانتے تھے: اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (القصص ۲۸:۸۵) "اے نبی یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے، وہ ایک بہترین انجام کو پہنچانے والا ہے"۔

مجاہد کہتے ہیں کہ مخلوق میں سے اللہ کو سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو قرآن کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ حسن کہتے ہیں: خدا کی قسم! اللہ نے کوئی آیت ایسی نازل نہیں کی ہے کہ جس کے مقصد نزول اور معانی کے جاننے کو وہ محبوب نہ رکھتا ہو۔

شعبی کہتے ہیں کہ مسروق نے ایک آیت کی تفسیر معلوم کرنے کے لیے بصرے کا سفر کیا۔ وہاں پہنچنے پر انھیں پتا چلا کہ وہ شخص جو اس آیت کی تفسیر جانتا تھا، شام جا چکا ہے۔ انھوں نے شام کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر ان سے اس کی تفسیر معلوم کی۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (النساء ۴:۱۰۰) "اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے" میں جس شخص کا ذکر ہے میں اس کی تلاش ۱۴ سال کرتا رہا، حتیٰ کہ میں نے اسے معلوم کرلیا۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ: "وہ ضمرۃ بن حبیب تھے"۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ: "میں حضرت عمرؓ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ دو عورتیں کون ہیں جنھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایکا کیا تھا، مگر میں ان کی رعب و ہیبت کی وجہ سے

دو سال تک نہ پوچھ سکا۔ بالآخر ایک روز میں نے ہمت کرکے پوچھ ہی لیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''وہ حفصہؓ اور عائشہؓ ہیں''۔

ایاس بن معاویہ کہتے ہیں: وہ لوگ جو قرآن پڑھتے ہیں مگر اس کی تفسیر نہیں جانتے، ان کی مثال اس قوم کی سی ہے جن کے پاس رات کے وقت ان کے بادشاہ کا حکم نامہ آیا، جب کہ ان کے پاس کوئی چراغ نہیں ہے، تو ان کے اندر خوف نے گھر کرلیا۔ وہ نہیں جانتے کہ حکم نامے میں کیا لکھا ہے۔ اور اس شخص کی مثال جو تفسیر قرآن جانتا ہو ایسی ہے، جو ان کے پاس چراغ لے کر آگیا اور اس چراغ کی روشنی میں بادشاہ کے پیغام کو سارے لوگوں نے پڑھ لیا۔ (قرطبی)

○ **تفسیر بالرایے:** مفسرین اور علم تفسیر کی قدر و منزلت کے باوجود ہمارے اسلاف تفسیر کے معاملے میں حد درجہ احتیاط کرتے اور اس بات کا خاص خیال رکھتے کہ کہیں ذاتی اغراض، خواہشات اور شخصی رائے، تفسیر قرآن میں شامل نہ ہونے پائے۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو ان تمام میلانات سے آزاد رکھتے تھے۔

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ: سلف صالح میں سے بڑے بڑے لوگ، مثلاً سعید ابن المسیب، عامر شعبی، تفسیر قرآن کو خود سے بہت بلند کام سمجھتے تھے۔ وہ اپنی پرہیزگاری کے سبب اس میں سخت احتیاط برتتے، حالانکہ وہ مسائل و معاملات کو سمجھتے تھے۔ ابوبکر انصاری کہتے ہیں: ماضی کے ائمہ قرآن کے مشکل مقامات کی تفسیر سے بچتے تھے۔ ان میں سے کچھ کا خیال تھا کہ ہوسکتا ہے کہ ان کی تفسیر اللہ کی مراد کے مطابق نہ ہو۔ یہ سوچ کر وہ اس کام سے پیچھے ہٹ گئے، اور کچھ اس امکان سے بچنا چاہتے تھے کہ کہیں لوگ انھیں تفسیر کا امام نہ قرار دے دیں، پھر ان کے مسلک کی پیروی کی جانے لگے۔ اور بعد میں آنے والا کوئی شخص کسی لفظ کی تشریح تو اپنی رائے کے مطابق کرے، لیکن اپنی اس غلطی کو میری طرف منسوب کرتے ہوئے کہہ دے کہ تفسیر بالرائے میں میرے امام فلاں ابن فلاں ہیں۔

ابن ملیکہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ سے قرآن کے ایک لفظ کی تفسیر پوچھی گئی تو انھوں نے جواب دیا: ''اگر خدانخواستہ میں قرآن کے کسی لفظ کی ایسی تفسیر کردوں جو اللہ کی مراد کے مطابق نہ ہو تو آخر کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا، کون سی زمین مجھے ٹھکانہ دے گی۔ میں کہاں جاؤں گا اور

میرا کیا بنے گا؟'' ترمذی اور ابوداؤد میں حضرت جندب کی حدیث ہے: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن پاک کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق کی، اگر وہ صحیح بھی ہوئی تو وہ خطا کا مرتکب ٹھیرا''۔(سنن ترمذی)

تفسیر بالرائے کے قائل حضرات ان سابق الذکر اقوال و احادیث کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں اپنی رائے کے مطابق تفسیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص جہل اور نادانی کی بنیاد پر، یا جہالت اور لاعلمی کی تہمت سے بچنے کی خاطر، یا اپنی ذاتی خواہش سے مغلوب ہوکر، یا فہم قرآن کے علاوہ کسی بھی دوسرے غرض و مقصد کے لیے، راہِ حق کو چھوڑ کر من مرضی کی تفسیر کرنے لگ جائے۔ اس نیت سے تفسیر کرنے والا اگر کہیں کوئی صحیح بات بھی کہہ دے، تب بھی وہ خطا کار اور گناہ گار شمار ہوتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو قرآن پاک کی تفسیر کے سلسلے میں حق اور درست رائے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور خواہشات نفس کے اسیر بن کر نہیں رہتے، ان کی یہ سعی و محنت کسی صورت اجر و ثواب سے خالی نہیں رہتی۔ نیک نیتی کے ساتھ راہِ راست تلاش کرنے والوں سے اگر کوئی غلطی بھی سرزد ہو جائے تب بھی ان کے لیے ایک اجر تو ضرور ہوگا، اور اگر وہ اپنے اجتہاد میں حصولِ حق تک پہنچ جائیں تو ان کے لیے ان شاءاللہ دُہرا اجر ہے۔

○ **مختلف زمانوں اور تہذیبوں کا تفسیر پر اثر**: اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم تاریخ کے مختلف زمانوں اور مختلف تہذیبوں کا، اسی طرح مختلف معاشرتی تبدیلیوں کا تفسیری ادب پر گہرا اثر پڑا ہے۔ اس کی ابتدا بڑے دھیمے انداز سے آہستہ آہستہ اور بڑے سادہ طریقے سے ہوئی۔ یہ اثر ابتدا میں صرف بعض آیات، الفاظ اور واقعات تک محدود تھا اور اس معمولی اثر پڑنے کا سبب یہ تھا کہ اس زمانے میں عربی زبان کے مزاج سے آگہی اور زبان دانی کے ذوق سے شناسائی پائی جاتی تھی، اور بالعموم لوگ تفسیر کی ضرورت سے بے نیاز تھے۔ وہ لفظوں پر غور و فکر کی مشقت میں الجھنے کے بجائے زیادہ دل چسپی اور طبعی رغبت اس امر میں رکھتے تھے کہ اس بارے میں سنت رسولؐ کیا تھی؟ تابعین کس چیز پر عمل کرتے رہے؟ کون سی چیز انھوں نے تواتر کے ساتھ دیکھی؟ اس کے بعد تفسیر پر قصوں اور واقعات کا زمانہ آ گیا۔ تفسیر میں چند ایک رسائل تحریر ہوئے جو نقل شدہ روایات اور قصوں پر مشتمل تھے۔ ان میں سے بعض وہ روایات تھیں جو صحیح اور

متصل سند کے ساتھ نقل کی گئی تھیں اور وہ اسباب نزول اور عملی احکام سے مکمل طور پر مربوط تھیں۔ لیکن ان روایات میں کچھ ایسی بھی تھیں، جنھیں بلا چھان پھٹک اہلِ کتاب سے نقل کرلیا گیا تھا، ان میں درست اور غلط سب روایات شامل تھیں۔

نقل روایات کے اس اسلوب سے بعض مفسرین مشہور بھی ہوگئے، اور بعد کے زمانوں میں اس نہج پر بہت ساری تفاسیر لکھی گئیں۔ ابن عطیہ کے بقول: ''اس نہج پر کئی حضرات نے تفاسیر لکھیں جن میں عبدالرزاق، المفضل، علی بن ابی طلحہ اور کئی دیگر افراد شامل ہیں''۔ اس سلسلے کا سب سے مفید اور بڑا کارنامہ محمد بن جریر طبری (م: ۳۱۰ھ) نے جامع البیان فی تفسیر القرآن کے نام سے تفسیر لکھ کر انجام دیا ہے۔

اس دور کے بعد ترجمے اور فلسفے کا زمانہ آیا، جس میں لوگ فارس اور یونان کے علوم اور فلسفے سے متعارف ہوئے۔ یہی وہ دور تھا جس میں مسلم علما وفلاسفہ کے درمیان بہت سارے عقائدی اور فقہی اختلافات واقع ہوئے۔ اس وقت کتب تفسیر بھی اس نئے فلسفیانہ اسلوب سے متاثر ہوئیں اور ان میں بھی بہت سی فلسفیانہ آرا ونظریات کا پرتو نظر آنے لگا۔ ان فلسفیانہ نقطہ ہاے نظر اور مختلف عقائدی مسائل کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا۔ پھر بات یہاں تک پہنچی کہ بعض مفسرین نے ایسے مختلف فلسفیانہ دلائل کا استنباط قرآنی آیات سے کیا، جن سے فروعی مسائل میں ان کے اپنے مسلک کی تائید ہوتی ہو۔ بسااوقات مفسرین کا مقصد ہی یہ رہا کہ بعض سابقہ کتب کی تردید کی جائے۔ یہ فلسفیانہ اسلوب فخر الرازی (م: ۶۰۶ھ) کی تفسیر مفاتیح الغیب میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

علماے لغت نے بھی متعدد تفاسیر لکھی ہیں، تاہم ان کی تمام تر توجہ بلاغتی نکات، لغوی توجیہات اور نحوی استدلال پر رہی ہے۔ اس ضمن میں الزجاج، الواحدی اور ابوحیان الاندلسی کی تفاسیر اہم ہیں۔ چھٹی صدی ہجری کے علما میں سے راغب اصفہانی کی المفردات بھی بہت معروف ہے۔ وہ ماہرین علم الکلام کی طرح منطقی استدلال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ بعض کائناتی حقائق پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اور آیات کی تفسیر کرتے ہوئے انھیں مختلف مسائل میں تقسیم کردیتے ہیں۔ پھر ان کی طویل تاویلیں کرتے ہوئے اہلِ سنت والجماعت کی آرا کا دفاع کرتے ہیں۔ یہی عالم

بیضاوی (م: ۶۹۱ھ) کا ہے۔ وہ بھی اہلِ سنت کے بنیادی عقائد کے حق میں دلائل لانے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں، اور اہم لغوی قواعد کا بھی احاطہ کرتے جاتے ہیں۔ لیکن ہر سورت کے اختتام پر اس کے فضائل بیان کرنے میں احادیث کی روایت و صحت کا خاص خیال نہیں رکھتے۔ اس بارے میں ان کی مذکورہ اکثر روایات صحیح نہیں ہیں۔ اس تفسیر پر بہت سے حواشی لکھے گئے ہیں جن میں سب سے بہتر حاشیہ الشہاب الخفاجی کا ہے۔

بعض مفسرین نے عصر حاضر کے سائنسی انقلاب کے ساتھ چلنے اور سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کی اور اپنی تفسیر کی کتابوں میں علوم کائنات کے ان اصولوں، اسرار و رموز اور مظاہر پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں، جن کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے۔ استاد طنطاوی جوہری نے تفسیر الجواہر میں یہ اسلوب اختیار کیا ہے۔

بعض دیگر مفسرین نے اجتماعی قوانین وسنن، اسالیبِ ہدایت اور تاریخِ انسانی میں عروج و زوال کے اسباب واضح کرنے پر توجہ دی۔ انھوں نے اس کے لیے قرآنی آیات کی مدد سے جامع اصول وضع کیے اور کوشش کی کہ مسلمان قرآن پاک کو لے کر اپنی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ اپنی معاشرتی زندگی کو اس کی تعلیمات اور ہدایات کے مطابق ڈھال لیں اور قرآن پاک ان کے لیے مشعل راہ بن جائے۔ اس سلسلے میں امام محمد عبدہٗ کی کاوش قابل قدر ہے۔ ان کے بعد اس سلسلے کو ان کے فکری وارث اور شاگرد سید محمد رشید رضا نے تفسیر المنار میں آگے بڑھایا۔

اس تاریخی پس منظر سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک کے تفسیری اسالیب اور طریقوں میں زمانے کے ساتھ ساتھ تجدید ہوتی رہی ہے۔ ہر مفسر نے اپنے زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھ کر قرآن پاک کی تفسیر کی۔ جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ یہ ایک فطری امر ہے (انسان اپنے زمانے کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا)۔ مفسرین نے اپنی کتب تفسیر میں وہی کچھ بیان کیا ہے جو کچھ ان کے ماحول و مطالعے کے تناظر میں ان کی سمجھ میں آیا۔ ان مفسرین کے فہم و ادراک کا اصل مصدر ان کی عقل اور ذاتی صلاحیت و استعداد تھا، اور ان کے علمی وسائل، ان کا اپنا ماحول اور اپنے زمانے کے علوم و معارف تھے۔ اس لیے یہ ایک لازمی امر تھا کہ ان کی تحریر میں ان کے نظریات اور ان کے ماحول کا اثر نمایاں طور پر نظر آئے۔ یہاں پر ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں

ہے کہ ہم تمام کتب تفسیر کا تفصیلی جائزہ لیں، ان کا تجزیہ کریں، اور نہ ہماری گفتگو کا اصل مقصد و ہدف یہ ہے۔ تاریخی لحاظ سے تفسیر قرآن پاک کے حوالے سے جو کچھ بطور مثال یہاں پیش کیا گیا ہے وہ (وضاحت) کے لیے کافی ہے۔

○ **مفسرین کی لغزشیں** : دسترس میں موجود علوم و ثقافت اور اپنے اپنے حالات سے مفسرین کا متاثر ہونا بسا اوقات بہت بڑی غلطیوں اور لغزشوں کا سبب بن جاتا ہے۔ بہت سارے مفسرین ان لغزشوں میں پڑ کر فہم اور تعبیر کے صحیح راستے سے انحراف کر جاتے ہیں۔ یہ خطرہ اس وقت مزید بڑھ جاتا ہے جب مفسرین کو ان شرعی، لغوی، دینی اور ادبی علوم پر مکمل عبور نہ ہو، جو آیات کے صحیح فہم اور قرآن کریم کے اصل مقصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مستشرقین جب قرآن پاک کے متعلق بات کرتے ہیں تو لغوی مہارت اور درست دینی معلومات کی کمی اور اسلامی ثقافت سے بے خبری کی بنا پر دوسروں سے زیادہ فاش غلطیوں اور لغزشوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ہے ان مستشرقین کی حالت، جو بحث و تحقیق کے حوالے سے قدرے بے غرض اور مخلص دکھائی دیتے ہیں۔ رہے وہ جنھوں نے اپنے کام کی بنیاد ہی بغض و عناد پر رکھی ہے، ان کی گمراہیوں، غلطیوں اور لغزشوں کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ غلطیاں کرنے میں مستشرقین کے بعد ان حضرات کا نمبر آتا ہے، جو تفسیر قرآن جیسے نازک اور اہم کام کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں، لیکن ان کا اپنا علم ابھی ادھورا اور نیم پختہ ہوتا ہے۔ عموماً جملے کی ساخت، مفہوم و اسلوب کا غیر واضح پن ہی ان کی فاش غلطیوں کا مظہر ہوتا ہے۔ لکھنے والا اگر اپنی اسی عبارت کو ذرا جامع اور محکم انداز سے لکھتا تو شاید اس کا مفہوم بھی واضح ہوتا اور اس کا مقصد بھی پورا ہو جاتا۔ ان نازک بحثوں کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے اور مبنی برحق، درست و منطقی مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک اور لازمی شرط، ادب کے تمام تر تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ہے۔ اس موقع پر ان چند اغلاط کا سرسری ذکر مفید ہوگا جن کا شکار، مقاصد قرآن کے بارے میں قلم اٹھانے والے حضرات عموماً ہو جاتے ہیں۔

۱- **قصص اور معجزات کے حوالے سے غلطیاں** : قرآن پاک میں مختلف انبیاے کرام علیہم السلام کے بہت سارے واقعات اور معجزات کا ذکر آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد

صرف واقعات اور زمانوں کی نشان دہی کرنا نہیں ہے، نہ صرف صورت احوال کا بیان کرنا مقصود ہے، نہ بعض مخصوص واقعات و افراد کا نقطۂ نظر ریکارڈ پر لانا ہی مطلوب ہے اور نہ تاریخ اور تاریخی واقعات کی چھان بین ہی مقصود ہے، بلکہ قصصِ قرآنی اور معجزاتِ انبیاؑ کا اصل ہدف انسانوں کی راہ نمائی، نصیحت اور درس عبرت ہے۔

اس بات کو قرآن پاک نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے: لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (یوسف ۱۲:۱۱۱) ''اگلے لوگوں کے اِن قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو کتابیں اِس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انھی کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت''۔

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس حوالے سے جس بات کا بھی قرآن پاک میں ذکر آیا ہے وہ حق اور سچ ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک کی کوئی گنجایش نہیں اور اس پر ہر مسلمان دل کی گہرائیوں سے ایمان رکھتا ہے۔ تاریخ کوئی ایک بھی ایسی حقیقت پیش کرنے سے قاصر ہے جو قرآن کریم میں بیان کردہ کسی واقعے کے خلاف ہو۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ علم تاریخ محض اپنی فنی ذرائع سے ان کئی واقعات و حقائق سے تہی دامن ہو، اور اس طرح قرآن مجید ایک اصطلاحی علم تاریخ سے زائد کئی چیزیں سامنے لے آئے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم میں مذکورہ کسی واقعے کا تاریخی استدلال ممکن نہ ہو، لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ علم تاریخ کی ان واقعات سے لاعلمی یا ان کے استدلال میں ناکامی، قرآن کریم میں مذکورہ حقیقت کی نفی نہیں کرسکتی۔ کسی حقیقت سے لاعلمی کبھی اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں قرار پاسکتی۔

یہاں لوگ ایک سنگین لغزش کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مؤرخین بنیادی طور پر دو قسم کے ہیں:

پہلی قسم وہ ہے جو سرے سے قرآن کریم پر ایمان ہی نہیں رکھتی اور اس کے لائے ہوئے پیغام، تعلیمات اور وحی کو دین ہی نہیں سمجھتی۔ ان لوگوں کا مدعا یہ ہے کہ قرآن کوئی ایسی تاریخی دستاویز ہے ہی نہیں ہے، جو فنی و تاریخی مباحث اور تحقیقات میں قابل اعتماد ٹھیرے۔ ہم ایسے لوگوں

کو اپنی اس راے میں معذور سمجھتے ہیں۔ ان سے اس کے علاوہ کسی اور چیز کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے کہ وہ تو سرے سے اس کتاب پر ایمان ہی نہیں رکھتے، نہ اس کی تصدیق کرتے ہیں، وہ اس کے علاوہ قرآن پاک کے حوالے سے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ دانوں کی دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور قرآن کے اثبات کے تمام دلائل کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس گروہ کی دو بنیادی ذمہ داریاں بنتی ہیں:

پہلی ذمہ داری : تاریخی حوالے سے اس کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس بات پر پختہ ایمان رکھے کہ گزرے ہوئے زمانوں اور گذشتہ امتوں کے بارے میں قرآنی آیات نے جن حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ تاریخی اعتبار سے سب سے سچے اور اٹل ہیں۔ ایسے اٹل اور حتمی کہ ان میں کسی قسم کے ادنیٰ شک وشبہے کی گنجایش بھی نہیں ہے۔

دوسری ذمہ داری: ان مسلمان مؤرخین کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان تمام من گھڑت باتوں اور جھوٹ کے مقابلے میں جو پہلے گروہ کی طرف سے قرآن پاک کی طرف منسوب کی گئی ہیں، سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوجائیں اور تاریخی دلائل اور براہین کی بنیاد پر ان کو اپنی غلطی ماننے پر مجبور کردیں۔ اگر وہ اس فرض کی ادایگی کا پختہ ارادہ کرلیں گے تو اس میں کبھی ناکام نہیں ہوں گے۔

مقامِ افسوس ہے کہ ان مسلمان مؤرخین میں سے بھی بعض کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ بھی انھی بے دین تاریخ دانوں کے رنگ میں رنگ جائیں اور اپنے اس اسلامی تشخص کو غیر اسلامی تشخص سے بدل لیں۔ وہاں وہ اس تلبیس ابلیس کی قطار میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں کہ ہم تو بس ایک تاریخ داں ہیں، ہماری کوئی دوسری شناخت ہے ہی نہیں۔ پھر ان کی یہ نئی تاریخی شخصیت تاریخی بحثوں میں پیوندکاری شروع کردیتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی مومنانہ شخصیت کو بالکل بھلا کر گمراہی اور ضلالت کی آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

اگر یہ افراد اپنے ایمان کی طرف پلٹ آئیں، اور اپنی تاریخی تحقیق کے ساتھ ہی ساتھ ایسا رویہ بھی اپنائیں کہ جس سے تاریخ قرآنی پر ان کے ایمان کی تصدیق ہوتی ہو، اور پھر قرآن کریم

کے دفاع کے لیے کمربستہ ہوجائیں، علمی اسلوب اور استدلال کے ذریعے اپنے مدعا کو ثابت کریں تو وہ اپنے ایمان کے سامنے بھی سرخ رو ہوں گے اور تاریخ کے سامنے بھی، اور وہ سب کی طرف سے تحسین وثنا کے حق دار بھی ٹھیریں گے۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے قدم اس وقت پھسل گئے جب اس نے ایک مستشرق کا یہ قول کہ: ''تورات، انجیل اور قرآن تو ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) کے حوالے سے تفصیلات بتا سکتے ہیں، لیکن تاریخی اعتبار سے یہ ان کے وجود کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہے''۔ ان کی اس بات پر لوگوں نے بالکل بجا گرفت کی، اور وہ بعدازاں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ''لیکن میں قرآن کریم پر ایمان رکھنے کے باعث دونوں کے تاریخی وجود کا اقرار کرتا ہوں''۔

اگر کوئی مجرد علم تاریخ، حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا وجود ثابت کرنے کے نتیجے تک نہ پہنچ پائے تو یہ اس علم تاریخ کی کمی اور نقص ہے۔ زمانہ اس کا استدراک ضرور کرے گا۔ عین ممکن ہے کہ تاریخی میدان میں آج جن حقائق تک ہماری رسائی ممکن نہیں، مستقبل میں ہم ان کو پاسکیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ کل کے تصورات، آج کے حقائق اور آج کے تصورات وتخیلات کل کے حقائق میں ڈھلے۔

آسمانی کتابوں نے حقائق کی رسّی کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں تھما دیا اور، اب اس کے بعد مزید تحقیق وتلاش ہماری ذمہ داری ہے۔ جو مستشرق اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، وہ درحقیقت علم اور تحقیق، دونوں کے ساتھ ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر عقل وادراک کی کسی حقیقت تک رسائی نہ ہوسکے تو یہ اس حقیقت کے وجود سے انکار کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اگر طٰہٰ حسین یہ وضاحت کردیتے تو وہ حقیقی معنوں میں ایک محقق شمار ہوتے، حق کی طرف داری کا اعزاز بھی انھیں حاصل ہوتا۔ وہ مومنانہ شخصیت اور عصر حاضر کے ماہر تجزیہ نگار کی حیثیت سے دنیا میں جانے پہچانے جاتے۔ نہ لوگ ان کے خلاف یوں اٹھ کھڑے ہوتے اور نہ انھیں لوگوں پر اپنا غصہ اتارنا پڑتا۔

القصص الفنی فی القرآن رسالے کے فاضل قلم کار بھی اسی راہ پر چل پڑے۔ ان صاحب کی کتاب ابھی تک منظر عام پر تو نہیں آئی، لیکن اس کے کچھ حصے بعض جرائد میں چھپے ہیں۔ طٰہٰ حسین اور ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں ادبی پہلو پر بات کی، لیکن

تاریخ سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی بھی ادبی فن پارہ اس روایت کے سچے اور واقعے کے درست ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اس حد تک تو ان کی یہ بات بالکل درست ہے، بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ادبی نگارش جس میں تخیل اور اٹکل کی بنا پر واقعات کو جمع کیا جائے، وہ تو سچے واقعات کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ادبی مقام حاصل کر جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ علماے نفسیات کی نظر میں خلاف حقیقت واقعات کو بنیاد بنا کر افسانے اور داستانیں تحریر کرنا انسانوں کی فکری اور نفسیاتی تعمیر میں کتنے خطرناک منفی اثرات چھوڑتا ہے۔ پھر انھوں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو محض ایک ادیب کی حیثیت سے معاشرے میں پیش کریں۔ اسی طرح قرآن پاک کو بھی صرف ادب کی ایک کتاب قرار دیتے ہوئے اس کی باقی ہر حیثیت کی نفی کر دیں اور پھر حقیقت یا تاریخ کے ساتھ ان واقعات کے مطابقت یا مخالفت اور صحیح یا غلط ہونے سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔

کاش! اگر وہ ایک بندۂ مومن کی حیثیت سے یہ کہتے کہ اس بحث اور رسالے کی تحریر کرنے سے میرا مقصد قرآن پاک کے اعلیٰ اور بلند پایہ ادبی پہلو کو اجاگر کرنا ہے۔ اور وہ قرآن پر ایمان رکھنے کے ناتے ان تمام مذکورہ واقعات کی تصدیق کرتے ہیں۔ کاش! وہ اس چیز کا بھی اعتراف کرتے کہ ان تمام قرآنی قصص کا تاریخی حقائق ہونا یقینی و حتمی ہے اور اس سے اس کی ادبی و فنی حیثیت اور حسن و جمال دوبالا ہوا ہے کیونکہ یہ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (النمل ۲۷:۸۸) ''یہ اس خداے بزرگ و برتر کی کاری گری ہے جس نے ہر چیز کو محکم کیا''۔ اگر وہ یہ کہہ دیتے تو خود بھی راحت سے بہرہ ور ہوتے، دوسروں کو بھی روحانی اذیت نہ پہنچاتے اور خود سے اور اپنے قارئین سے ضلالت و گمراہی کے سائے بھی دُور کر دیتے۔

جہاں تک خارق عادت واقعات کا تعلق ہے جو زندگی کے معمول کے برعکس اس عالم میں رونما ہوئے، تو یہ معجزات کہلاتے ہیں جو ایک الگ اور مستقل بحث ہے۔ اس میں بھی بہت سے مفسرین لغزشوں کا شکار ہوئے ہیں۔ ہم اس ضمن میں الگ سے اور مناسب موقعے پر مفصل بحث کریں گے۔

○ **علوم کائنات اور مفسرین کی غلطیاں:** قرآن پاک: علم نجوم و فلکیات، علم طب اور علم زراعت و صنعت کی کتاب کی حیثیت سے نہیں بلکہ تقویٰ اور رضاے الٰہی کے حصول،

رشد و ہدایت اور معاشرتی زندگی کی راہ نمائی کے طور پر نازل ہوا ہے۔ جن لوگوں نے بھی ان زرین اجتماعی اصولوں کو اپنایا، وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سرخ رو ہوئے۔ قرآن کریم ظاہری علوم اور مادی اشیا کی تفصیل بھی بس اتنی بیان کرتا ہے جتنا ان کی راہ نمائی اور تقویت ایمان کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ جس سے خالق کائنات جل جلالہ کی عظمت ان کے دلوں میں گہری ہوجاتی ہے۔ جس کے ذریعے سے اس کائنات میں اللہ کے ودیعت کردہ مفید اور نفع بخش نظام و حقائق تک پہنچنے کی راہ ہموار ہوجاتی ہے۔ انسان کے لیے نئے علوم و فنون کی تلاش آسان ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد اس نے کائنات کے مزید اسرار و رموز تک پہنچنا، اس کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا، اور کائنات میں موجود مراکز قوت اور وسائل منفعت کو تلاش کر کے انھیں انسانیت کے فلاح و بہبود کے لیے مسخر کرنا، انسانی عقل اور جستجو پر چھوڑ دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان علوم کے حصول کی ترغیب ہی نہیں دی، بلکہ اسے بہترین عبادات اور اعلیٰ ترین اذکار میں شمار کیا ہے: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (یونس ۱۰:۱۰۱) ''ان سے کہو: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اس کو آنکھیں کھول کر دیکھو''۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۹۰-۱۹۱) ''بے شک زمین اور آسمانوں کی پیدایش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں ان ہوش مند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ [وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں] پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا، تو پاک ہے (کہ کوئی عبث کام کرے) پس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے''۔

قدیم اور جدید زمانوں میں بہت سارے علما اور مفسرین نے اس بات کو ثابت کرنے کی سرتوڑ کوششیں کیں کہ قرآن پاک میں علوم کائنات کے تمام اصول موجود ہیں۔ انھوں نے خلق اور تکوین سے متعلق تمام آیات کو ان علوم پر منطبق کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس حوالے سے امام غزالی

نے جواہر القرآن میں، عصر حاضر میں شیخ علی طنطاوی نے اپنی تفسیر الجواہر میں، اسی طرح ڈاکٹر عبدالعزیز اسماعیل نے اپنی کتاب القرآن والطب میں اور بعض دوسرے حضرات نے بھی اپنی کتب میں اس پہلو کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ایک قابل قدر کاوش ہے، لیکن میں برملا کہوں گا کہ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں مکلف نہیں کیا۔ یہ انداز تفسیر، قرآن پاک کو اپنے اصلی مقصد (یعنی ہدایت و راہ نمائی اور اصلاح معاشرہ) سے ہٹا کر، اس کو محض سائنس کی ایک کتاب بنا دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان اختلافِ آرا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے بعض سلف صالحین نے بجا طور پر تفسیر قرآن کے لیے اس اسلوب کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ امام الشاطبی نے اپنی کتاب موافقات کے دوسرے جزو میں اس موضوع پر بڑی مفصل اور مؤثر بحث کی ہے۔ جس کا ماحصل انھوں نے یہ پیش کیا ہے کہ: ''قرآن کا مقصدِ نزول ان علوم (علوم کائنات) کا اثبات اور اقرار کرنا نہیں ہے، اگرچہ عربوں کے ہاں مروجہ علوم وفنون کی متعدد قسمیں اس میں اشارتاً آچکی ہیں، جس نے بڑے بڑے دانش وروں کو حیرت زدہ کر دیا ہے، تاہم ان علوم کا حقیقی ادراک صرف وہ اصحاب عقل و دانش کر سکتے ہیں جو اس (قرآن) کی پیش کردہ نشانیوں اور عطا کردہ نور سے استفادہ کرتے ہوں۔

یہ درست ہے کہ قرآن پاک میں کائنات کی بہت ساری چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، مثلاً انسان کی پیدایش و تخلیق، زمین و آسمان کی تکوین، سورج اور چاند کی حرکت، ستاروں، سیاروں اور پورے نظام افلاک کی تسخیر، بادلوں کا بننا، بارش کا برسنا، بجلی کا چمکنا اور کڑکنا، نباتات کی بہار اور تنوع، سمندروں کے عجائبات، راستے پالینے کی نشانیاں، زمین پر میخوں کی حیثیت رکھنے والے بڑے بڑے بلند و بالا پہاڑ، ماؤں کے پیٹ میں بچوں (جنین) کی ادلتی بدلتی شکلیں، اور اس کے علاوہ بہت ساری چیزیں قرآن کریم میں موجود ہیں جو درحقیقت علم کائنات کے ماہرین کی تحقیق و بحث، تجربے اور تجزیے کا موضوع ہے۔ بسا اوقات ان آیات کا اختتام، تفکر اور تدبر کرنے اور سوچ بچار کی ترغیب دینے پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان علومِ کائنات کے اصول و قواعد کو دو اور دو چار کی طرح بیان کر دے یا ان کے فروعی مسائل پر

روشنی ڈالے بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسانوںؑ کی ہدایت اور راہ نمائی کی جائے۔لوگوں کے قلوب واذہان میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی راسخ ہوجائے اور سینۂ کائنات میں مخلوق کے لیے جو خزانے پوشیدہ ہیں، ان تک اس کی رسائی حاصل ہوجائے۔

البتہ اس بارے میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا کہ قرآن کریم نے جہاں بھی کائنات کے موجودات وحقائق کی طرف اشارہ کیا ہے، وہاں ایسا محکم اسلوب اور جامع و سچی تصویر کشی پر مبنی انداز اختیار کیا ہے کہ وہ کبھی بھی انسانی عقل کی بنیاد پر ہونے والی ایجادات اور انکشافات سے متصادم نہیں ہوسکتا۔ خاص کر جب ان علوم و معارف کو ان دو قسموں میں تقسیم کرکے اس پر غور کرتے ہیں: ایک وہ جن کے بارے میں دلائل اور تحقیقات و تجربات کے نتائج اب ایک بدیہی حقیقت اختیار کرچکے ہیں، اور دوسری وہ کہ جو صرف مفروضوں کی حیثیت رکھتے ہیں، بعض قرائن ان کی نشان دہی تو کرتے ہیں، لیکن وہ ابھی قطعی دلائل سے حتمی حجت نہیں بن سکے۔

۱- پہلی قسم: پہلی قسم کے علوم وتحقیقات جن کے بارے میں قرآن پاک میں اشارات موجود ہیں، علم کائنات کے جدید ماہرین کی تحقیقات کی ۱۰۰ فی صد تائید کرتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس میں قرآن پاک کا علمی اعجاز روز روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے۔ ایک اُمی پیغمبرؐ پر جس نے کسی مدرسے میں نہیں پڑھا اور جس نے کسی یونی ورسٹی میں داخلہ نہیں لیا، اس پر ایک ایسی کتاب نازل ہوئی جو ان تمام ثابت شدہ حقائق کی تائید ہی نہیں کرتی بلکہ راہ نمائی بھی کرتی ہے۔ بطور مثال! قرآن پاک میں جنین کے مراحل کا ذکر، ہواؤں اور بادلوں کا نظام۔

۲- دوسری قسم: جہاں تک دوسری قسم کے علوم کا تعلق ہے تو ان کا قرآن پاک کی آیات کے ساتھ موازنہ کرنا ظلم اور زیادتی کے مترادف ہے۔ ہمیں ان کے بارے میں انتظار کرنا ہوگا یہاں تک کہ کائناتی علوم انھیں حقیقت مان لیں اور عقلِ انسانی انھیں تسلیم کرلے۔ اس وقت اگر ہم اس ایمان وتسلیم کی روشنی میں ان آیات پر غور کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ دونوں ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○ (حٰم السجدہ ۴۱:۵۳) ”عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر

یہ بات کھل جائے گی کہ قرآن واقعی برحق ہے۔کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے؟''

کائنات کی ابتدا، آغازِ انسانیت، زندگی کی حقیقت اور زمین و آسمان کے درمیان ارتباط جیسے دیگر بے شمار مسائل ہیں کہ جن کے بارے میں جب ہم قرآن کریم کے بیان کو دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ قرآن پاک نے ان پر کتنے فطری، مبنی برحقیقت اور انسانی عقل اور سوچ سے مطابقت رکھنے والے اسلوب میں گفتگو کی ہے۔اسی طرح قرآن پاک نے اس مادی زندگی کے خاتمے، روز قیامت اور اس میں رونما ہونے والے حالات کا جو نقشہ کھینچا ہے، ان پر غور کرنے سے انسان حیران اور ششدر رہ جاتا ہے!

حیرت ہوتی ہے ان بہت سارے مصنفین اور اہلِ علم پر جو قرآن مجید کے واضح دلائل اور فطری حقائق کے ہوتے ہوئے، ڈارون کے بے بنیاد اور نام نہاد نظریۂ ارتقا کو قبول کرتے ہیں۔ ڈارون کا یہ نظریہ کتنا غیر منطقی ہے کہ انسان درحقیقت کسی اور حیوان کی ارتقائی شکل ہے۔لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ڈارون سے اس درجہ مرعوب ہوتے اور اس فکر میں گھلے چلے جاتے ہیں کہ قرآن پاک میں یہ نہیں آنا چاہیے کہ انسان کی پیدایش تو مٹی سے ہوئی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ڈارون ایک انسان ہے اور انسان کا علم محدود ہوتا ہے، وہ بہت ساری چیزوں کا ادراک نہیں کرپاتا۔ پھر ان صاحب ایمان دانش وروں نے یہ تکلیف بھی گوارا نہیں کی کہ ڈارون کے نظریے کے برعکس نقطۂ نظر رکھنے والے بے شمار علما کی تحقیقات اور نظریات دیکھ کر اس کے نظریے کو باطل ثابت کریں۔ نہ ان کو یہ توفیق ہوئی کہ قرآن پاک کی اس بلیغ تعبیر کو غائر نظر سے دیکھ کر ڈارون کے بودے نظریے کی حقیقت کو سمجھیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق انسان کے مراحل کتنے واضح اور کھول کھول کر بیان فرمائے ہیں: ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (السجدہ ۳۲:۸-۹) ''جو چیز بھی اس [رب] نے بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے۔اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے۔ پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی، اور تم کو کان دیے،

آنکھیں دیں اور دل دیے، تم لوگ کم ہی شکرگزار ہو"۔ اور ارشاد ہوا: مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ○ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ○ (النوح ۷۱:۱۳-۱۴) "تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے؟ حالانکہ اس نے تم کو خلقت کے مختلف مراحل سے گزارا"۔

حق اور انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ حضرات سچے دل سے قرآن کریم کی آیات کی تصدیق کرتے۔ اس کے بعد ماہرین کی تحقیقات اور بحثوں کے نتائج کو قرآن کی روشنی میں دیکھتے اور آخری فیصلہ قرآن ہی کا مانتے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (یوسف ۱۲:۲۱) "اور اللہ اپنے ارادے کی تنفیذ پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"۔ اور: وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۸۵) "اور تمھیں تو بس تھوڑا سا ہی علم عطا ہوا ہے"۔

○ **اللّٰہ کی صفات کے بارے میں مفسرین کی غلطیاں:** یہ موضوع بھی علما کی اصطلاح میں مابعدالطبیعیات یا سمعیات کے نام سے موسوم ہے جن کا ذکر قرآن پاک میں کثرت کے ساتھ آیا ہے۔ اس بارے میں بھی بہت سارے لوگ غلطی اور خطا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن پاک میں: جنات کا ذکر ہے، ملائکہ کا بیان ہے، موت اور حالت نزع، قبر، روزِ قیامت، جزا و سزا، جنت اور جہنّم کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہے۔ قرآن کریم نے ان موضوعات کا بتفصیل اور بکثرت ذکر کیا ہے، مثلاً جنات کی بات کرتے ہوئے ان کے ایمان و فہم اور اختیار کا ذکر کیا ہے۔ فرشتوں کے اوصاف و فرائض بیان کیے ہیں۔ احوال موت، حیات بعد الممات اور حسابِ یومِ الدین کا ذکر کیا ہے، جزا و سزا کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (الزلزال ۹۹:۷-۸) "جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ بھی اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا"۔

اسی طرح قرآن پاک میں بڑی تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفات کا تذکرہ موجود ہے۔ کمال کی تمام صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کی گئیں ہیں۔ ہر کمزوری اور نقص سے اس کے مبرا و پاک ہونے پر تاکیداً بات کی ہے اور اس کی کامل نفی کی ہے کہ کوئی اس جیسا ہوسکتا ہے:

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (الشوریٰ ۴۲:۱۱)''اس کی مانند کوئی چیز بھی نہیں ہے اور وہی سننے اور دیکھنے والا ہے''۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (اخلاص ۱۱۲:۴)''اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے''۔ اسی طرح قرآن پاک میں اللہ رب العزت کے لیے ہاتھ، چہرے، آنکھ اور حواس کی اضافت بھی موجود ہے۔

بلاشبہہ قرآن پاک میں اس مادی کائنات کے علاوہ جن چیزوں کا بیان موجود ہے، یہ تمام چیزیں مادی کائنات کی حدود اور اس کے قواعد سے باہر ہیں۔ انسانی عقل آج تک اپنے گرد پھیلی ہوئی مادی کائنات کے مکمل اسرار جاننے سے ہی عاجزی کا اظہار کرتی چلی آرہی ہے۔ چہ جائے کہ وہ ماورائے طبعیات اشیا کو سمجھ سکے اور ان کا ادراک کرسکے۔

اس حوالے سے یہ متجددین ایک بہت بڑی غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس چیز کی حقیقت تک ہماری عقل کی رسائی نہیں ہوتی، ہم اس کو تسلیم نہیں کرسکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ 'جن' کیا چیز ہیں، جن کی حقیقت ہم سے پوشیدہ ہے؟ یہ فرشتے کیا ہوتے ہیں، جن کی اصلیت اور حقیقت سے ہم ناواقف ہیں؟ یہ موت کے بعد زندگی کیونکر ممکن ہے، جب کہ ہمارے مادی عناصر تحلیل ہوجائیں گے؟ پھر اس کا اپنے اصل کی طرف لوٹانا کیسے ممکن ہے؟ تم اپنے ایمان اور گمان کے مطابق ہمارے اجسام اور روح کی جو بات کرتے ہو، ہم تو اس کا احساس ہی نہیں کرسکتے۔ بس یہ مادی عناصر ہی ہمارے بدن میں تصرف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سردی ہمیں اذیت دیتی ہے، گرمی ہمیں تکلیف پہنچاتی ہے، زہر ہمیں مار دیتا ہے۔ کھانا پینا ہمیں تقویت دیتا ہے اور ہوا ہم کو تروتازہ رکھتی ہے اور یہ تمام چیزیں مادی کائنات سے متعلق ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس تنگ نظری کے سبب وہ بہت بڑی الجھن اور گمراہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ پھر اس ذہنیت کے تجدد پسند لوگ، دو گروپوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ ایک گروپ تو ان تمام ماورائے طبعیات اشیا کا انکار کر بیٹھتا ہے۔ دوسرا گروپ اپنی طرف سے تاویلات کرکے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ: ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ یہ صرف ایک تمثیل ہے یا پھر مجرد ایک تخیل۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ دونوں گروپ راہ ہدایت کو چھوڑ کر بہت بڑی گمراہی میں جا پڑے ہیں۔ اگر ان لوگوں میں تھوڑا بہت بھی انصاف ہوتا تو یہ جان لیتے کہ ایک عقل مند عالم کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہوتی

ہے کہ جس چیز تک اس کے علم کی رسائی نہ ہو سکے تو وہ بلاتامل اس بارے میں اپنے عجز اور قصور کا اعتراف کر لیتا ہے۔ حقائق کے انکار کے بجائے وہ اپنے فہم و ادراک کو موردِ الزام ٹھیراتا ہے اور انھیں جاننے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کائنات میں آج تک انسانی عقل نے جتنے حقائق تک رسائی حاصل کی ہے اور جتنے انکشافات ہوئے ہیں، یہ ان اسرار کی نسبت بہت ہی کم ہیں، جو ابھی تک پوشیدہ اور سربستہ ہیں۔ ایک چھوٹے سے جزیرے کو ایک بہت بڑے سمندر سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، بلکہ جزیرہ بھی بہت بڑی چیز ہے، اس معلوم اور نامعلوم کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔

علم کائنات کے بڑے بڑے ماہرین نے اپنی کم مائیگی اور عجز کا اعتراف کیا ہے اور کرتے رہیں گے۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ ''عصر حاضر کے عالم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ متواضع اور جرأت مند ہو۔ اسے متواضع اس لیے ہونا چاہیے کہ اس کائنات کے کسی قابل ذکر راز کی حقیقت تک وہ ابھی تک پہنچ ہی نہیں پایا۔ کائنات کے اتنے کثیر مجہولات ابھی تک موجود ہیں، جن سے بے خبری کا اعتراف کرنا جرأت کے بغیر ناممکن ہے۔

اس لیے ماوراے طبیعیات حقائق کو محض اس بنیاد پر رد کرنا اور ان کی تکذیب کرنا کہ وہ ہمارے حواس کے دائرے میں نہیں آرہے ہیں اور ہماری عقل ان کے ادراک سے عاجز ہے، یقیناً ایک غیر علمی و غیر منطقی رویہ، ایک بڑا ظلم اور کھلی گمراہی ہے۔ اس ضمن میں معذرت خواہی پر مبنی مختلف قسم کی تاویلیں کرنا ایک تکلف ہے، اور اس ڈگر پر چلتے ہوئے لکھی جانے والی کتابیں محض خرافات، افسانوں اور داستانوں پر مشتمل ہیں، جن کے لیے قرآن و سنت میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اسلامی اور دینی بحثوں کے سلسلے میں یہ کوئی نیا عنوان نہیں، بلکہ جب سے یونانی فلسفے کا ترجمہ عربی میں ہوا، اور وہ اسلامی علوم کا جزو بنا، اس وقت سے آج تک یہ مضمون مسلسل زیر بحث رہا ہے۔ اس میں خیر کی توفیق پانے والا شخص صرف وہی ہے، جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نور ایمان کے لیے کھول دے۔

○ **بہترین تفسیر**: ایک دفعہ مجھ سے میرے ایک ساتھی نے پوچھا کہ: قرآن مجید کی سب سے اچھی اور بہترین تفسیر کون سی ہے، اور قرآن فہمی کا آسان ترین راستہ اور طریقہ کیا ہے؟

میں نے ایک ہی لفظ میں اس کا جواب دیا اور کہا کہ: قلبك، یعنی قرآن پاک کی بہترین تفسیر اور اس کو سمجھنے کا آسان طریقہ 'تیرا دل ہے'۔

بلاشبہہ مومن کا دل ہی اللہ تعالیٰ کی کتاب کی بہتر ترین تفسیر اور اس کو سمجھنے کا کامیاب ترین ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ جب ایک بندۂ مومن، تدبر وانہماک اور نہایت عاجزی اور خشوع کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے رشد و ہدایت کی درخواست کرتے ہوئے دست بہ دعا ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ رسولؐ اللہ کی سیرت طیبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اسباب نزول کو اس کے ساتھ جوڑ دیتا ہے، تو لامحالہ اس وقت وہ قرآن مجید کے صحیح اور درست فہم کو پالیتا ہے۔

اس کے بعد اگر وہ تفسیر کی کسی خاص کتاب کا مطالعہ کرتا بھی ہے تو صرف اس لیے کرتا ہے کہ کسی مشکل لفظ کے معنی یا کسی مبہم ترکیب کو سمجھے۔ گویا کہ قرآن فہمی کے مذکورہ طریقے کو اختیار کرنے کے بعد مطالعۂ تفسیر، اس فہم میں مدو معاون ہوا کرتا ہے۔ یہ قرآن فہمی پھر اس شخص کے لیے ایسا نور بن جاتی ہے جو ہمیشہ اس کے دل کی دنیا کو منور کیے رکھتی ہے۔

امام محمد عبدہٗ اپنے شاگردوں کو وصیت کیا کرتے تھے کہ: ''قرآن پاک کی تلاوت باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ کیا کرو۔ اس کے اوامر نواہی کو اسی طرز پر سمجھنے اور اس مبارک کتاب سے نصائح اور دروس کو اس طریقے پر تلاش کرنے کی کوشش کیا کرو، جس طرح کہ نزول وحی کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ کسی مشکل لفظ کو سمجھنے یا کسی مبہم ترکیب کو حل کرنے کے علاوہ تفسیر کے پیچھے نہ پڑو، بلکہ قرآن کے اصل معنی اور مراد کو پلے باندھ لو، پھر جس طرف قرآن کریم تمھیں لے کر چلنا چاہتا ہے، اسی طرف چلو اور اپنے فکر و خیال اور شوق کو اسی سمت یک سو کیے رکھو جس کا تم سے قرآن پاک مطالبہ کرتا ہے''۔

بلاشبہہ جو شخص بھی قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے یہ طریقہ اپنائے گا، وہ دل میں اس کی گہری تاثیر کو ضرور محسوس کرے گا۔ اسے قرآن فہمی میں ملکہ حاصل ہوگا۔ یہ قرآن اس کی دنیا اور آخرت دونوں جہاں کو روشن اور منور کر دے گا، ان شاءاللہ۔

✻✻✻

وہ کون ہے؟

وہ کون ھے

جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر اُس کے ذریعے وہ خوش نما باغ اُگائے جن کے درختوں کا اُگانا تمھارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دُوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ (نہیں) بلکہ یہی لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔

وہ کون ھے

جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔

وہ کون ھے

جو بے قرار کی دُعا سُنتا ہے جب کہ وہ اُسے پُکارے اور کون اس کی تکلیف رَفع کرتا ہے؟ اور (کون ہے جو) تمھیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔

وہ کون ھے

جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوش خبری لے کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (یہ کام کرتا) ہے؟ بہت بالا و برتر ہے اللہ اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

وہ کون ھے

جو خلق کی ابتدا کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رِزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصہ دار) ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔ (النمل ۲۷: ۶۰-۶۴)

تفسیر سورۃ الحجرات

امام حسن البناؒ

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

(الحجرات ۴۹:۱-۳)

ان آیات مبارکہ کو باہم مل کر پڑھتے ہیں۔

جس طرح میں نے پڑھا ہے اس طرح آپ بھی پورے غور وفکر کے ساتھ اور ہمہ تن گوش ہو کر ان آیات کی تلاوت کریں۔ آیات کی تلاوت کے بعد اپنے آپ کو مخاطب کر کے یہ سوالات پوچھیے جس طرح میں نے اپنے آپ سے پوچھے ہیں۔ ان آیات مبارکہ پر غور کرنے کے نتیجے میں اگر آپ کے حاصل کردہ جوابات میرے جوابات کے مطابق نکلے تو فبہا اور اگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ پر مجھ سے زیادہ علم ودانش کے دروازے کھول دیے تو اس پر اللہ پاک کا شکر بجا لایئے۔ پھر اگر آپ نے ان فوائد میں مجھے بھی شریک کر لیا تو بہت ہی اچھا ہوگا اور اگر آپ ایسا نہ کر پائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہاں میں اپنے علم کی حد تک ان آیات کا سبب نزول اور ان کے متعلق وارد شدہ

۝ مترجم: فصیح اللہ عبدالباقی

احادیث کی روشنی میں حاصل کردہ نتائج سے آپ کو مطلع کروں گا۔

آپ جان چکے ہوں گے کہ قرآن فہمی کے متعلق جو کچھ میں لکھنے چلا ہوں وہ تفسیر قرآن کے بہ نسبت مدارسۂ قرآن کے زیادہ قریب ہے۔

[مدارسۂ قرآن: باہم مل کر پڑھنا] اور کیوں نہ ہم مدارسۂ قرآن کریم کریں؟ مدارسۂ قرآن میں کیا حرج ہے؟ اور یہ (مدارسۂ قرآن) انواع تفسیر میں سے ایک اعتبار سے جدید اور اسالیب قرآن فہمی میں کیوں نہ ایک نیا اسلوب تفسیر قرار پائے؟ اس نئے اسلوب تفسیر قرآن (مدارسۂ قرآن) کے مطابق سورۃ الحجرات کی تفسیر کا آغاز کرتے ہیں۔

الفاظ کے معانی: الجھر، آواز بلند کرنا، حبوط الاعمال، اعمال کا غارت ہونا اور اس کا اجروثواب ضائع ہونا، الامتحان: جانچنا، آزمایش کرنا۔ ان کلمات کے معانی جاننے کے بعد میں نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے یہ استفسارات کیے: ان آیات مبارکہ کا ماقبل سے کیا ربط ہے؟ ان کا سبب نزول کیا ہے اور ان کا مقصد کیا ہے؟ ان آیات میں ہمارے لیے کیا فوائد، دروس اور کون سے احکام موجود ہیں؟

لیجیے اب ان سوالات کے جوابات حاضر ہیں:

ان آیات کا ماقبل سے ربط: اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب، آپؐ کی ذمہ داریاں اور فرائض رسالت بیان فرمائے ہیں۔ اسی طرح مومنین کی بعض خصوصیات اور نمایاں صفات کا تذکرہ بھی فرمایا ہے۔

اس کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگلی آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بحیثیت نبی، زعیم اور قائد، مسلمانوں پر حقوق کی بات کی جائے۔

سبب نزول اور اس کا مقصد: اس آیت مبارکہ کے نزول کے حوالے سے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ یہ بنوتمیم کے وفد کی آمد کے موقعے پر اس وقت نازل ہوئی جب رسولؐ اللہ کے سامنے باہمی تکرار کے دوران حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی آوازیں قدرے بلند ہونے لگیں۔

اس گروہ کی دلیل عبداللہ بن زبیرؓ کی وہ روایت ہے جس کو امام بخاری، ابن المنذر راور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے، جس کے مطابق جب بنو تمیم کا وفد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا: قعقاع بن معبد کو امیر بنائیں اور حضرت عمرؓ نے کہا: اقرع بن حابس کو امیر بنائیں۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا: آپ تو میرے خلاف ہی کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا: میرا ارادہ آپ کی مخالفت کا نہ تھا۔۔۔ اس معاملے میں ان کے درمیان تکرار ہوئی، یہاں تک کہ ان کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب بعض مسلمانوں نے نحر کے روز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اپنی قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا۔ اس کی دلیل حسن رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جس کو عبد بن حمید ابن جریر اور ابن المنذر رنے روایت کیا ہے کہ نحر کے روز بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے قربانی کی تو آپؐ نے ان کو دوبارہ قربانی دینے کا حکم دیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی۔

تیسری رائے: یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کثرت سے عرب قبائل کے وفود آنے شروع ہوگئے تھے۔ ان میں سے بعض آپؐ کی ہدایات اور تعلیمات سننے سے پہلے ہی بہت سے سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے تھے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ان کو اس روش سے منع کیا اور حکم فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خاموشی اختیار کیے رکھا کرو، تا آنکہ وہ ازخود تمھیں جن احکام کی تعلیم دینا چاہیں دے دیں۔

چوتھی رائے: بعض لوگوں کی رائے اس آیت کے شان نزول کے سلسلے میں یہ ہے کہ بعض لوگ احکام کے حوالے سے جلد بازی سے کام لیا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ کاش اس بارے میں اللہ تعالیٰ ایسا حکم نازل فرمادے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو ایسی بے جا آرزوؤں سے منع کرنے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔۔۔ اس کے علاوہ بعض اور روایات بھی اس آیت کے شان نزول کے حوالے سے مروی ہیں، تاہم وہ قریب قریب ذکر شدہ اقوال کی مانند ہی ہیں۔ ہم انھی اقوال پر اکتفا کرتے ہیں، تاکہ مدارسۂ قرآن کریم کا اصل مقصد آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

میرے خیال میں ان آیات مبارکہ کے ضمن میں ان تمام معانی کو مراد لینے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ ان سب کا مقصود ایک ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بات نہ کی جائے اور اس بات کا انتظار کیا جائے کہ آپؐ ہی بات کرنے میں پہل کریں، احکامات دیں اور ان کی وضاحت اور تشریح فرمائیں۔

اس وضاحت کے بعد آیتِ کریمہ کا معنی اور مفہوم کچھ اس طرح سے ہوگا۔ واللہ اعلم:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی رسالت کی تصدیق کر چکے ہو اور آپؐ کے لائے ہوئے دین اور عقائد کو تسلیم کر چکے ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے اس عظیم منصب کی بزرگی اور عظمت کا اعلان کرو اور آپؐ کے ساتھ نہایت ہی ادب و احترام سے پیش آؤ۔ کسی بھی معاملے میں آپؐ سے سبقت نہ کرو، یہاں تک کہ آپؐ خود ہی اس حوالے سے کچھ ارشاد فرمائیں۔ آپؐ کی موجودگی میں آوازیں بلند نہ کیا کرو، جس طرح بے تکلف ہو کر اپنے کسی بھائی کے سامنے بلند کیا کرتے ہو، اور آپؐ کو اس طرح سے نہ پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو، بلکہ آپؐ کو ایسے انداز سے پکارو جس سے آپؐ کی تعظیم، تکریم، احترام اور ادب و عزت جھلک رہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ غفلت کی وجہ سے آپؐ کے مرتبہ اور شان میں تمھیں لینے کے دینے پڑ جائیں، جس پر تمھاری پکڑ ہو اور تمھارا سارا اجر و ثواب غارت ہو کر رہ جائے، تم ہلاکت و تباہی کے دہانے پر پہنچ جاؤ اور تمھیں خبر بھی نہ ہو۔

اور یہ کہ اگر تم نے ان احکامات کی تعمیل کی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی آوازوں کو پست رکھا تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمھارے دلوں کو جانچ لیا ہے، ان کا تزکیہ اور تطہیر کر دی ہے، آزمایش اور امتحان کے بعد ان کو تقویٰ، اللہ کی رحمت، مغفرت اور اس کے اجر و ثواب کا لائق اور اہل پایا ہے۔

سورہ مبارکہ کے اس افتتاحیے کے معنی و مفہوم کے حوالے سے کوئی تفسیر دیکھے بغیر میرے ذہن میں کچھ اس طرح سے ایک بات آئی کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تخلیہ میں بات چیت کرنا چاہتے ہوں، ان پر لازم ہے کہ آپؐ کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دیا کریں۔ اس حکم سے

آپؐ کے عظیم مرتبے اور بلند مقام کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یعنی اس عظیم اور ختمی مرتبت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں صرف وہی لوگ گفتگو کر سکتے ہیں جو صدقہ دے کر اپنے نفوس کا تزکیہ اور تصفیہ کرلیں۔ بعد میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے از روے رحمت و شفقت ان تہی دست اور نادار مسلمانوں کو اس امر سے مستثنیٰ کیا اور فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝ (مجادلہ ۵۸:۱۲) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم رسولؐ سے تخلیہ میں بات کرو تو بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ کرو یہ تمھارے لیے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ البتہ اگر تم صدقہ دینے کے لیے کچھ نہ پاؤ تو اللہ غفور و رحیم ہے۔

یہ حکم بدستور جاری رہا یہاں تک کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور بزرگی نے لوگوں کے دلوں میں جگہ پکڑ لی اور آپؐ کا ادب و احترام ان کی عادت بن گئی۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ فرمایا اور اس بات کی اجازت دے دی کہ اب تم صدقہ کیے بغیر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلوت میں گفتگو کر سکتے ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (مجادلہ ۵۸:۱۳) کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تخلیہ میں گفتگو کرنے سے پہلے تمھیں صدقات دینے ہوں گے؟ اچھا، اگر تم ایسا نہ کرو--- اور اللہ نے تم کو اس سے معاف کر دیا۔ تو نماز قائم کرتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و احترام پیدا کرنے کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تنہائی میں گفتگو سے پہلے صدقہ لازم ٹھیرایا۔ جب ان کے دلوں میں رسولؐ اللہ کی عظمت و محبت اچھی طرح راسخ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے کمالِ مہربانی سے صدقے کی شرط ختم کر دی۔ اب تم کو چاہیے کہ بھرپور انداز سے اللہ اور اس کے

رسولؐ کی اطاعت کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو، اور اس کے بعد ان دوسرے آداب اور تعلیمات کا ذکر فرمایا۔ اس وضاحت کے بعد آیت کریمہ کا معنی کچھ اس طرح ہوگا کہ: لا تقدموا بین یدی الله ورسوله جس صدقے کا تم کو اس سے پہلے حکم دیا گیا تھا اب اس کو پیش کرنے کی تکلیف نہ کرو--- بہرحال یہاں پر مفعول کے محذوف ہونے کی وجہ سے بہت سارے معانی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ حذف اور امکان کا اسلوب ہی قرآن پاک کی ان ممتاز اور نمایاں خصوصیات میں سے ہے جس کی بدولت قرآنی آیات میں بہت سارے معانی اور مطالب سموئے ہوئے ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں بہت سارے معانی اور لطیف نکتے پائے جاتے ہیں جن کی حلاوت اور مٹھاس صرف پاک دل اور پاک نفس لوگ ہی لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ظاہر ہے کہ یہاں پر بات رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کی ہو رہی ہے۔ یہ تعبیر اس بات کا اعادہ کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کو پورا کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی خوش نودی ہی کا ذریعہ ہے۔ جس نے رسول خداؐ کے حقوق کو ادا کیا گویا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ادا کیا۔ نیز اس تعبیر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے رب کے ساتھ تعلق اور قرب کا بھی پتا چلتا ہے۔ قرآن اور سنت کی بہت ساری نصوص میں اس قسم کی مجازی تعبیرات ملتی ہیں۔

بطور مثال ایک حدیث پاک ملاحظہ کیجیے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من آذی مسلماً فقد اذانی ومن آذانی فقد آذی الله عزوجل جس شخص نے کسی مسلمان کو اذیت دی درحقیقت اس نے مجھے اذیت پہنچائی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچائی۔ اس سورہ مبارکہ میں جگہ جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو 'رسول اللہ' کی صفت سے یاد کیا گیا جس سے ایک طرف ذاتی لحاظ سے آپؐ کی عظمت نمایاں ہوتی ہے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف آپؐ کی اضافت، اللہ رب العالمین سے آپ کے قرب اور گہرے تعلق کا پتا دیتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس سے یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مخلوق کے ساتھ آپؐ کا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ سے نسبت ہی کی وجہ سے ہے اور اس طرح اس تعبیر میں شرف اور قدسیت کے جو عظیم معانی پوشیدہ ہیں اس کی حلاوت اور مٹھاس کو سچے مومن ہی محسوس کرسکتے ہیں۔

بندوں کو یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کر کے پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان درحقیقت حقوقِ مصطفیٰؐ کی ادائیگی اور آپؐ کے احترام کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دے کر یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ ہر وہ شخص جو آپؐ کے ادب واحترام کا پاس نہیں رکھتا وہ متقی نہیں ہوسکتا، اور وہ اپنے اس عمل سے غضبِ خداوندی کو دعوت دے رہا ہے۔

دروس اور فوائد: مذکورہ آیاتِ مبارکہ سے جو دروس، فوائد اور آدابِ عالیہ کے حوالے سے جو احکام میں سمجھ سکا ہوں، درج ذیل ہیں:

۱- اسلامی قیادت (دنیا اور آخرت دونوں میں کام آنے والی قیادت) کا احترام ملحوظ رکھنا امت کے ہر فرد پر واجب ہے۔ غفلت میں ڈوب کر اور نفسانی ترنگ میں آکر اس کی بے عزتی کرنا مؤجبِ ہلاکت ہے۔ قیادت کا یہ مقام اصالتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے اور آپؐ کے بعد ائمہ دین کے لیے بطور نیابت اور وراثت کے حاصل ہے۔ ابوحیان نے اس حوالے سے بہت عمدہ تفصیل لکھی ہے۔ فرماتے ہیں: عالم اور جو شخص بمنزلہ عالم ہو، اس کے سامنے اونچی آواز سے گفتگو کرنا مکروہ اور نہایت ناپسندیدہ عمل ہے۔

عہدِ نبویؐ میں باہر سے آنے والے وفود کو آپؐ کو ملنے سے پہلے آدابِ ملاقات کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ میرے بھائی! اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ حسبِ مرتبہ اور عزت واحترام کے جو اصول وقواعد قرآن کریم نے بتائے ہیں ان کے لیے دو شرائط کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

○ عزت، احترام اور تکریم صرف اور صرف امتِ مسلمہ کے ان راہ نماؤں کی کی جائے گی جو فی الواقع اس کے مستحق ہوں گے۔

○ اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ عزت اور تکریم کو بجالانے میں غلو سے پرہیز ہو اور شرعی حدود کو پامال نہ کیا جائے۔

۲- ان آداب کا لحاظ کرنا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ضروری تھا، اسی طرح آپؐ کی رحلت کے بعد بھی ایسے تمام مواقع پر ان آداب کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے جن میں آپؐ کا ذکر ہو۔ بعض علمائے کرام نے اس آیتِ کریمہ سے یہ بات بھی مستنبط کی ہے کہ آپؐ کے قبر

کے نزدیک اور جب آپؐ کی سنت اور حدیث کی تعلیم دی جارہی ہو آواز کو پست رکھنا واجب ہے۔

۳- یہ بھی قیادت کی تعظیم میں شامل ہے کہ انسان فیصلہ کرنے میں قیادت سے پیش قدمی نہ کرے۔ اس کو اس طرح نہ پکارے جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ بزرگوں کے سامنے اپنی آواز کو بلند نہ کرے۔ لوگوں کے سامنے اس سے جھگڑا اور مناظرہ نہ کرے۔ اجمالی طور پر اپنے بڑے کے سامنے انسان قدرے وقار اور سنجیدگی سے پیش آئے۔ اپنے مطالبات کو معقول اور مناسب طریقے سے عزت واحترام کو ملحوظ خاطر رکھ کر پیش کرے۔

۴- ان آیات مبارکہ میں قیادت کے حوالے سے جو آداب بیان کیے گئے ہیں اگر ان پر عمل نہ کیا جائے تو اجتماعیت لازماً متاثر ہوگی، کام میں خلل واقع ہوگا، تمام منصوبہ بندیاں اور کاوشیں غارت ہوجائیں گی۔ قیادت کے لیے کام کرنا مشکل ہوجائے گا اور کارکنان بھی منزل کی دُوری اور دشواری سے بددل ہوجائیں گے۔

آیات مبارکہ میں مذکور آداب سے آراستہ و پیراستہ ہونا اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی رضا کے حصول کا نہایت ہی عمدہ اور شان دار ذریعہ ہے۔ ان آداب کو جاننے اور سمجھنے کے بعد ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اپنی عملی زندگی میں ان کو اپنائیں۔ بغیر عمل کے قرآن کا محض مطالعہ کرنا اور محض اسی کو نجات کے لیے کافی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ عمل کیے بغیر قرآن پڑھنے سے یہ حدیث شریف ہم پر صادق آجائے گی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رُبَّ قَارِیءٍ لِلْقُرآنِ وَالقُرآن یَلْعَنُہٗ کتنے ہی قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن پر قرآن پاک لعنت بھیجتا ہے۔

ابتدائی زمانے میں مسلمانوں پر ان آیات کے اثرات

عبد بن حمید اور حاکم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے: ''ان آیات کے نزول کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کے نزول کے بعد مرتے دم تک اب میں آپؐ سے چپکے سے (جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کے کان میں بات کرتا ہے) بات کیا کروں گا۔

اسی طرح صحیح بخاری میں ابن الزبیرؓ سے مروی ہے: ''حضرت عمرؓ جب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بات کرتے تو اتنا آہستہ بولتے کہ آپ کی آواز اچھی طرح سنائی نہ دیتی، یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے دوبارہ استفسار فرمایا کرتے تھے۔"

۳- بخاری، مسلم اور دوسرے محدثین نے مختلف اسناد سے یہ روایت بیان کی ہے: جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، ثابتؓ بن قیس بن شماس روتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہوئے اور اپنے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ کئی روز کی غیر حاضری پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: "کہ ثابت کہاں اور کس حال میں ہے؟" صحابہ کرامؓ نے جواب دیا: "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ثابت کے حال کا تو کچھ پتا نہیں، البتہ اس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر رکھا ہے اور مسلسل روتا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پاس کسی کو بھیج کر پوچھا کہ ثابت کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا: "قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے اور میری آواز بہت بلند ہے۔ (وہ بہرے تھے) مجھے ڈر ہے کہ میرے تمام اعمال ضائع نہ ہو چکے ہوں۔" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تسلی دے کر فرمایا: لَسْتَ مِنْهُمْ بَلْ تَعِيْشُ بِخَيْرٍ وَتَمُوتُ بِخَيْرٍ ثابت! تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو بلکہ تم بخیریت زندہ رہو گے اور بخیریت دنیا سے کوچ کرو گے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: اَمَا يُرْضِيْكَ اَنْ تَعِيْشَ حَمِيْدًا وَتُقْتَلَ شَهِيْدًا وَتَدْخُلَ الْجَنَّةَ ثابت کیا تم پسند نہیں کرو گے کہ تمھیں سعادت کی زندگی، شہادت کی موت ملے اور جنت میں داخل ہو جاؤ۔

حضرت ثابت نے عرض کیا: میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوش خبری پر راضی ہوں اور پھر کبھی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے با آواز بلند بات نہیں کروں گا۔ حضرت ثابتؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے عین مطابق یمامہ کے نہایت بابرکت معرکے میں جام شہادت نوش کیا۔

میرے عزیز بھائی! آپ نے قرآنی آیات کی روشنی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب کے متعلق چند ایک ہدایات سن لیں۔ مجھ پر، آپ پر، ہمارے کالم نگاروں، خطیبوں، شعرا اور ہمارے مصنفین سب پر لازم ہے کہ ہم سب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و احترام اور آپؐ کی ذات سے متعلقہ آداب کو دل و جان سے عزیز تر رکھیں۔ اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنَا حُسْنَ الْآدَاب۔

***

ہمیشہ کا دن

ہمیشہ کی رات

اے نبی ﷺ! ان سے کہو

کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر

اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو

اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے؟

کیا تم سنتے نہیں ہو

ان سے پوچھو، کبھی تم نے سوچا کہ اگر

اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو

اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے تمہیں رات لا دے تا کہ تم

اس میں سکون حاصل کر سکو؟

کیا تم کو سوجھتا نہیں؟

[القصص ۲۸:۷۱-۷۲]

عطیہ اشتہار:

فرحان اسامہ اسمعیل

نیا سال

امام حسن البنا شہید ○

میں نے نئے سال کی دہلیز پر کھڑے شخص سے کہا: مجھے روشنی درکار ہے تا کہ آنے والے موہوم ایام کو منور کرسکوں۔

اس نے کہا: اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ میں دے دو، وہ تمھیں منزل مقصود تک پہنچادے گا۔

وقت کے قافلے کے ساتھ چلتا مردِ ناداں، زندگی کے ایک دوراہے پر کھڑا کبھی پیچھے کی طرف نظر دوڑاتا، تا کہ اس سفر میں پیش آنے والی تکالیف اور تھکن کو ذہن میں تازہ کر سکے--- پھر ایک نظر آگے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا، تا کہ اندازہ لگائے کہ ابھی اور کتنے مراحل طے کرنے ہیں۔

اے صحرائے زندگی میں حیران و سرگرداں بھٹکنے والے دوست! کب تک اس تاریکی و گمراہی کا شکار رہو گے، حالانکہ تمھارے اپنے ہاتھ میں ایک روشن چراغ موجود ہے:

رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (المائدہ ۵:۱۶) تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

○ ترجمہ: عبدالغفار عزیز

اے حیرانی اور تھکن سے چور لوگو کہ جن کے سامنے راستے گڈمڈ ہو چکے ہیں۔ اے گم کردہ راہ انسانو! سنو خدائے علیم وخبیر کیا کہہ رہا ہے:

اے نبی کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ وہ تو غفور و رحیم ہے۔ پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ اس کے (سورۃ الزمر: ۵۳-۵۴)

آؤ اس کی پکار پر لبیک کہو، اور پھر اس کے بعد دلی اطمینان، ضمیر و نفس کی راحت اور اللہ تعالیٰ سے نیک اجر کا نظارہ کرو:

اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو معاف کر سکتا ہو؟ اور وہ کبھی دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک اعمال کرنے والو کے لیے۔ (آل عمران ۳: ۱۳۵-۱۳۶)

اے مصیبت زدہ اور گناہوں کے بوجھ تلے دبے میرے بھائی! میں تمھی سے مخاطب ہوں کہ میرے رب کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں۔ گناہ گاروں کا روتے ہوئے اس کی طرف پلٹ آنا اسے طواف کرنے والوں سے اس کے گھر کا زیادہ محبوب ہے۔ کوئی نالہ نیم شبی، اس سے مناجات کی کوئی گھڑی، ندامت اور افسوس کے چند آنسو، توبہ اور استغفار کا کوئی کلمہ- اس سے تمھارے گناہ مٹا دیئے جائیں گے، تمھارے درجات بلند کر دیئے جائیں گے اور اللہ کے مقرب بندوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ یاد رکھو، ہر انسان بے حد خطا کار ہے اور خطا کاروں میں سب سے بہترین وہ ہے جو توبہ کرنے والا ہو۔

اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ (البقرۃ ۲: ۲۲۲)

دیکھو، اللہ تمھارے کتنا قریب ہے، عجب ہے کہ تمھیں اس کے قرب کا احساس ہی نہیں۔ چشم

ہوش سے دیکھو، اسے تم سے کتنی محبت ہے لیکن تمھیں اس کی محبت کی قدر ہی نہیں۔ تم پر اس کی رحمتیں کتنی زیادہ ہیں اور تم ہو کہ خوابِ غفلت سے جاگتے ہی نہیں سنو، وہ حدیث قدسی میں کیا کہتا ہے: میرا بندہ مجھ سے جو بھی گمان کرے میں اسی کے مطابق اس سے معاملہ کرتا ہوں میں اپنے بندے کے گمان و خیال کے ساتھ ہوں۔ جب بھی وہ مجھے یاد کرتا ہے، تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ وہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر مجھے کسی جمِ غفیر میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر جمِ غفیر میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اگر وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں۔ اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔

دیکھو کیا فرما رہا ہے: ''اے ابن آدم میری طرف چل کر آ میں تیری طرف دوڑ کر آؤں گا۔ بے شک وہ رات کو ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کے گنہگار توبہ کرلیں اور دن کو ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات کے گنہگار توبہ کرلیں۔ وہ انسان پر اس کی مہربان ماں سے بھی زیادہ مہربان ہے''۔ ''بے شک اللہ لوگوں کے اوپر مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔'' (الحج: ۶۵)

میرے پیارے بھائی! جس نے وقت کے حقوق پہچان لیے اس نے درحقیقت زندگی کی قیمت پہچان لی، کیونکہ وقت ہی تو زندگی ہے۔ جب زندگی کا پہیہ ہماری زندگی کے سفر کا ایک سال طے کرلیتا ہے اور ہم دوسرے سال کا استقبال کرنے میں لگ جاتے ہیں تو ہم عملاً ایک دوراہے پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس فیصلہ کن گھڑی میں ہمیں اپنے ماضی کا بھی محاسبہ کرنا ہے اور مستقبل کا بھی حساب لگانا ہوتا ہے تاکہ کہیں حساب کی اصل گھڑی اچانک سر پہ نہ آ جائے۔ وہ گھڑی جو یقیناً آ کر رہنی ہے۔ ماضی کا محاسبہ اس لیے تاکہ ہم اپنی غلطیوں پر نادم ہوں، اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کا تدارک اور اپنی کج روی کو درست کریں کیونکہ ابھی موقع بھی ہے اور فرصت بھی۔ اور ہمیں مستقبل کو بھی دیکھنا ہے، تاکہ اس کے لیے بھرپور تیاری کریں۔

یہ تیاری کیا ہے؟ پاک، صاف، سچا دل، عمل صالح اور نیکی اور خیر کی طرف تیزی سے آگے بڑھنے کا عزم صادق۔ مومن ہمیشہ دونوں پہلوؤں سے فکرمند رہتا ہے: ایک طرف تو اسے اپنے سابقہ عمل کے بارے میں دھڑکا رہتا ہے کہ پتہ نہیں میرا یہ عمل اللہ کے ہاں کیا مقام پائے گا۔

دوسری طرف باقی ماندہ مہلت کے بارے میں دل لرزتا رہتا ہے کہ نہ جانے اس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ کیا ہوگا۔ لہٰذا، ہر بندے کو خود اپنے آپ ہی سے اپنے لیے توشہ حاصل کرنی ہے، اپنی دنیا سے اپنی آخرت تعمیر کرنا ہے۔ بڑھاپے سے بھی پہلے اور موت سے بھی پہلے پہلے۔ حبیب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں:

> کوئی ایسا دن طلوع نہیں ہوتا جو پکار پکار کر نہ کہہ رہا ہو کہ اے ابن آدم! میں لمحہ ء تازہ ہوں اور میں تمھارے عمل پر گواہ ہوں، مجھ سے جو چاہو حاصل کرو میں چلا گیا تو پھر قیامت تک دوبارہ نہیں آؤں گا۔

میں نئے سال کی مناسبت سے کچھ لکھنے بیٹھا تھا، میرا خیال تھا کہ میں ہجرت نبوی کی یاد میں کچھ لکھوں، اس کے کچھ واقعات سے دلوں کو گرماؤں لیکن میں بالکل دوسری سمت جا نکلا۔ میں اپنے ان بھائیوں کے ساتھ راز و نیاز کرنے لگا جنھوں نے وقت کے حقوق ضائع کر دیے، جو زندگی کے اصل راز سے غافل رہے۔ صد افسوس کہ انھوں نے اس امتحان کو فراموش کر دیا جس کے لیے ہم سب کو وجود ملا ہے۔ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (ملک:۲) تمھارا رب وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو تخلیق کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔

میں کچھ اور لکھنے بیٹھا تھا لیکن میں نے اچانک خود کو اپنے محترم اور عزیز بھائیوں سے مخاطب پایا۔ دل میں امید پیدا ہوئی کہ اس طرح شیطان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے رحمٰن کی پناہ میں آجائیں، ہم سب رضائے خداوندی کے اس قافلے میں شریک ہو جائیں، جسے اس کی طرف سے مغفرت اور رضوان عطا ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کے رجسٹر میں نئے محرم الحرام کا آغاز ایک نئے اور صاف و سفید صفحے سے ہو اگر پچھلے صفحات گناہوں کی وجہ سے سیاہ پڑ گئے تھے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے توبہ و استغفار کے ذریعے نیکیوں میں تبدیل فرما دے:

> وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے۔ حالانکہ تم لوگوں کے سب اعمال کا اسے علم ہے۔ وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دیتا ہے۔ (الشوریٰ: ۲۵،۲۶)

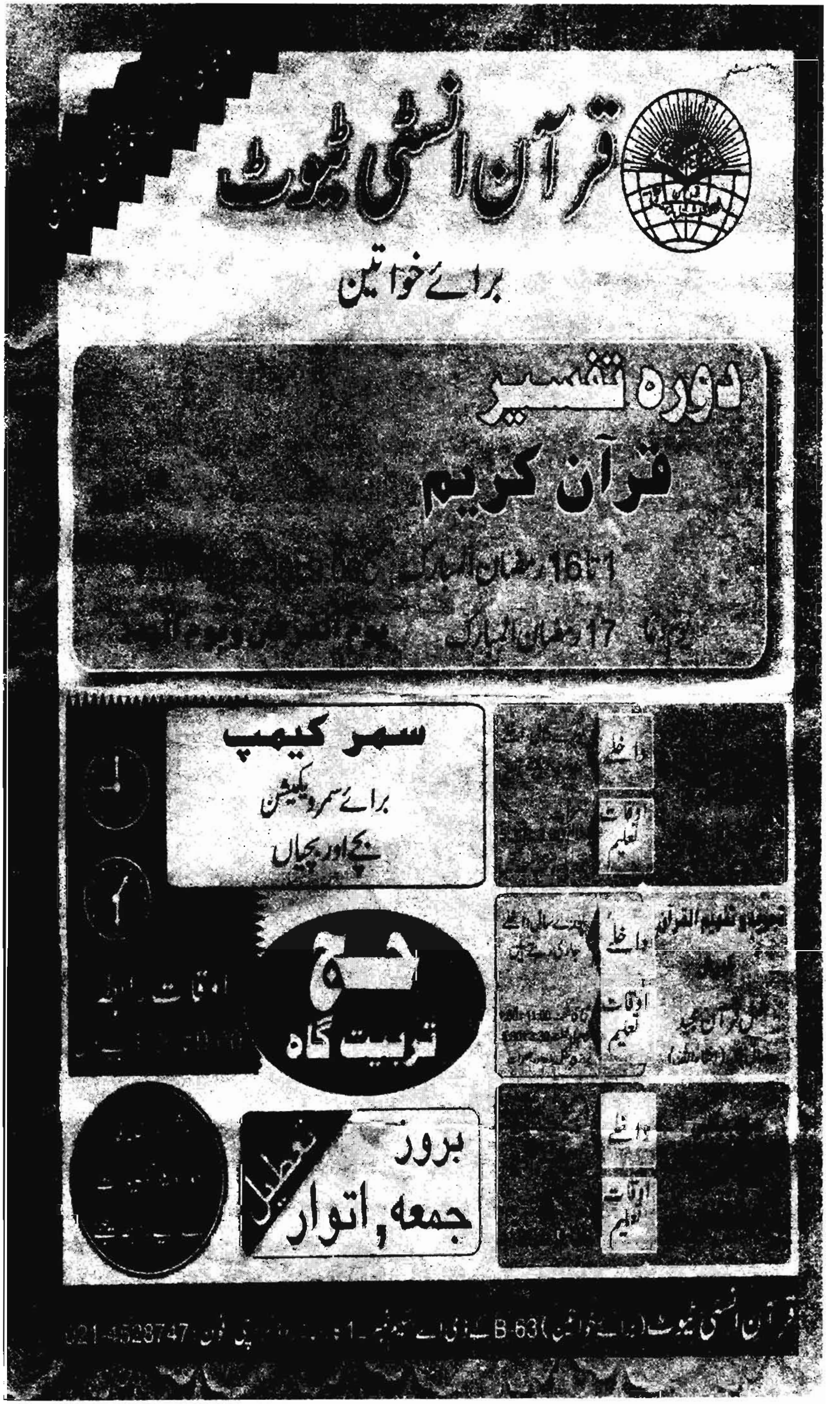
آیئے دیکھیں ہم پر پروردگار کی نگرانی کس قدر عظیم ہے:

ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو جانتے ہیں، ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں اور (ہمارے اس براہ راست علم کے علاوہ) دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔

کیا انھوں نے سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں۔ ہم سب کچھ سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔ (الزخرف: ۸۰)

آیئے دیکھیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا حساب کتنا دقیق ہوگا۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (الزلزال ۹۹: ۷-۸) جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

(مجلہ الاخوان المسلمون، محرم الحرام ۱۳۶۸ھ، ۲ نومبر ۱۹۴۸ء)


قرآن انسٹی ٹیوٹ
برائے خواتین
دورہ تفسیر
قرآن کریم
1 تا 16 رمضان المبارک
17 رمضان المبارک
سمر کیمپ
برائے سمر ویکیشن
بچے اور بچیاں
حج
تربیت گاہ
بروز
جمعہ، اتوار
تعطیل
021-4528747

اپنے خدا سے وفا کیجیے

ادھر قدم بڑھانے سے پہلے اپنی واپسی کو کشتیاں جلا دیجیے۔

یہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھیے کہ اب پلٹ کر جانے کی کوئی جگہ آپ کے لیے نہیں ہے۔ خدا سے عہد باندھنے کے بعد جس جان و مال کو آپ بیچ چکے، اسے اب آپ واپس نہیں لے سکتے۔ اس معاہدے کے ساتھ ہی آپ سر دھڑ کی بازی لگا چکے ہیں۔ اب آپ کو جان لڑا کر یہ کام کرنا ہے، خود اس راہ پر چلنا ہے اور دوسروں کو اس پر چلانا ہے۔۔۔ یہاں آ کر اگر آپ اس کام میں دلچسپی نہ لیں گے، یا وقت مال، محنت اور دل و دماغ اور جسم و جان کی قوتیں اس راہ میں صرف کرنے سے جی چرائیں گے، یا دوسرے کاموں کو اس کام پر مقدم رکھیں گے تو اپنے خدا سے بے وفائی کریں گے۔

آپ کا عہد کسی انسان سے نہیں، خدا سے ہے۔۔ اب آپ کی ہر چیز پر پہلے اور مقدم حق خدا اور اس کے کام کا ہے۔ باقی تمام چیزیں اس سے موخر ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ

جماعت اسلامی

ضلع بن قاسم

کراچی

استغفار، ہمارا شعار

اگر ہم صبح آنکھ کھلنے سے رات آنکھ لگنے تک اپنے گناہوں کا شمار کریں' تو شمار نہ کر سکیں گے۔ خیال کے گناہ' نظر کے گناہ' کان کے گناہ' رویوں اور برتاؤ کے گناہ...... (ماحول گناہوں کی طرف اُبھارنے والا اور دھکیلنے والا جو ہے)

____ اور نیکیاں شمار کرنا چاہیں تو شاید شمار کر لیں لیکن ایک کی ۱۰ ابنا کر بھی شاید پلڑا برابر نہ آسکے!

مسئلے کا ایک ہی حل! استغفار!

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ (انفال ۸:۳۳)

ہمارے جو اعمال و حالات ہیں اور جو ملکی پالیسیاں جاری ہیں' یہ عذاب کو دعوت دینے والی ہیں۔ چشم بینا سے دیکھا جائے تو غالباً ہم طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہیں۔ ہم استغفار نہیں کرتے۔

بچنے کا ایک ہی راستہ: استغفار!

ہم استغفار کو شعار بنالیں' راستہ چلتے' سواری پر سفر کرتے زبان کو استغفار کے کلمات سے تر رکھیں' دل میں اللہ کا خوف ہو' یقیناً گناہ کرتے کچھ تو شرم آئے گی۔

استغفار کے متعدد مسنون کلمات ہیں' یاد کر لیں تو کیا کہنا' مختصر نسخہ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ ہے۔

گناہ کھلے عام کیے جا رہے ہیں' استغفار بھی کھلے عام ہو۔ استغفار کی مجلس منعقد ہو۔ صرف استغفار کے لیے مقامی اور قومی سطح پر بڑے بڑے جلسے کیے جائیں۔

اللہ کے حضور روئیں' گڑگڑائیں' صرف گناہ ہی معاف نہ ہوں گے بلکہ:

"میں نے کہا: اپنے رب سے استغفار کرو' بے شک وہ بڑا مغفرت کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا' تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا' تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کر دے گا"۔ (نوح ۷۱: ۱۰-۱۲)

(عطیہ اشتہار: فرخ سیر)

ایک مسیحی کی نظر میں

مکرم عبید پاشا°

آپ کی مہربانی کہ آپ نے مجھے امام حسن البنا کی یاد میں کچھ لکھنے کے لیے کہا۔ وہ قائد کہ جس کے لیے اللہ کی رحمت نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ اس بے وفا دنیا کو چھوڑ کر اپنے رحمٰن و رحیم پروردگار کے حضور پہنچ جائے۔ اللہ کی رحمت نے ہمارے لیے بھی یہ چاہا کہ جس عظیم شخصیت سے ہم محروم ہوئے ہیں وہ اپنی یادوں اور اپنے تقویٰ کے ساتھ ہمارے سامنے موجود رہے۔

اے اخوان المسلمون! اگر آپ لوگ اپنے بڑے بھائی سے محروم ہوگئے ہیں، تو آپ کو اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ وہ شخص جس نے ہر رشتے اور واسطے کو چھوڑ کر اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر رکھا تھا، اس نے انتہائی پاک دامنی کی حالت میں اپنی جان اپنے دین اور عقیدے پر نثار کردی۔ آپ لوگ جب بھی اسے یاد کریں گے تو اسے معزز و محترم اور پایندہ پائیں گے۔ جب موت انسان پر قبضہ کرنے کے لیے زندگی سے برسرپیکار ہوتی ہے تو زندگی کو غلبہ اس وقت ملتا ہے جب ایسے انسان کو یاد رکھا جائے، اور موت اس وقت غالب آتی ہے جب اسے فراموش کردیا جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ الشیخ حسن البنا ہم سب کے دلوں میں اپنی یادوں کی بدولت

° ۲۰ویں صدی کے ربع ثانی میں مصر کے ایک قبطی مسیحی لیڈر، نامور قانون دان، سعد زغلول کے دورِ حکومت میں وفد پارٹی کے ایک لیڈر، برطانوی قبضے کے دوران وطنی تحریک کے ایک سرگرم و پُرجوش قائد مکرم عبید پاشا۔ آپ واحد مصری ہیں جنھوں نے تمام رکاوٹوں کے باوجود امام شہید حسن البنا کے جنازے میں شرکت کی اور تعزیت کے لیے شہید کے والد محترم کے گھر تشریف لے گئے۔ جب ان سے درخواست کی گئی کہ آپ امام مرحوم کی یاد میں کچھ تحریر کریں، تو انھوں نے یہ مختصر مضمون لکھا۔ ترجمہ: محمد ظہیر الدین بھٹی

زندہ ہیں۔ بھلا وہ شخص کیوں کر پایندہ نہ رہے جس نے دین میں اپنے پروردگار کی ہدایت اختیار کی اور دنیا میں قلب کی سلامتی کو مشعل راہ بنایا!

اے اخوان المسلمون! آپ لوگ اسے یاد کریں، اسے بار بار یاد کریں، اسی یاد میں اس کی اور آپ لوگوں کی زندگی مضمر ہے۔ ذرا دیکھو یہ بات کون کہہ رہا ہے؟ یہ مکرم عبید ہے، مرحوم کا مسیحی دوست، جس نے اپنے اس مسلمان بھائی میں صدق وامانت کو یک جا پایا۔ مرحوم کو یاد کرتے وقت میں آپ کو کیسے نہ بتاؤں کہ ہمارا اکثر ایک دوسرے سے ملنا جلنا رہتا تھا۔ میں اس کی عظمت وفضیلت کی گواہی کیوں نہ دوں کہ میں اسے انتہائی قریب سے جانتا ہوں۔ مجھے قسم ہے حق کی کہ یہ ایک سچّی گواہی ہے، میں اس گواہی پر اپنے رب کو گواہ ٹھیراتا ہوں۔ میں یہ شہادت زبان کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی گہرائی سے دے رہا ہوں۔ یہ ایک ایسے شخص کی گواہی ہے جس کے اور مرحوم کے مابین قدرِ مشترک ایک رب پر ایمان اور اتحادِ ملّی پر ایقان تھا۔ تمام آسمانی مذاہب میں توحید صرف اس قدر کافی نہیں کہ آپ اللہ کو ایک قرار دیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ خود بھی اپنے اللہ کی خاطر ایک ہو جائیں۔ قومی وحدت کے لیے محض ملک اور خطے کا یک جا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ ملک کے تمام باشندوں کا متحد ہونا بھی ضروری ہے۔

صرف اخوان المسلمون اور وفد پارٹی ہی دو ایسی تنظیمیں تھیں جو 'دار الاخوان' اور 'وفد پارٹی کے کلب' میں باہم ملاقاتوں کا اہتمام کرتی تھیں۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ حسن البنا میرے گھر تشریف لائے اور ہم نے ذاتی دل چسپی کے امور اور قومی معاملات پر طویل تبادلۂ خیال کیا۔ مجھے ان کی باتیں سن کر ایسے لگتا تھا جیسے وہ ظاہر پرستی اور رسمی باتوں سے کوسوں دور اور بلند تر ہوں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہم لوگوں میں ان جیسی گہری فکر والا اور پاک ضمیر شخص کم ہی ہوگا۔

ان کی شہادت کے بعد میں نے انھیں ان کے گھر میں دیکھا۔ یہ ایک ایسی انوکھی ملاقات وزیارت تھی جس کے کرب ناک اور خوف ناک اثرات کو میں مرتے دم تک نہ بھلا سکوں گا۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت دلی صدمہ پہنچا کہ پولیس کی نفری نے اس سڑک کا محاصرہ کر رکھا ہے جس پر مرحوم کا گھر واقع تھا۔ اگر پولیس آفیسر مجھے پہچان کر وہاں سے گزرنے کی اجازت نہ دیتا تو میں تعزیت کا فریضہ سرانجام دینے سے بھی قاصر رہ جاتا۔

میں اگر سب کچھ بھی بھول جاؤں تب بھی میں اس بات کو ہرگز نہ بھلاسکوں گا کہ ان کے والد بزرگوار میری اس حاضری سے کس قدر متاثر تھے۔ انھوں نے آبدیدہ ہوکر مجھے بتایا کہ مرحوم کے جنازے کے پیچھے چلنے سے عوام کو زبردستی روک دیا گیا ہے۔ مرحوم کے والد کے ماسوا، کسی کو بھی میت کے پیچھے چلنے کی اجازت نہ تھی، نہ کسی کو تعزیت کے لیے ان کے گھر جانے دیا گیا۔

دکھی والد نے شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے اپنی دعاؤں سے نوازا، میں اب تک ان دعاؤں سے برکت پاتا ہوں۔ میں مغموم والد محترم سے کہنا چاہتا تھا کہ تعزیت کرنا اگر ایک لازمی انسانی فریضہ ہے تو پھر مجھ سمیت ہر مصری نے یہ فریضہ انجام دیا ہے، کیونکہ ہر مصری کو ان کے فرزندِ مظلوم کی وفات کا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ تعزیت نہ کرنا یا نہ کرنے دینا ہماری روایات اور اقدار سے انحراف ہے۔

میرے بھائیو! جی ہاں، آپ سب لوگ میرے بھائی ہیں۔ اے اخوان المسلمون! آپ لوگ وطن اور قومیت کے لحاظ سے میرے بھائی ہیں۔ آپ میرے سب سے قریبی بھائی ہیں۔ مرحوم کو یاد کرتے وقت، آپ ان کی اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ مرحوم ہمیشہ آزادی کی بات کیا کرتے تھے۔ وہ جیل میں رہ کر بھی اپنے ملک و قوم کی آزادی کا مطالبہ کرتے تھے۔ ظالموں نے شہید کر کے انھیں ہر غم سے آزاد کر دیا۔ ان کی اس آزادی میں بیک وقت اجر بھی ہے اور جدوجہد جاری رکھنے کا پیغام بھی۔ (مجلہ الدعوۃ، ۱۶ جمادی الاول ۱۳۷۱ھ)

❋❋❋

صبر و حکمت

"اللہ کے دین کے لیے جو کام ہم کو کرنا ہے، اس میں ہمارے اندر دو صفتیں ضرور ہونی چاہییں۔ ایک صبر، دوسری حکمت۔

صبر کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی راہ میں جو رُکاوٹ بھی ڈالی جائے، اُس پر نہ تو مشتعل ہو کر آپ ذہن کا توازن کھو بیٹھیں اور نہ دل شکستہ ہو کر اپنے مقصد کے بجائے رُکاوٹ ڈالنے والے کا مقصد پورا کریں، بلکہ ہر رُکاوٹ پیش آنے پر آپ کا عزم جوں کا توں قائم رہنا چاہیے اور جذبات کی گرمی سے اپنے دل و دماغ کو محفوظ رکھ کر آپ کو وہ راہ اختیار کرنی چاہیے جو حکمت کے مطابق ہو۔

حکمت یہ ہے کہ آپ بس ایک ہی لگی بندھی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے کے عادی نہ ہوں، بلکہ آپ میں یہ صلاحیت ہو کہ ایک راستہ بند ہوتے ہی دس دوسرے راستے بروقت نکال سکیں۔ جس شخص میں حکمت نہیں ہوتی، وہ ایک راہ کو بند پا کر بیٹھ جاتا ہے اور اِس کے ساتھ اگر وہ بے صبرا بھی ہو تو پھر یا تو اُس رُکاوٹ سے اپنا سر پھوڑ لیتا ہے یا راہ روی سے ہی باز آ جاتا ہے۔

مگر جسے اللہ نے **صبر** اور **حکمت** دونوں سے نوازا ہو، وہ جُوئے رواں کی طرح ہوتا ہے، جس کی منزل کوئی چیز بھی کھوٹی نہیں کر سکتی۔ چٹانیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور دریا کسی اور طرف سے اپنی منزل کی طرف نکل جاتا ہے"۔ (۱۹۶۳ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے کُل پاکستان اجتماعِ عام سے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے خطاب سے اقتباس)

آفتاب الدین قریشی، کراچی

جہاد فلسطین کا مرکزی کردار

ڈاکٹر محمد محمود صیام ○

ارض فلسطین کے بارے میں جب بھی جہاد کا ذکر کیا جائے گا، اخوان المسلمون کا نام سرفہرست ہوگا، بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہو کہ یہاں اب بھی حقیقی جہاد اخوان المسلمون ہی کررہی ہے۔

اخوان نے ارض مقدس کو اپنے خون سے سیراب کیا اور اس کے ہزاروں شہدا نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ فلسطین کی موجودہ تحریک حرکة المقاومة الاسلامیه اسلامی تحریک مزاحمت (حماس) بھی اخوان المسلمون کے لگائے ہوئے پودے ہی کی ایک شاخ ہے۔ اخوان المسلمون کی بنیاد امام حسن البنا نے مارچ ۱۹۲۸ء میں رکھی تھی اور وہی اس کے پہلے مرشد عام تھے' جب کہ ان کی پیدایش ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ہوئی تھی۔ اس طرح اخوان المسلمون کے قیام کے وقت ان کی عمر صرف ۲۲ برس تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا' جب انھوں نے دارالعلوم قاہرہ سے سند فراغت حاصل کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ وہ اپنی پوری تعلیمی زندگی میں اس طرح کی کوئی تنظیم بنانے کے بارے میں سوچتے رہے تھے، جو ان کے خیال میں دین اسلام کی تجدید اور مسلمانوں کے دلوں میں اس کے احیا کے لیے ضروری تھی۔

دنیا کے گوشے گوشے میں جو تحریکیں اقامت دین کا کام کررہی ہیں، ان پر اخوان المسلمون کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اخوان المسلمون کے پہلے

○ سابق خطیب مسجد اقصیٰ، صدر اسلامی یونی ورسٹی غزہ، فلسطین۔ ترجمہ: گل زادہ شیر پاؤ

مرشد عام امام حسن البنا کی کوششیں تھیں، جنھوں نے اخوان المسلمون کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔ یہاں پر یہ ذکر برمحل ہوگا کہ امام ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) نے برعظیم پاک و ہند میں دین اسلام کی ترویج وتجدید کے لیے بڑی عظیم کوششیں کیں۔ یہ بھی امام حسن البنا کے ساتھیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان دونوں رہنماؤں نے اپنے دور میں تجدید و احیاے دین کا کارنامہ سرانجام دیا۔ ان ہستیوں کے ذریعے عالمِ اسلام میں ایسی تحریکوں کی بنا پڑی جس کی نظیر ہمیں دُور دُور تک کہیں نظر نہیں آتی۔ انھی تحریکوں کے ذریعے پوری دنیا میں علم جہاد بلند ہوا اور مسلمان اس عظیم مقصد کے لیے اپنے تمام وسائل بروے کار لائے۔ ان حضرات، یعنی البنا اور مودودی کی فکر بڑی حد تک ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔

مسئلہ فلسطین کے ساتھ دونوں رہنماؤں کی گہری وابستگی تھی اور فلسطینیوں کے حقوق کے بارے میں ان کی سیاسی پالیسیاں بھی بڑی واضح اور مخلصانہ تھیں۔ انھوں نے مسئلہ فلسطین کے منصفانہ حل کے لیے عظیم خدمات انجام دیں اور اہل فلسطین کی بھلائی اور ان کے منصفانہ موقف کی حمایت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے بعد ان کے رفقا کی جدوجہد ہی ہے، جس نے مسئلہ فلسطین کو اس کے محدود دائرے (یعنی اسے صرف فلسطین یا عرب کا مسئلہ متصور کیے جانے کی سوچ) سے نکال کر اسے عالم اسلام کا مسئلہ بنا دیا۔ دنیا کے گوشے گوشے میں مسلمان مسئلہ فلسطین کو اپنا مسئلہ سمجھنے لگے اور اس معرکے کو قابض صہیونیوں کے خلاف اپنی جنگ تصور کرنے لگے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد امام البنا اسماعیلیہ میں استاد مقرر ہوئے۔ یہ علاقہ نہر سویز کے کنارے واقع ہے جو اس وقت قابض انگریز فوج کی چھاؤنیوں میں گھرا ہوا تھا۔ امام نے اسماعیلیہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اور اپنی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اپنی فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کام شروع کیا۔ وہ اسماعیلیہ کے محلوں اور قرب و جوار کی بستیوں میں اخوان المسلمون کے لیے ایک کے بعد ایک مراکز، شاخیں، مدرسے اور مسجدیں بناتے رہے۔ اس طرح ان کے حامیوں اور ساتھیوں میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ اس دوران امام کی حالت یہ ہوتی کہ دن رات میں چند گھنٹوں کے علاوہ نیند ان کے قریب بھی نہیں آسکتی تھی۔ وہ دن کا اکثر حصّہ اخوانی عوام اور کثیر آبادی والے علاقوں میں بطور ایک داعی، معلم اور واعظ کے دوروں میں گزارتے تھے۔

امام البنا نے اپنی کوششوں کو صرف مردوں اور نوجوانوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ بڑے پیمانے پر خواتین کو بھی اپنی دعوت کا مخاطب بنایا۔ صرف ان کی دعوت پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کا بھی موثر انتظام کیا۔ چنانچہ اسماعیلیہ میں ان کے لیے جدید طرز پر مدرسہ امہات المؤمنین کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسے میں اسلامی نہج پر تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ زمانے کے تقاضوں اور ضروریات کا بھی انتظام تھا۔ یہ مدرسہ جدید وقدیم علوم کا حسین امتزاج تھا۔

جب اسماعیلیہ اور اس کے قرب و جوار میں اخوان المسلمون کو تقویت ملی تو امام کو دوسرے مقامات پر بھی کام کرنے کا حوصلہ ملا اور ان کے دل میں شوق پیدا ہوا کہ اب اللہ تعالیٰ ان کی دعوت کے لیے ایک نیا دروازہ کھول دے۔ اس طرح انھوں نے مرکز دعوت کو قاہرہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ امام کی ملازمت بھی ادھر منتقل ہو چکی تھی۔ دعوت کے اس نئے مرکز سے یہ دعوت دنیا بھر میں پہنچ گئی۔ اس دعوت کے علَم بردار اپنے امام کے حکم سے ملک اور بیرون ملک، دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور اس دعوت کی اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

اخوان المسلمون کے مرکز میں امام کے ہفتہ وار دروس ہوتے تھے۔ دینی، قومی اور تاریخی اہم مواقع پر ان کے لیکچروں کا انتظام ہوتا تھا۔ جریدۃ الاخوان میں ان کے روزانہ خطوط شائع ہوتے تھے اور مصر کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں ان کے دورے ہوتے تھے۔ یہ تمام سرگرمیاں امت کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا ذریعہ بن رہی تھیں، اور اسے اپنے مقصدِ وجود سے آگاہ کر رہی تھیں۔

امام البنا نے زیادہ کتابیں نہیں لکھیں لیکن انھوں نے ہزاروں مؤلفین اور مفکرین تیار کیے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے امام کی ہدایات اور ان کے رسائل سے' جن کی تعداد ۲۰ سے زیادہ نہیں ہوگی' فیض حاصل کیا۔ ان ہدایات و رسائل کی وجہ سے وہ اس قابل ہوئے کہ مسلمانوں کی نشاتِ ثانیہ سے متعلق مختلف میدانوں میں تصنیف و تالیف کا کام کریں۔ اسی حوالے سے امام حسن البنا کا شمار ۲۰ویں صدی عیسوی کے مجدد ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ ہوتا ہے۔

امام حسن البنا کا کارِتجدید دین اسلام کے کسی ایک پہلو تک محدود یا مسلمانوں کے کسی ایک مسئلے پر اکتفا کرنے والا نہیں تھا، بلکہ یہ تجدید ان تمام پہلوؤں پر حاوی تھی جن کے حوالے سے

امت کا پرچم سرنگوں ہو چکا تھا اور ان کے مقاصد پست ترین سطح پر اتر آئے تھے۔

یہ تجدید عقیدے کی تجدید تھی جو لوگوں کے دلوں میں ڈانواں ڈول ہو چکا تھا۔ اسی طرح یہ اخوت کی تجدید تھی، جس کا کوئی نام ونشان تک مسلمانوں کی زندگی میں عملاً باقی نہیں رہا تھا۔ یہ اسلامی فکر کی تجدید تھی جسے غاصب استعماری قوتوں نے لوگوں کے ذہنوں میں مشتبہ کر ڈالا تھا۔ یہ فقہ کی تجدید تھی جو جامد ذہن رکھنے والوں اور انتہا پسندوں کی وجہ سے جمود کا شکار ہو چکی تھی۔ یہ تعلیم و تربیت کی تجدید تھی جس کا دائرہ مقلدانہ نصاب تعلیم تک محدود ہو چکا تھا۔ یہ علوم وفنون کی تجدید تھی جس کے سرکردگان مغربی تہذیب کی چکا چوند سے متاثر تھے۔ یہ معیشت کی تجدید تھی جو سود پر مبنی معیشت کی وجہ سے کھوکھلی ہو کر تباہ ہونے کے قریب تھی۔ یہ ذرائع ابلاغ کی تجدید تھی جن کا کام گانے بجانے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ ایک حرکی اور دعوتی تجدید تھی۔ یہ تجدید اس دعوت کا احیا تھی جو جمود کا شکار ہو کر دم توڑنے کے قریب تھی۔ یہ معاشرتی زندگی کی تجدید تھی جو خواب غفلت سے بیداری کی طرف دعوت دے رہی تھی۔ یہ سیاست کی تجدید تھی جو دھوکا، فریب دہی اور بدترین غلامی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ یہ جہاد کی تجدید تھی جس کا صیغہ مسلمانوں کی لغت اور یادداشت سے محو ہو چکا تھا۔

اس طرح امام حسن البنا کا شمار بجا طور پر ۲۰ویں صدی کے نمایاں ترین مجددین میں ہوتا ہے۔ یہ موقع اس تفصیل میں جانے کا نہیں ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس ہمہ پہلو تجدید نے مختلف معاشروں کو کس طرح متاثر کیا۔ ہم یہاں اس تجدید کے صرف جہادی پہلو کے متعلق گفتگو کریں گے جو مسلمانوں کے دلوں میں نشاتِ نو کا پیغام تھا، اور جس کے نتیجے میں اہل فلسطین کی حمایت کی ایک عظیم الشان تحریک برپا ہوئی۔

○ **امام حسن البنا اور مسئلہ فلسطین:** اخوان المسلمون کی قابض اسرائیلیوں کے خلاف جہاد فلسطین میں شرکت سے پہلے امام حسن البنا نے انھیں عسکری، نفسیاتی، جسمانی، نظریاتی اور عملی طور پر مکمل تربیت دی تھی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جہاد کے بارے میں ایک خصوصی رسالہ تحریر کیا تھا، جس میں جہاد سے متعلق فقہاے امت کے بیان کردہ احکام کی وضاحت کی گئی ہے اور اس کے لیے قرآن وسنت کی نصوص سے استدلال کیا گیا ہے۔

امام نے جہاد کے بارے میں انتہائی قیمتی ارشادات پیش کیے ہیں، جنھوں نے اخوان کے دلوں میں جہاد کی محبت کو زندہ کردیا۔ انھوں نے رسالۃ الجہاد کا اختتام بھی انتہائی بیش قیمت کلمات سے کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اخوان ہمیشہ سے اس دن کے انتظار میں رہتے ہیں جس دن اللہ کے دشمنوں سے ان کا آمنا سامنا ہو، اور وہ اللہ کے سامنے اپنی جان کی قربانی کا وہ مظاہرہ کریں جس کے ذریعے اللہ ان سے راضی ہو جائے۔

رسالۃ الجہاد کے مقدمے میں امام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے جہاد کو ہر مسلمان پر فرض کردیا ہے۔ یہ ایک لازمی اور حتمی فریضہ ہے جس سے کسی کو چھٹکارا اور مفر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کی طرف بڑی ترغیب دی ہے اور شہدا و مجاہدین کے لیے عظیم اجر و ثواب کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ان کا مرتبہ اتنا بلند رکھا گیا ہے کہ جہاد کے علاوہ کسی عمل سے اس مقام تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین اور شہدا کو دنیا و آخرت میں وہ روحانی اور عملی امتیازات عطا فرمائے ہیں، جو ان کے علاوہ کسی کو نہیں دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے پاکیزہ خون کو دنیا میں فتح و نصرت کی قیمت اور آخرت میں فوز و فلاح کا عنوان بتایا ہے۔ جہاد سے پیچھے رہ کر بیٹھ جانے والوں کو دردناک سزاؤں کی وعید سنائی گئی ہے۔ انھیں بدترین صفات سے متصف کیا گیا ہے اور بزدلی اور بیٹھے رہنے پر سخت الفاظ میں سرزنش کی گئی ہے۔ کمزوری اور پستی کے اس رویے کے باعث دنیا میں ان پر وہ ذلت مسلط کی گئی ہے جس سے جہاد کے بغیر نجات ممکن نہیں، جب کہ آخرت میں ان کے لیے وہ عذاب تیار کیا گیا ہے جس سے چھوٹنے کے لیے اگر وہ احد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کریں تب بھی اس سے بچ نہ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد سے منہ موڑنے اور اس سے راہ فرار اختیار کرنے کو گناہ کبیرہ کی سب سے بڑی قسم شمار کیا ہے۔ یہ ان سات اعمال میں سے ایک ہے جو انسان کے لیے مہلک اور تباہ کن ہیں۔

دنیا میں کوئی قدیم و جدید نظام یا کوئی مذہبی یا تمدنی قانون نہیں ہے جس نے جہاد و دفاع کو اتنی اہمیت دی ہو اور اس کے لیے ساری امت کو ایک صف میں جمع کیا ہو' تا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ حق کا دفاع کر سکے۔ یہ صفت صرف دین اسلام اور اس کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے۔ قرآن و حدیث میں اس بلند مرتبہ فکر کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کی آیات اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بالکل واضح اسلوب اور فصیح ترین عبارت کے ساتھ جہاد و قتال کی دعوت دیتی ہیں، اور ہر قسم کے بری، بحری اور فضائی دفاعی وسائل کو مضبوط بنانے کی تاکید کرتی ہیں تاکہ مسلمان کسی بھی حالت میں دشمن کے مقابلے سے عاجز نہ ہوں۔ (رسائل الامام الشھید، ص۲۷۳)

امام فرماتے ہیں: میرے بھائیو! جو قوم مرنے کا سلیقہ جانتی ہے، اس قوم کو اللہ تعالیٰ دنیا میں باعزت زندگی اور آخرت میں دائمی جنت نصیب فرما دیتا ہے۔ جس چیز نے ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا ہے وہ دنیا کی محبت اور موت کی کراہت کے سوا کچھ نہیں۔ تم لوگ اپنے آپ کو ایک بڑے کام کے لیے تیار کرو۔ شہادت کی تمنا کرو گے تو تمھیں زندگی ملے گی۔ جان لو کہ موت تو آنی ہی ہے اور وہ ایک ہی مرتبہ آنی ہے۔ اگر تم نے اس کو اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے پالیا تو یہ دنیا کا نفع اور آخرت کا ثواب ہوگا۔ تمھیں وہی کچھ ملتا ہے جو تمھارے لیے مقرر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر خوب غور و فکر کرو گے:

> اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔ مگر ایک دوسرا گروہ جس کے لیے ساری اہمیت بس اپنی ذات ہی کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا، جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ "اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟" ان سے کہو: "(کسی کا کوئی حصہ نہیں) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔" دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں اسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل مطلب یہ ہے: "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔" ان سے کہہ دو: "اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔" اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لیے تھا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں پوشیدہ ہے، اللہ اسے آزمالے اور جو کھوٹ تمھارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۴)

پس تم باعزت موت کے لیے کام کرو، بھرپور سعادتوں کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں اپنی راہ میں شہادت سے سرفراز فرمائے۔ (ایضاً، ص ۲۹۱)

امام حسن البنا اخوان المسلمون میں حُبِ جہاد کی تربیت کے لیے صرف رسالۃ الجہاد پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ انھیں جب بھی موقع ملتا، دلوں میں اس جذبے کو اُبھارنے کی تدبیر کرتے تھے۔ چنانچہ وہ نوجوانوں کے نام اپنے پیغام میں فرماتے ہیں: ''اے نوجوانو! تم ان لوگوں سے کمزور نہیں ہو جن کے ہاتھوں اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس پروگرام کو عملی طور پر نافذ کر دکھایا تھا، لہٰذا تم وہن اور ضعف کا شکار مت بنو۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو اپنا نصب العین بناؤ کہ: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ؁ (اٰل عمرٰن ۳:۱۷۳) ''جن سے لوگوں نے کہا کہ ''تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو''، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا کہ ''ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے'')۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ایسا ایمان پروان چڑھایا ہے جو ڈگمگانے والا نہیں ہے اور ہم اس کے لیے مسلسل عمل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمیں اللہ پر ایسا اعتماد حاصل ہے جس میں کوئی کمزوری نہیں آتی، اور ہم ایسی روحوں سے سرشار ہیں جن کے لیے سب سے زیادہ باسعادت دن وہ ہوگا جب وہ اپنے رب کے راستے میں شہادت دے کر اس سے ملاقات کریں گی''۔ (ایضاً، ص ۱۰۳)

اپنے ایک اور رسالے میں فرماتے ہیں: ''سب کچھ کرنے کے بعد ہم اللہ کی مدد کا پختہ یقین رکھتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر ہمارا ایمان ہے اور جس کے لیے ہم کوشاں ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر یقین رکھتے ہیں: وَ لَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ (النساء ۴:۱۰۴) ''اس گروہ کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ، اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمھاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں''۔ ہمارے اسلاف میں سے جن لوگوں نے دنیا کو فتح کیا اور اللہ نے انھیں زمین میں سلطنت عطا فرمائی' وہ زیادہ تعداد یا بڑی تیاری نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ ایمان اور جہاد کے اسلحے سے لیس تھے''۔ (الاخوان تحت رایۃ القرآن'

(اخوان قرآن کے پرچم تلے)،ص ۱۱۸)

اخوان المسلمون نے یہ سبق یاد کیا تھا اور ان کے دلوں میں اس نے یقین کا مقام حاصل کرلیا تھا۔ یہاں تک کہ جب فلسطین میں جنگ کا میدان گرم ہوا، اور غاصب یہودیوں نے فلسطین کے باشندوں کو اپنے گھروں سے دربدر کر کے جنگ کی آگ بھڑکائی تو اخوان المسلمون مرشد عام کا حکم سنتے ہی میدان میں کود پڑے۔ اس راستے میں وہ کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائے حالانکہ وہ عسکری تربیت اور اسلحے کے حوالے سے کمزور تھے۔ وہ اللہ کی اطاعت میں راتیں جاگ جاگ کر گزارتے تھے مگر ان کے دل جامِ شہادت نوش کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ اس مقصد کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ کرنے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اس راستے کی ہر رکاوٹ اور ہر رخنے کو پاے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

اس تاریخ کو پروفیسر فتحی یکن نے اپنی کتاب القضیة الفلسطینیة من منظور اسلامی (مسئلہ فلسطین، اسلامی تناظر میں) میں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ۱۹۴۸ء میں امام حسن البنا نے حکومت مصر کو ایک درخواست پیش کی کہ وہ اخوان المسلمون کے ۱۰ ہزار رضا کاروں پر مشتمل ایک کمک فلسطین بھیجنا چاہتے ہیں، لیکن حکومت نے اس درخواست کو مسترد کر دیا۔ اس کے باوجود اخوان المسلمون نے مصر اور اُردن کی سرحدوں پر صف اول کے اکثر معرکوں میں دادِ شجاعت دی اور نمایاں کامیابیاں حاصل کیں، جن کی وجہ سے حکومت برطانیہ نے مصری وزیراعظم اور مصری ایجنٹوں کے ساتھ مل کر ایک سازش کے تحت اخوان المسلمون پر پابندی لگوا دی۔ اس کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا اور مرشد عام کو ۱۹۴۹ء میں شہید کروا دیا۔ (ص ۸۹-۹۰)

مسئلہ فلسطین کے ساتھ اخوان کا تعلق ۱۹۴۸ء کی جنگ سے نہیں ہوا بلکہ یہ اس وقت قائم ہوا تھا جب استاذ کامل الشریف کے بقول امام البنا نے کہا تھا: "ہر وہ ملک جس میں کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا جاتا ہے وہ ہمارے ملک کا حصہ ہے، وہ ہمارے لیے قابل عزت و احترام ہے۔ اس ملک کے ساتھ مخلص ہونا اور اس کی بھلائی کے لیے جہاد کرنا ہمارے ایمان کا حصہ ہے"۔

(الاخوان المسلمون فی حرب فلسطین، (جنگ فلسطین میں الاخوان المسلمون)، ص ۴۵)

استاذ کامل الشریف نے جو جنگ فلسطین میں اخوانی دستے کے کمانڈر تھے، اپنی کتاب میں

وہ بات لکھی ہے جو امام حسن البنا اور ان کے ساتھیوں کے مسئلہ فلسطین کے ساتھ والہانہ وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ کہتے ہیں: اخوان المسلمون کی ترجیحات میں مسئلہ فلسطین کو نہایت بلند مقام حاصل تھا کیونکہ القدس مسلمانوں کے لیے قبلۂ اول اور حرم ثالث کا درجہ رکھتا ہے اور یہ عرب ممالک کا مرکزی مقام ہے۔ اس کے ضائع ہونے سے اسلامی ممالک ایک دوسرے سے کٹ جاتے ہیں۔ اگر یہودی اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تو یہ شرپسند عناصر کا ایک خطرناک مرکز اور آگ سے بھرا ہوا ایک آتش فشاں ہوگا، جس سے ہمیشہ کے لیے عرب ممالک کے امن وامان کو خطرات لاحق ہوں گے۔ اسی لیے فلسطین کے بارے میں جب برطانوی حکومت کے ارادے واضح ہوئے تو اخوان المسلمون نے پے در پے کئی عوامی کانفرنسیں منعقد کیں۔ انھوں نے عوام اور حکومت کو اس خطرے کی حقیقت سے آگاہ کیا، جو ان کے قومی ڈھانچے اور ان کے مستقبل کو چیلنج کر رہا تھا۔ وہ اپنی مسلسل کوشش کے نتیجے میں پورے عالم اسلام کو اس مسئلے کا فریق بنانے میں کامیاب ہوئے' اور اب یہ مسئلہ صرف فلسطین یا صرف عربوں کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ پورے عالم اسلام کا مسئلہ بن گیا۔ (ایضاً، ص ۴۵)

فلسطین کے حالات جب دگرگوں ہوئے تو انھیں مال، اسلحہ اور جو کچھ بھی ملا، انھوں نے اسے لے کر مجاہدین کی مدد کو پہنچنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں اخوان المسلمون کے کچھ نوجوان فلسطین کی حدود میں گھس جانے میں کامیاب ہوئے اور حریت پسندوں کے ساتھ مل کر جہاد کا آغاز کیا۔ خاص طور پر شمالی علاقوں میں جہاں انھوں نے عظیم عرب مجاہد شیخ عزالدین القسام کی رفاقت میں جہاد جاری رکھا۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر اخوان المسلمون نے اس مسئلے کے حل کے لیے سفارتی اور عوامی سطح پر کام شروع کیا۔ انھوں نے اپنے نوجوانوں کے وفود عربوں کے پاس بھیجے تاکہ انھیں متحد کر کے مقابلے کے لیے تیار کریں۔ بعض اخوان نے خفیہ طور پر فلسطینی نوجوانوں کو جہادی تربیت دینے کا ذمہ لیا اور اس میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔ یہاں تک کہ اب ان کی وادیاں اور خود ان کے گھر مراکز قیادت اور تربیتی مرکز بن گئے۔

امام حسن البنا اور ان کے اخوانی شاگردوں کا مسئلہ فلسطین کے ساتھ تعلق مفصل جائزے کا متقاضی ہے۔ اسی طرح فلسطین میں اخوان المسلمون کا بہہ جانے والا خون اور بے شمار اخوانیوں کی شہادت بھی بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ پھر اہل فلسطین کی مدد کی وجہ سے انھیں اپنے ممالک میں جن

حالات سے دوچار ہونا پڑا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ مصر میں ان کی جماعت پر پابندی لگانے کی سازش ہوئی، تحریک کے نمایاں افراد کو جیلوں میں ڈال دیا گیا، اس کے تمام مراکز کو سیل کر دیا گیا۔ جماعت کی تمام دستاویزات، مجلّات اور مطبوعات کے علاوہ نقد سرمایے اور سارے املاک کو ضبط کرلیا گیا۔ اس سازش کی بنیاد وہ فوجی احکامات تھے جو ۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو حکومت مصر کی طرف سے جاری کیے گئے۔ (الامام الشھید، ص ۲۶۸)

ایک طرف یہ سازشیں تھیں اور دوسری طرف اخوان المسلمون کے مجاہد فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کے مقابلے میں روشن تاریخ رقم کر رہے تھے، جب کہ عرب ممالک کی باقاعدہ افواج شکست پر شکست کھا رہی تھیں۔ اس خیانت بھری فضا اور مصر میں جماعت کو ختم کرنے کے اقدامات کے درمیان امام حسن البنا نے مجاہدین فلسطین کے نام اپنا تاریخی پیغام بھیجا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا: میرے بھائیو! مصر کے حالات سے آپ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ آپ لوگوں کا کام فلسطین کو یہودیوں سے آزاد کرانا ہے، اور جب تک فلسطین میں ایک بھی یہودی موجود ہے آپ کا یہ کام اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا۔ (ایضاً، ص ۲۹۹)

جب اخوان المسلمون کو فلسطین میں غاصبوں کے مقابلے سے روک دیا گیا، کیونکہ خائن حکمرانوں کو یہی بات بھلی معلوم ہوئی، تو اخوان المسلمون کا شہرہ آفاق نعرہ پھر بھی وہاں باقی رہا، یعنی: اللّٰہ غایتنا ، الرسول زعیمنا ، القرآن دستورنا ، الجھاد سبیلنا ، الموت فی سبیل اللّٰہ اسمی امانینا، اللہ ہمارا مقصود، رسولؐ ہمارے قائد، قرآن ہمارا دستور، جہاد ہمارا راستہ اور اللہ کی راہ میں شہادت ہماری اعلیٰ ترین آرزو ہے۔ یہ نعرہ فرزندان فلسطین کے کانوں میں گونجتا رہا اور ان کے اجتماعات، جلسوں جلوسوں اور ہر قسم کے پروگرامات میں دہرایا جاتا رہا، یہاں تک کہ انھوں نے حرکۃ المقاومۃ الاسلامیہ (حماس) کی بنیاد رکھی جس نے اخوان المسلمون کے مشن کو عملی جامہ پہنانے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ وہ مشن یہ تھا کہ اللہ کی طرف دعوت دی جائے، خواب غفلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا جائے، فلسطین کی آزادی کے لیے جدوجہد کی جائے، اور بیت المقدس کو غاصبوں کے چنگل سے آزادی دلائی جائے۔

***

عظمت کے نقوش

محب الدین خطیب ○

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو تا قیامت قائم و دائم رکھنے کے لیے ہمیشہ اپنے نیک بندوں سے کام لیا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کرتے ہیں، انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کوئی ان کی تعریف کرتا ہے یا تہذیب سے عاری اقدامات اور طرح طرح سے روڑے اٹکا کر ان کی آواز کو دبانا چاہتا ہے۔ وہ ہر حال میں یک سوئی سے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں ایک گروہ اخوان المسلمون کا ہے جو مصر کے طول و عرض میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے اسماعیلیہ، محمودیہ، بحیرہ اور شبراخیت میں اخوان کے مراکز قائم کیے ہیں۔ وہ اچھے اخلاق اپنانے کی دعوت دیتے ہیں، غیر آباد مساجد کو آباد کرتے ہیں اور مسلمانوں کے مابین جھگڑوں میں صلح صفائی کرواتے ہیں۔

○ بانی و مدیر: الفتح، قاہرہ۔ یہ مختصر نوٹ کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ امام حسن البنا اور ان کی جدوجہد کے بارے میں سب سے پہلا لکھا گیا مضمون ہے جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا۔ تب ان کی جماعت کو قائم ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے اور ابھی اس کا تعارف محدود حلقے میں تھا۔ اس کے لکھنے والے معروف صحافی محب الدین خطیب ہیں جو ۲۰ویں صدی کے نصف اول میں اسلام کے علَم بردار رسالے الفتح کے بانی مدیر تھے اور ایک مشہور صحافی کے طور پر ملک بھر میں یکساں احترام کے حامل تھے۔ ہر حلقے میں انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا' جب کہ امام حسن البنا ابھی مصری سوسائٹی میں غیر معروف تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بعد میں شیخ محب الدین الخطیب نے امام کے ساتھ اور پھر ان کی ماتحتی میں اخوان المسلمون کے مختلف اخبارات اور جرائد میں تقریباً ۲۰ سال کام کیا۔ آپ ایک جید عالم تھے۔ انھوں نے امام کی قدر پہچانی اور ان کی قیادت میں کام کیا۔ (ادارہ) ترجمہ: سمیع الحق شیر پاؤ

نہر سویز پر واقع اسماعیلیہ شہر جنھوں نے بھی دیکھا ہے انھیں معلوم ہے کہ برطانوی فوجوں کی موجودگی کے باعث یہ شہر مکمل طور پر فرنگی شہر بن چکا ہے۔ یہاں کے مسلمان کسی ایسی راہ نما کی تلاش میں ہیں جو انھیں سیدھی راہ کی طرف لے جاسکے۔ اخوان المسلمون جس کی قیادت ہمارے مجاہد بھائی استاد حسن البنا کرتے ہیں، اس فریضے کو انجام دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اسماعیلیہ کے مسلمانوں کی اس دیرینہ ضرورت کو پورا کیا ہے۔

لوگوں کی تعلیم و تربیت اور دعوت و ارشاد کے ساتھ ساتھ انھوں نے وہاں پر ایک بڑی مسجد بھی تعمیر کی ہے جس کی شہر میں اشد ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ ہمارے بھائی حسن البنا نے اس مقصد کے لیے سویس کینال کمپنی کو ۵۰۰ پاؤنڈ دینے پر آمادہ کیا، جس سے اس مسجد کی تعمیر کا کام بہترین انداز میں مکمل ہوا ہے۔

شبراخیت شہر میں اس جماعت نے حفظ قرآن کے لیے ایک مکتب کا آغاز کیا ہے اور اسے 'مکتب حرا' کا نام دیا ہے۔ یہ نام اُس غار کے نام پر رکھا گیا ہے جس میں ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم بت پرستوں سے الگ ہوکر عبادت کرتے تھے، پھر اسی غار میں قرآن کریم کی پہلی وحی نازل ہوئی۔

اخوان المسلمون نے شبراخیت میں ایک مصالحتی کمیٹی بھی تشکیل دی، جو لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے کا کام کرتی ہے۔ ایک مسجد کمیٹی بنائی جو مساجد کی تعمیر و مرمت کے کام میں مصروف رہتی ہے۔ ایک اور کمیٹی قائم کی جس کے ذمے ہر رات کو جماعت کے مرکز اور بعض دیگر مساجد میں ہفتہ وار درس قرآن اور لیکچر کا اہتمام کرنا ہے تاکہ لوگوں کی تعلیم و تربیت اور وعظ و نصیحت کا بندوبست ہوسکے۔ اسی طرح مکتب کمیٹی بھی بنائی گئی تھی جس کا پہلا پھل 'مکتب حرا' کی شکل میں سامنے آیا، جہاں ۱۰۰ سے زائد بچے قرآن مجید حفظ کرتے ہیں اور باصلاحیت اساتذہ کی زیرنگرانی مفت تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان اساتذہ کی تنخواہیں اخوان المسلمون ادا کرتی ہے۔

شبراخیت میں اخوان کی سرگرمیوں میں ہمارے معزز بھائی اور ایک عالم باعمل شیخ حامد عسکریہ پیش پیش ہیں۔ محمودیہ (البحیرہ) میں اخوان کے کام کو ہمارے ایک مخلص بھائی استاد احمد افندی السکری نے سنبھال رکھا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے مزید توفیق اور اجر کی دعا کرتے ہیں۔

اس مضمون کے جواب میں محبّ الدین الخطیب کے نام امام حسن البنا نے ایک خط ارسال

کیا جس سے ایک مخلص داعی کا اخلاص جھلکتا ہے، جو اَن تھک محنت اور جہدِ مسلسل کے باوجود یہ محسوس کرتا ہے کہ ابھی اس نے اللہ تعالیٰ کا اور اس کے دین کی دعوت کا حق ادا نہیں کیا۔ اس خط سے اخوان المسلمون کی دعوت کی خصوصیات بھی نمایاں ہوتی ہیں جس میں سب سے اہم 'عمل کو قول پر اور خدمت کو پروپیگنڈے پر ترجیح' دینا ہے۔ ذیل میں امام کے خط کا متن پیش کیا جاتا ہے:

محترم و مکرم استاد جناب محب الدین صاحب

میں آپ کو اور آپ کی اس پاکیزہ روح کو سلام پیش کرتا ہوں جو مسلسل مسلمانوں کے دلوں کو منور کرتی رہتی ہے اور ان کے لیے دین و وطن کی خدمت کا راستہ روشن کرتی ہے۔ آپ کی جہدِ مسلسل پر آپ کا دلی شکریہ۔ ہماری دعا ہے کہ لوگوں سے پہلے یہ اللہ کے ہاں شکریے کا مستحق قرار پائے۔ لوگوں سے پہلے اللہ اسے جانے، اور اللہ کے نیک بندے اس کا حق ادا کریں، کیونکہ یہ حق کی کامیابی کی نوید ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ وبعد

میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم اپنے موقر جریدے الفتح جو کہ درحقیقت اسلام کا ترجمان ہے، کے قارئین کو اخوان اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں بتائیں، جب کہ یہ پودا اپنی نشوونما کے بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ میں خاموش رہنا چاہتا تھا تاکہ اخوان کے اثرات خود اس کے مقاصد کی نشان دہی کریں اور لوگ اسے اس کی کوششوں سے پہچانیں، اس کی آواز اس کے کام کی زبان سے سنیں۔ ہم مسلمان بہت کچھ کہہ چکے ہیں، یہاں تک کہ ہم نے عمل چھوڑ دیا اور قول تک محدود ہو کر رہ گئے۔ ہم نے سوچ ہی سوچ میں زندگی گزار دی اور کبھی اپنی سوچوں کے نفاذ کے لیے قدم نہیں اٹھایا۔ یہ شاید ہم مشرقی لوگوں کا ایک مشترکہ، تکلیف دہ مرض ہے۔ ہم اسی راستے پر چلتے چلتے تھک گئے۔

اخوان کے بارے میں اپنے موقر جریدے میں اس طرح لکھنے سے یقیناً کچھ لوگ غلط خیال کرتے ہوں گے کہ شاید ہم اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے یا اپنی ان کوششوں پر فخر جتانے کے لیے اس طرح کی فرمایشی تحریریں شائع کروا رہے ہیں، حالانکہ مسلمانوں کے اوپر عائد ذمہ داریاں ہماری اس جدوجہد سے کہیں زیادہ ہیں۔

ان دو وجوہ کی بنا پر میں اخوان المسلمون کی سرگرمیوں کے بارے میں بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ رہی وہ باتیں جو الفتح نے میرے بارے میں لکھی ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ ابھی میں نے اپنی ذمہ داریوں کا دسواں حصہ بھی پورا کیا ہو۔

میں یہاں صراحت کے ساتھ کہتا ہوں کہ اہلِ اسماعیلیہ نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے حق کی دعوت کو بڑی وسیع الظرفی کے ساتھ قبول کیا اور اس راستے کے داعیوں کے دست و بازو بنے۔ وہ اپنے دین سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اس کے دفاع میں مرمٹنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نیکی و تقویٰ کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں۔ درحقیقت اخوان کے مقاصد کے حصول میں بھرپور معاونت کا سہرا انھی کے سر ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں جن کے علاقوں میں، ان کی بھرپور معاونت کے نتیجے میں، اخوان کے مراکز قائم ہوئے۔ اس پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ بہرحال الفتح کے ذریعے مسلمانوں کو بشارت دینے اور انھیں بیداری اور خدمت دین کے لیے اُبھارنے اور اس کے لیے نیک نیتی پر مبنی اس مکتوب کا بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ جیسے فاضل کاتب کی مساعی قبول فرمائے اور وہ قوت عطا فرمائے جس سے اسلام اور مسلمانوں کی توقعات پوری ہوں۔

والسلام

حسن البنا ۱۹ ذیقعد ۱۳۴۹ھ

٭٭٭

داعیِ اتحادِ اُمت

آیت اللہ محمد علی تسخیری ○

شہید کبیر، استاد حسن البنا نے امت کو متحد کرنے اور اس کی صلاحیتوں کو بروے کار لانے کے سلسلے میں جو اہم کردار ادا کیا، وہ خراج تحسین پیش کرنے کے لائق ہے۔

آپ کا شمار ان عظیم علماے اسلام میں ہوتا ہے جن کی تحریک اور کوشش سے مختلف مکاتب فکر کے مابین قربت و یک جہتی اور ہم آہنگی کے لیے ایک مثالی ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں چیدہ چیدہ معروف علما شامل تھے، اس عالمی ادارے میں: الاستاذ محمد علی علوبۃ پاشا، عبدالمجید سلیم شیخ الازہر، امین الحسینی مفتی فلسطین، محمد عبدالفتاح العنانی (مالکی)، الشیخ عیسیٰ منون رکن ہیئۃ کبار العلما (شافعی)، محمد شلتوت شیخ الازہر (حنفی)، محمد تقی قمی (از علما امامیہ)، عبدالوہاب خلاف، علی الخفیف شیخ الازہر، علی بن اسماعیل موید علما (زیدی)، محمد عبداللطیف سبکی (حنبلی)، استاد جامع ازہر، محمد محمد مدنی، محمد الحسین کاشف نجف کے ایک مرجع، سید ھبۃ الدین شہرستانی از علما کاظمیہ اور علامہ عبدالحسین شرف الدین جیسے جلیل القدر علما شامل تھے۔

استاد حسن البنا کا علماے کرام کو یک جا کرنے کا فیصلہ، مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں ان کی فکر و نظر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مسلم اُمّہ کی یک جہتی کا یہ پہلو اخوان المسلمون کی جماعت کے بنیادی ڈھانچے اور نظم میں شامل ہے۔ خصوصاً ان کے دستور کی دوسری شق میں، جہاں اس جماعت کے مقاصد و اہداف پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

○ سربراہ ادارہ براے یک جہتی و قربت مذاہب اسلامیہ، تہران۔ ترجمہ: محمد ظہیر الدین بھٹی

۱- مختلف اسلامی مکاتب فکر کے مابین اتحاد و یک جہتی کے لیے مناسب ماحول فراہم کرنے کے لیے تگ و دو کرنا، اس لیے کہ اسلامی اصولوں سے منحرف اور غیر مربوط رویوں نے مسلمانوں کو باہم متفرق کر دیا ہے۔

۲- عام اسلامی عقائد و قوانین کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا اور معاشرے کو عملاً جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان کی وضاحت کرنا۔

۳- اسلامی گروہوں یا قوموں کے مابین تنازعات کو حل کرنے کی کوشش کرنا اور انھیں ایک دوسرے کے قریب کرنے اور متحد رکھنے کے لیے جدوجہد کرنا۔

اگرچہ مرحوم البنا، علماے ازہر میں سے نہ تھے، تاہم وہ ایک شان دار متحرک اور مؤثر شخصیت تھے۔ ہمیں اس کا ثبوت جناب محمد تقی قمی کی اس گفتگو سے ملتا ہے جو انھوں نے جماعۃ التقریب کے بارے میں اپنی یادداشتوں میں بیان کی ہے۔ وہ جب حسن البنا کو یاد کرتے ہیں تو انھیں اپنے جسم میں ایک قسم کی حرارت، کلام میں تازگی اور زندگی کا احساس ہوتا ہے۔

ابتدا میں حسن البنا کے ازہر کے شیوخ سے کوئی قابل ذکر تعلقات نہ تھے، مگر وہ اپنے کام، منصوبہ بندی اور خلوص میں ایک کوہ گراں تھے۔ اپنی انھی صفات کی بنا پر انھوں نے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے نوجوانوں تک اپنی بات پہنچائی، جس کے نتیجے میں وہ ایک متقی، پرہیزگار، مجاہد، اسلامی تعلیم و ثقافت سے آراستہ، بیدار مغز اور روشن خیال نسل تیار کرنے میں کامیاب ہوئے۔

آپ مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور فقہوں کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کی فکر کے علَم بردار تھے۔ اُمت مسلمہ کو اس کی عظمت رفتہ اور سطوت پارینہ سے ازسرنو مربوط کرنا آپ کی زندگی کا نصب العین تھا۔ ان کے اسی جذبے کی بدولت آج اخوان المسلمون ایک منفرد اسلامی جماعت ہے جو فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک ہے۔

پروفیسر محمد علی آذرشب بتاتے ہیں کہ الشیخ البنا مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے نصب العین میں بہت دل چسپی لیتے تھے۔ الشیخ القمی بھی ہمیشہ اسی راے کا اظہار کیا کرتے تھے۔ شروع میں مذکورہ بالا عالمی ادارے کے نام کے بارے میں کافی بحث ہوئی۔ مختلف نام زیر بحث آئے بالآخر امام البنا نے 'تقریب' (قریب لانے) کا نام تجویز کیا، کیونکہ اس ادارے کے

مقاصد واہداف کے اظہار کے لیے یہی نام زیادہ موزوں تھا، اس لیے اس متقی مجاہد عالم کی تجویز پر اس جماعت اور اس کے ہیڈکوارٹر کا نام 'التقریب' ہی رکھا گیا۔

○ **البنا کا رسالہ 'تقریب' کا معمار** : یہ بیان کرنا برمحل ہے کہ جناب البنا اپنے رسائل میں ایسا مواد شائع کرنے کا اہتمام کرتے تھے جو اہلِ سنت اور اہل تشیع کو ایک دوسرے کے قریب کردے۔ وہ دارالتقریب کی آواز کو سعودی عرب تک پہنچانے میں بھی تعاون کرتے رہے۔ محمد تقی قمی کی یادداشتوں کے مطابق: ''حجاز میں سید ابوطالب یزدی کے واقعہ قتل کے بعد برسوں تک ایرانیوں کا حج کے لیے جانا موقوف رہا۔ اس کے بعد ایرانی حج پر جانے لگے تو 'دارالتقریب' نے پانچوں فقہوں (چار اہل سنت اور ایک مذہب شیعہ امامیہ) کے مناسک حج کو یک جا شائع کرنے کا ارادہ کیا، تا کہ اہلِ تشیع کے بارے میں ذہنوں میں پیدا ہونے والی تشویش کو ختم کیا جاسکے۔ اس مطبوعہ مجموعے کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا تھا کہ سنی و شیعہ دونوں اگرچہ تمام مناسک حج میں متفق نہیں، لیکن زیادہ تر مناسک میں ان کا فقہی موقف یکساں ہے۔ مناسکِ حج کے پانچوں فقہوں کے یک جا اس مطبوعہ کو، حج کے موقعے پر سعودی عرب میں تقسیم کرنے کے لیے بھیجنا ممکن نہ تھا کیونکہ میزبان حکومت کی ہدایت کے مطابق اس کی اجازت نہ تھی۔ شیخ حسن البنا نے اس کا حل ڈھونڈ لیا، انھوں نے یہ سارے مناسک اپنے پرچے میں شائع کردیے اور اپنے پرچے کو حج کے ایام میں سعودی عرب بھجوا دیا۔ یہ پرچہ حاجیوں میں تقسیم کیا گیا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اسی سال حسن البنا نے حج کیا اور انھوں نے وہاں آیت اللہ ابوالقاسم کاشانی (ایران میں تیل کو قومیانے کی تحریک کے راہ نما) سے ملاقات کی''۔

علامہ سید ہادی خسروشاہی نے مجھے بتایا کہ ایران کے بعض بڑے علما البنا مرحوم کے عملی اقدامات کو خوب سراہتے تھے، چنانچہ سید ہادی جب ۱۳۷۵ھ میں ایک بڑے عالم آیت اللہ سید رضا الصدر کی محفل میں حاضر ہوئے تو وہ حج کے عمرانی پہلوؤں پر گفتگو کے ساتھ ساتھ اور اسلامی اتحاد کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ مرحوم البنا نے اپنے حج کے سفر کے دوران مصریوں کو اہلِ تشیع کی حقیقت سے آگاہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے شیعوں کے بارے میں اہل مصر میں پائے جانے والے شکوک و شبہات ختم کرنے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس موقع پر آیت اللہ الصدر نے حاضرین کی طرف بطور خاص توجہ کرتے ہوئے زور دے کر

کہا: ''آپ لوگ شیخ حسن البنا سے ضرور واقف ہوں گے۔ وہ ایک عظیم انسان ہیں۔ وہ اخوان المسلمون کے عالمی قائد ہیں''۔

یہ تھے حسن البنا جو تشکیک، تکفیر اور تفسیق کے دور میں اپنے نظریہ وعمل میں ہم آہنگی و مطابقت پر قائم تھے، جس کے لیے بڑی جرأت وشجاعت چاہیے۔ مسلمانوں کو باہم قریب کرنے کا یہی جذبہ حسن البنا کی جماعت کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے اور اب یہ جذبہ اس جماعت کے طفیل پوری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ اس جماعت کے بنیادی اصولوں میں یہ بات داخل ہے کہ فرقہ وارانہ اور فقہی جھگڑوں سے دور رہا جائے۔ اخوان ہمیشہ اسلامی جذبے سے سرشار رہے ہیں، وہ حقیقی روح اسلام سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی جماعت کا وجود کسی ایک فقہ کے پابند حضرات تک محدود نہیں۔ وہ فروعی اختلافات سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان اختلافات سے روکتے ہیں۔

حسن البنا کے جانشین بھی انھی کے نقش قدم پر چلے اور اسی روش پر زور دیا۔ چنانچہ اخوان کے ایک مرشد عام مصطفیٰ مشہور مرحوم نے سید خسروشاہی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا: ''اخوان المسلمون، جب سے اپنے پہلے مرشد عام امام حسن البنا کے ہاتھوں قائم ہوئی ہے، فقہی، مذہبی اور دینی وفکری اختلافات کے باوجود تمام مسلمانوں کو وحدت واتحاد کی دعوت دیتی ہے، کیونکہ مسلمان اپنے دشمنوں کے سامنے ذلیل ورسوا ہوئے ہیں تو تفرقہ اور تنازعات کی وجہ سے اور نفرت وبغض تک لے جانے والے اختلافات کی وجہ سے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا اور فرماتا ہے: وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَاجَآءَ ھُمُ الْبَیِّنٰتُ وَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اخوان کی فکری بنیاد فہم دین پر دیکھتے ہیں، جسے امام حسن البنا نے اپنے ۲۰ اصولوں کے ذریعے واضح کیا۔ قانون سازی کا مصدر قرآن کریم اور سنت مطہرہ ہیں۔ شہادتین ادا کرنے والے اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنے والے کسی بھی مسلمان کو ہم اس وقت تک کافر قرار نہیں دیتے، جب تک کہ وہ کسی کفریہ عمل کا مرتکب نہ ہو۔ ہمارے یہاں امام البنا کے اس مقولے نے خوب شہرت پائی ہے، حتیٰ کہ یہ سنہری اصول کہلانے لگا ہے کہ: ''جس چیز پر ہم متفق ہیں اس پر باہم تعاون کرتے ہیں اور جس بات پر ہم میں اختلاف ہے، اس میں ہم ایک دوسرے کو اختلاف کا حق دیتے ہیں''۔ مطلب صاف واضح ہے کہ

اتفاق اصول میں اور اختلاف فروع میں ہوتا ہے۔

حسن البنا اپنے اقوال و افعال میں اس معاملے میں بہت دل چسپی لیتے تھے۔ میں نے ان کے ہم عصر بڑے علما کے ساتھ ان کی ۱۳۲۵ھ کی ایک تصویر دیکھی ہے۔ ان علما میں عبدالمجید سلیم شیخ الازہر، مفتی امین الحسینی، محمد تقی قمی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تصویر دار التقریب بین المذاہب الاسلامیہ کے ایک اجتماع میں لی گئی تھی۔ ایران اور دوسرے ممالک کے شیعوں کے ساتھ اخوان کا عملی تعاون گذشتہ صدی کے ۵۰ کے عشرے سے ہے اور ایرانی انقلاب کے بعد بھی قائم ہے۔

مسلمانوں کو اپنی صفوں میں اتحاد و یک جہتی قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ سنیوں اور زیدی شیعوں یا اثنا عشری شیعوں میں اختلافات صرف کچھ فروعات تک ہیں۔ ان میں ہر ایک اللہ کو معبودِ برحق، رسولؐ اللہ کو اللہ کا آخری رسولؐ، قرآن کریم کو قانون سازی کا پہلا اور سنت مطہرہ کو دوسرا مصدر قرار دیتا ہے۔ سب ایک قبلے کی طرف رخ کرتے ہیں۔ دین لوگوں کی خواہشات کا تابع نہیں ہے، اب وقت آچکا ہے کہ تفرق کے بھڑکتے شعلوں کو بجھا کر اس فتنے کو سرے سے مٹا دیا جائے۔ (مصطفٰی مشہور، ۲۷ رجب ۱۴۲۳ھ، قاہرہ)

مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کا یہی جذبہ عظیم داعی محمد الغزالی مرحوم، حسن الہضیبی مرحوم، عمر تلمسانی، سید قطب شہید، محمد حامد ابوالنصر، مامون الہضیبی، علامہ یوسف قرضاوی، ڈاکٹر حسن ترابی اور استاد محمد مہدی عاکف وغیرہ کی تحریروں میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اخوان المسلمون کی سب سے بڑی صفت اعتدال اور میانہ روی ہے۔ اخوان کے بارے میں استاد محمود عبدالحلیم اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: ''اخوان المسلمون کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے بغیر کسی انحراف یا افراط و تفریط کے، میانہ روی اور اعتدال کو اپنا رکھا ہے۔ کمال یہ ہے کہ انھوں نے یہ کامیابی انتہائی سخت نامساعد حالات، منہ زور خواہشات اور سخت مزاج لوگوں کی طرف سے انتہا پسندانہ افکار کے پھیلاؤ کے زمانے میں حاصل کی ہے''۔

اتحاد و یک جہتی کا یہ جذبہ ان کے لٹریچر میں بھرپور انداز سے نظر آتا ہے۔ وہ نہج البلاغة کے حوالے دیتے ہیں، جس میں حضرت علیؓ کے شان دار کلمات یک جا کیے گئے ہیں۔ مثلاً الاستاد عبدالحلیم حضرت علیؓ کے اس خط پر تبصرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں جو انھوں نے مصریوں کی گورنری

کے بارے میں مالک بن اشتر کے نام لکھا تھا۔

یہ نتیجہ ہے امام البنا کی بلند پایہ تعلیمات، شان دار راہ نمائی اور پوری اُمت کے لیے ان کی کھلی دعوت کا۔ مرحوم کو ایک طرف تو علما کے ایک طبقے اور دوسری طرف غالی صوفیوں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کا ایک سبب یہ تھا کہ آپ کی دعوت میانہ روی کی جانب بلاتی تھی۔

گذشتہ صدی کے تیسرے عشرے میں امام البنا نے اخوان المسلمون کے رسالے میں ایک مضمون لکھا، اس مضمون میں آپ نے ایک بڑے سائز کی مربع شکل بنائی۔ اس مربع کے چاروں طرف اندر: لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ لکھا اور اس مربع کے مرکز میں ایک چھوٹا سا مربع بنایا۔

اس کے بعد آپ نے لکھا کہ: ہمارے جو بھائی ہم پر تنقید کرتے ہیں وہ گویا اپنی دعوت کو اندرونی چھوٹے مربع تک محدود کیے ہوئے ہیں۔ یہ حضرات اپنی دعوت کو صرف ان لوگوں تک محدود کیے ہوئے ہیں جن کے بارے میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ان ہی کا عقیدہ صحیح ہے، حالانکہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اس کے برعکس ہم اپنی دعوت کا رخ ہر اس شخص کی طرف کرتے ہیں جو توحید الٰہی و رسالت محمدیؐ کی گواہی دیتا ہے، خواہ وہ شخص اسلام کی تعلیمات وافکار میں کتنا ہی کوتاہ و کمزور کیوں نہ ہو۔ ہم اس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اسلام کی شوکت رفتہ کو واپس لانے کے لیے اسلامی اخوت و بھائی چارے میں ہمارے ساتھ مل جائے۔ ہم اپنی اس دعوت میں اقرار شہادتین کے سوا، اس شخص پر کوئی اور شرط عائد نہیں کرتے۔ چنانچہ ہماری اس دعوت کو اسلامی تعلیمات پر ایمان و عمل کے لحاظ سے مختلف سطحوں اور درجوں کے لوگ قبول کرتے ہیں''۔

غرض یہ کہ حسن البنا اس طریق کار کو ہدایت پر چلنے اور اسلامی عمل کو معاشرے میں مکمل طور پر پھیلانے کا ایک قدرتی حل سمجھتے تھے۔ وہ اصولی وفقہی میدانوں میں پُرسکون علمی مکالمے کا دروازہ کبھی بند نہیں کرتے۔ اسی طرح وہ عقائد و تاریخ کے میدان میں بھی پُرامن مکالمے پر یقین رکھتے تھے کہ یہی ایک پسندیدہ اور معقول روش ہے، یعنی شہادتین اور ایمان و اسلام کے ارکان پر ایمان کے دائرے میں رہتے ہوئے مکالمہ۔ اللہ تعالیٰ حسن البنا پر رحم فرمائے، آپ کو بہترین جزا دے۔ ہم آپ کی پاک روح اور عظیم فکر کو سلام پیش کرتے ہیں۔

***

بیدار مغز داعی

جنرل عزیز المصری ٥

شہید حسن البنا کے ساتھ میرا پہلا تعارف، ۱۹۳۷ء میں، لندن سے واپسی پر ہوا۔ میں اس وقت ولی عہد کے ساتھ تھا۔ تین حضرات میرے انتظار میں تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ اخوان المسلمون کے لوگ ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہتا، چونکہ میں سمجھتا تھا کہ اخوان المسلمون تجدید و انقلاب کی فکر کی نمایندہ ہے۔ اگرچہ وہ جیکٹ اور پتلون میں ملبوس تھے، تاہم ان کے لباس انتہائی سادہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے ہاتھ میں تسبیح کے بجائے کتاب اٹھا رکھی تھی اور وہ میرے ساتھ اسی کتاب کے مندرجات پر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ان لوگوں کو دیکھا ضرور مگر ملاقات سے صاف انکار کر دیا۔

میرے تعجب کی اس وقت انتہا نہ رہی جب اگلے روز، تینوں میں سے ایک صاحب پھر

---

٥ مصر کی نمایاں عسکری شخصیت' خلافت عثمانیہ کے سقوط سے قبل آپ ترک فوج میں افسر تھے۔ آپ نے بلقان کے محاذ پر ترک فوج کے ساتھ مل کر جنگ لڑی۔ پہلی عالمی جنگ میں مصری اور ترکی افواج کے کمانڈر تھے۔ ۱۹۳۹ء میں مصری فوج کے چیف آف دی سٹاف کے عہدے پر پہنچے۔ آپ برطانوی قبضے کے مخالف تھے۔ دوسری عالمی جنگ میں آپ نے مصر سے باہر فرار ہو جانے کا ارادہ کیا، تاکہ جرمنوں کی صفوں میں شامل ہو کر، انگریزوں کے خلاف لڑیں اور اس طرح مصر کو برطانوی قبضے سے نجات دلائیں، مگر آپ کے فرار کی یہ کوشش اس لیے ناکام ہوگئی کہ جس جہاز کے ذریعے آپ فرار ہونا چاہتے تھے وہ گر کر تباہ ہو گیا۔ آپ کے ساتھ لیفٹیننٹ جنرل عبدالمنعم، عبدالرئیس اور حسین ذوالفقار صبری بھی فرار ہونے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ آپ مصری فوج کے اندر قومی تحریک کے اعلیٰ رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ ترجمہ: محمد ظہیر الدین بھٹی

میرے پاس تشریف لائے اور تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں حسن البنا ہوں۔ وہ میرے کل کے رویے سے واقف تھے، مگر انھیں اس توہین پر کوئی ملال نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان جس پس ماندگی کا شکار ہیں، اسی نے انھیں یہ دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم سب مل کر مسلمانوں کو ایک بار پھر صحیح اور درست فکر کی جانب لے جائیں۔ ایک ایسی فکر جس کے ذریعے مسلمان علم و سائنس میں بھی پیش رفت کریں اور انسانیت کی ترقی و ہدایت کے لیے مشعل راہ کا کام بھی کریں۔

اس پہلی ملاقات ہی میں حسن البنا کی شخصیت کی عظمت نکھر کر سامنے آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ آپ انانیت سے یکسر پاک، ایک ہوش منداور بیدار مغز داعی ہیں۔ آپ خود چل کر میرے پاس تشریف لائے، حالانکہ مجھے، اپنے سخت رویے اور بدسلوکی کی وجہ سے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ میں دوبارہ کبھی ان سے مل سکوں گا۔

اس ملاقات کے بعد سے ان کے اور میرے درمیان رابطہ و تعلق مضبوط تر ہوتا گیا۔ ہم وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ مجھے ان کے چہرے پر ایمان، سچائی اور اخلاص کی علامات واضح نظر آتی تھیں، جنھیں دیکھ کر ان پر میرے اعتماد و یقین میں مزید اضافہ ہوجاتا تھا۔

جب انھیں شہید کیا گیا تو میں اس وقت غیر ملکیوں کے لیے قائم جیل کے دورے پر تھا۔ ایک افسر میرے پاس آیا، اس کے چہرے پر غم واندوہ کی پرچھائیاں گہری ہوچکی تھیں۔ سرکاری احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے مجھے یہ غم ناک خبر سنائی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس عظیم انسان کی رحلت سے میرے سینے میں خنجر پیوست ہو گیا ہو۔ (مجلہ الدعوۃ، قاہرہ، ۱۳ فروری ۱۹۵۱ء)

✲✲✲

ہمیشہ یاد رہنے والی باتیں

سعدالدین الولیلی ٥

٥ ہر وقت تیار رہو: امام شہید اکثر اوقات موت اور اس سے متعلق باتیں کرتے رہتے تھے۔ کسی بھائی یا دوست کی تعزیت کے وقت ضرور ان کا دل بھر آتا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے۔ ایک مرتبہ ہم نے حرم نبیؐ میں نمازِ عصر ادا کی۔ امام شہید باب جبرئیل سے باہر کی طرف نکلے ہی تھے کہ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ آپ کے ہمراہ دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے مسلمان حجاج کرام اور کارکنوں کا ایک جم غفیر تھا۔ ہم امیر المومنین عمر بن خطابؓ کے گھر سے گزرے پھر حضرت عثمانؓ کے گھر سے گزرے جہاں محاصرے میں انھیں قرآن مجید کی تلاوت کے دوران شہید کر دیا گیا تھا۔ جب ہم جنت البقیع میں اصحابِ قبر کے لیے مسنون دعائیں پڑھتے ہوئے ایک نمایاں مقام پر پہنچے، تو امام شہید نے کہا: یہاں سرکار دو عالمؐ کھڑے ہو کر اہل بقیع کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے، ہمیں بھی اسی جگہ کھڑے ہو کر دعا کرنی چاہیے۔

ابھی سورج پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا۔ مغرب کی اذان کا وقت قریب تھا کہ امام شہید پورے خشوع و خضوع کے ساتھ خاموش کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے، پھر اچانک کعبۃ اللہ کی طرف رخ کر کے دائیں ہاتھ کے سہارے زمین پر بیٹھ گئے۔ مجھے یوں لگا کہ ابھی ان کی روح پرواز کر جائے گی۔ میں ان کی یہ حالت دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا اور عجب پریشانی میں

---

٥ استاد سعدالدین الولیلی امام حسن البنا شہید کے معاون خصوصی رہے ہیں۔ مختلف مجلات میں کام کیا اور کئی ایک رسائل کے مدیر رہے ہیں۔ ترجمہ: محمد کاشف شیخ

مبتلا ہوگیا۔ میری ہمت جواب دے گئی، زبان گنگ ہوگئی، نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس عالم میں، میں اپنے آنسو روکتے ہوئے ان پر جھکا اور میں نے کہا: ''اللہ آپ پر رحم کرے، ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ اللہ نہ کرے کہ ہم آپ کے بارے میں کوئی بُری خبر سنیں''۔ یہ سن کر امام البنا نے کہا: ''میرے بھائی، کیوں نادانی کی بات کر رہے ہو! کیا تم بھی ایک دن اسی مقام پر نہیں لائے جاؤ گے؟ یہی تو ہمارا آخری مقام ہے، اس لیے لمبی جدائی اور فوری رخصتی کے لیے ہر وقت تیار رہو''۔

پھر امام البنا حرم میں نماز مغرب ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند دن بعد ہماری حج سے واپسی ہوگئی۔ تب وہ منحوس گھڑی آگئی جب امام ربانی کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا اور انھوں نے دنیا کے قید خانے سے ہمیشہ کے لیے نجات پاتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔

○ **یہی میرا کھانا ہے:** ایک مرتبہ ڈاکٹر محمد خمیس حمیدہ نے مجھ سے پوچھا: ''سعد! کیا تمھیں مرشد کے ساتھ گزارا ہوا بہترین دن معلوم ہے''؟ میں نے کہا: ''وہ کون سا دن ہوگا۔ حالانکہ مرشد کا تو ہر دن گذشتہ دن سے زیادہ ہی بہتر ہوتا ہے''۔ پھر انھوں نے بتایا: ''ایک روز ہم پانچ سے زائد افراد مرکزی دفتر میں طویل شب بیداری کے بعد مرشد کے گھر چلے گئے۔ ہم نے ان سے بلاتکلف رات کا کھانا مانگا۔ وہ زنان خانے میں گئے اور خوشی خوشی واپس آگئے۔ ان کے ہاتھ میں گھر کے کھانے سے بچی ہوئی کچھ چپاتیاں، کچھ زیتون، پرانے پنیر کے ٹکڑے اور تھوڑا سا نمک تھا۔ انھوں نے ہمارے آگے رکھتے ہوئے کہا: یہی تناول کیجیے۔ میرا رات کا کھانا یہی ہے۔ اچھا کھانا وہ ہے جس کو کھانے والے ہاتھ زیادہ ہوں۔ ہم نے اللہ کا نام لے کر خوب سیر ہوکر کھایا اور اللہ کا شکر ادا کیا''۔ میں نے کہا: ''آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے، بخدا ان کا کھانا اس سے ذرا بھی مختلف نہیں تھا۔ جو کھانا بھی ان کے آگے رکھ دیا جاتا تھا یا پیش کیا جاتا، ہنسی خوشی کھا لیتے تھے''۔

○ **سادگی:** جنگ کے دنوں میں ہم بذریعہ جہاز شام میں اورین پلس ہوٹل پر پہنچے جو سمیرامیس، مینا ہاؤس، سیسل وغیرہ کے سیاحتی مقامات میں ہے۔ یہاں مسئلہ فلسطین کے حوالے سے عربک یونی ورسٹی میں عالم عرب کے مختلف قائدین کا مشاورتی اجلاس منعقد ہونا تھا۔ یہاں ہر جگہ مختلف ذمہ داران سے آمنا سامنا رہتا، اور اکثر تلخ حقائق سننے پڑتے۔ اس کے باوجود شیخ آزاد قوموں کے تقاضوں کی وضاحت ضرور کرتے تھے۔ ہم رفقا کو یہاں اخوان کے مرشدعام کے

اعزاز واکرام کی فکر دامن گیر رہتی تھی کہ انھیں پورے اعزاز واکرام سے نوازا جائے اور ان کے ساتھ خصوصی طور پر عزت ووقار کے ساتھ پیش آیا جائے۔ اس لیے بھی انھوں نے اورین پلس میں مرشد کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے میں کوئی کسر چھوڑ نہ رکھی تھی۔ مرشد یہاں موجود حکومتی عہدے داران میں سے کسی طرح کم حیثیت نہ تھے، اگرچہ دوسرے لوگ اپنی حکومتوں اور سرکاری خزانوں کو بے دریغ لٹا رہے تھے اور پیسے کو مال غنیمت جان کر بے دریغ خرچ کر رہے تھے۔ لیکن اخوان اپنے قائد پر جان چھڑکتے تھے اور ان کی تابع داری میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے تھے۔

آدھی رات گزرنے کے بعد عمر بہاء الامیری (شامی وزیر مملکت، بعد ازاں پاکستان میں شام کے سفیر) نے ہمیں آرام کی دعوت دی۔ مرشد کا رعب اتنا تھا کہ جب وہ اورین پلس کے دروازے پر کھڑے تھے، انھوں نے وہیں سے عمر امیری کو زور سے آواز دے کر بلایا اور ان سے کہا: ”بھائی، ہم رات ایسی خوش نما جگہ پر نرم و گداز بستر پر گزاریں اور خوب لذیذ کھانے کھائیں اور ہمارے مجاہد بھائی فلسطین کے مہاجر کیمپوں میں کس مپرسی کے عالم میں ہوں۔ ہم یہاں شام میں مزے اڑائیں اور ہمارے بھائی کھلے آسمان تلے پڑے ہوں۔ واللہ! اپنے کسی بھائی کے گھر، چٹائی پر ہاتھ کا تکیہ بنا کر اور اپنی عبا اوڑھ کر سونا، مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ پسند ہے“۔

○ **جذبۂ اخوت**: میرا ایک قریبی عزیز بیمار پڑ گیا۔ بہت سے ڈاکٹروں نے اس کا چیک اَپ کیا لیکن مرض کی تشخیص نہ ہو سکی۔ میں نے ایک اخوانی ساتھی ڈاکٹر محمد سلیمان سے اس کا تذکرہ کیا، وہ فوراً ان کے ہاں پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں مریض کو شفایاب کر دیا۔ مرشد بھی مبارک باد دینے کے لیے ان کے ہاں گئے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے صحت و عافیت کی دعا کی۔ گفتگو کے دوران انھیں پتا چلا کہ یہ تمام مساعی ڈاکٹر سلیمان کی ہیں تو انھوں نے مجھے خفگی سے دیکھا۔ گویا وہ مجھے علیحدگی میں تنبیہ کرنا چاہتے تھے۔ وہاں سے اُٹھ کر آئے تو انھوں نے مجھ سے کہا: ”سعد! تم نے مجھے ڈاکٹر سلیمان کے علاج کا بتایا نہیں......؟ کیا یہ مناسب نہ تھا کہ میں اپنے اس بھائی کا شکریہ ادا کرتا؟ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے تم سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی اور میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ میں تم سے کوئی چیز نہیں چھپاؤں گا، تمھیں بھی اسی طرح مجھ سے کوئی چیز نہ چھپانے کا وعدہ کرنا چاہیے“۔ میں نے حیرانی سے سوال کیا: ”کیا اس طرح کے

چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہاں، اس طرح کے معاملات میں بھی''۔ یہ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں ہے اللہ کی خاطر بھائی چارے اور خیر خواہی کو ترویج دینا اور اس کی حوصلہ افزائی کرنا ہے، جس جماعت میں بھی یہ عام ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کی خوش نودی ضرور حاصل کر لے گی''۔

○ **ہم نہیں بدلتے**: ہم ایک دعوتی مشن پر مصر کے مغربی اضلاع میں ان کے ہمراہ تھے۔ اگلے دن ظہر کے وقت ہم نے ایک بادبانی کشتی لی، تاکہ دریاے نیل پار کر کے محمودیہ جاسکیں۔ سورج آگ برسا رہا تھا' سخت جھلسا دینے والی گرمی اور نہایت حبس والا موسم تھا۔ ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی۔ ملاح اپنا پورا زور لگا رہا تھا پھر بھی کشتی نہایت آہستگی سے چل رہی تھی، کشتی کے بادبانوں کی وجہ سے کچھ دیر آگے کی طرف اور کچھ دیر کے لیے پیچھے کی طرف سایہ ہو جاتا تھا۔ سخت پریشانی کے عالم میں ہم آسمان سے برستی آگ سے بچنے کے لیے جدھر سایہ ہوتا اس کی طرف لپکتے۔ دوسری طرف ہمیں مرشد کی فکر لاحق تھی جو اپنی جگہ بیٹھے خاموشی سے ہمیں ایسا کرتا دیکھ رہے تھے۔ ہم نے کشتی میں کوئی جگہ ایسی نہ چھوڑی جہاں جا کر نہ بیٹھے ہوں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد بالآخر سایہ اس جگہ آ کر رک گیا جہاں مرشد بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہمیں یہ کہتے ہوئے اس جگہ بلا لیا، اور ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی: ''آپ ہی ہماری طرف آجائیں ہم جگہ نہیں بدلتے''۔

○ **مددگار**: ہم مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وفد میں خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ قافلہ روانہ ہوا' سامان کی گاڑیاں آگے آگے تھیں۔ اس کے بعد خواتین کی بسیں تھیں اور ان کے ساتھ اخوان کے مرد حجاج کی گاڑیاں تھیں اور ان سب کے بالکل آخر میں ہماری چھوٹی گاڑی تھی۔ ہمارے ساتھ مرشد کی والدہ محترمہ اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن البنا بھی تھے۔ اتنے میں رات ہوگئی۔ سخت اندھیرا ہو گیا جس نے ہر طرف سے صحرا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اچانک ہماری چھوٹی گاڑی ریت کے ایک ٹیلے میں دھنس گئی۔ ڈرائیور کی کوشش تھی کہ کسی طرح گاڑی نکل جائے اور قافلے کے ساتھ سفر جاری رہے۔ لیکن ہم سمجھ گئے کہ گاڑی کو نکالنے کے لیے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ مرشد کی والدہ کو گھبراہٹ شروع ہوگئی۔ یہ ان کی عمر کا تقاضا تھا، وہ ہماری مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ بھائی عبدالرحمٰن کو بھی تکلیف شروع ہوگئی۔ اپنی بغل میں زخم کی وجہ سے وہ اس

مشکل کام میں شریک ہونے سے قاصر تھے اور ڈرائیور کے لیے اسٹیرنگ چھوڑنا ممکن نہیں تھا۔ اب رہ گئے مرشد اور میں۔ تب میں نے دیکھا کہ مرشد پورے حوصلے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے۔ وہ زبان سے پرجوش کلمات ادا کرتے جاتے تھے۔ میں نے بھی مرشد کی طرح جبہ اتار دیا اور سر پر رومال رکھ لیا۔ وہ گاڑی سے اتر چکے تھے میں بھی گھوم کر گاڑی کی پچھلی طرف آ گیا۔ میں ان کی بات غور سے سن رہا تھا، وہ کہہ رہے تھے: ''ہمیں پہلے تو ٹائروں کے آگے سے ریت ہٹانی پڑے گی، پھر ہم کچھ پتھر لاکر ٹائروں کے آگے رکھ دیں گے۔ ڈرائیور گاڑی گھمائے گا اور ہم پوری قوت سے آگے دھکا دیں گے''۔ مرشد کے ہاتھ مجھ سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ جب کام پورا ہوگیا تو انھوں نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے زور سے آواز لگائی: ''سالم! گاڑی گھماؤ''۔ سالم نے گاڑی گھمائی، امام البنا نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں اور آپ، دونوں گاڑی کو آگے دھکا دیں گے''۔ ہم نے دھکا دیا اور گاڑی چل پڑی۔ یہ کہتے ہوئے میری نگاہوں میں وہ پورا منظر گھوم رہا ہے، جب دھکا لگاتے وقت مرشد کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے اور صحرا کی ریت سے ان کا چہرہ اَٹا ہوا تھا۔ گاڑی کی روشنی میں ان کی یہ حالت دیکھ کر میرے سامنے ان کی عظمت اور بھی زیادہ نکھر کر سامنے آ گئی۔

○ **پیارا بھائی:** ایک دن میرے دل میں یہ خیال ابھرا کہ میں مرشد کو اپنی ایک یادگار تصویر پیش کروں، جو میں نے ایک خاص موقع پر کھینچی تھی، جب ۱۹۴۶ء میں عید میلاد النبیؐ کے موقع پر مجھے بلاوجہ گرفتار کیا گیا تھا۔ بعد میں جب مقامی جیل سے میری رہائی عمل میں آئی، اس وقت کھینچی ہوئی اس تصویر کے پیچھے تعارفی کلمات لکھے تھے: ''جری قائد کی طرف ___ بہترین مرشد کی طرف ___ پیارے بھائی کی طرف ___'' میں نے یہ تصویر پیش کی جسے انھوں نے قبول کیا۔ مرشد نے تصویر کی پشت پر لکھے کلمات پڑھے ہی تھے کہ انھوں نے اپنا سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ چہرہ جذبات سے چمک رہا تھا۔ خوشی اور عاجزی کی ملی جلی کیفیت میں انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: ''میرے عزیز، مجھے پیارا بھائی کہہ دینا ہی کافی تھا''۔ (مجلة الدعوة، ۱۳ر فروری ۱۹۵۱ء)

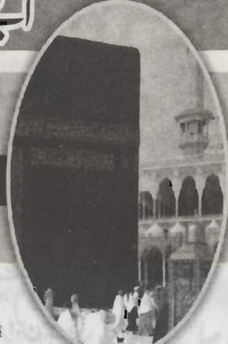
***


SINCE 1979
سنڈِپ
قدرتاً بہتر
SUNDiP
Halal
TOMATO
Ketchup
550g
Net Weight
SUNDiP
MIXED
Pickle in O
SUNDiP
SUNDiP
Apple Jam
نورس
کیچپ، اچار، جام،
نورس اور بہت کچھ...
Naurus (Pvt.) Limited C-1/B, S.I.T.E., Karachi- 75700 - PAKISTAN

چلے ہیں قافلے سفرِ حجاز کو

آیئے عمرہ کی سعادت حاصل کریں





پاک وسعودی حکومت کے مطابق

معتمرین عمرہ کی ریکارڈ تعداد کو خدمات مہیا کرنے والا ادارہ

الھدیٰ ٹریولز اینڈ ٹورز پرائیویٹ لیمیٹڈ

ویزہ ٹکٹ حرم کے قریب رہایش

لگژری ٹرانسپورٹ زیارات

اللہ کے گھر اللہ کے مہمانوں کو پہنچانے اور مناسک کی ادائیگی میں

خدمت کا بہترین نیٹ ورک ایک منظم پُرجوش تجربہ کار ٹیم کے ساتھ

الھدیٰ

ٹریول اینڈ ٹورز

چیف ایگزیکٹیو
شاھد محمود انور

شارع المسیال مکہ مکرمہ۔سعودی عرب
Mob:00966-502508726,506610013,
Tel: 00966-5728166,5738665
00966-5428937,5482305

Holly Makkah
Sharah Al-Misyal Makkah, Saudi Arab
E-mail: smaqh@hotmail.com

کراچی
G-24 صائمہ ٹریڈ سینٹر آئی آئی چندریگر روڈ کراچی
Tel:021-2211175.2620995-6
Mob: 0300-2437630

اسلام آباد
آفس نمبر 8 مشتاق مینشن، نزد طباق ہوٹل، بلیو ایریا، اسلام آباد
Tel: 051-2870693-4
Mob: 0333-5130925

لاہور
آفس نمبر 3، فرسٹ فلور، دیوا آرکیڈ شملہ پہاڑی ڈیوس روڈ لاہور
Tel: 042-6300833,6300834
Mob: 0300-4230025

سیالکوٹ
آفس نمبر 20، کشمیر سینٹر، کچہری روڈ، سیالکوٹ
Tel: 052-4298275
Mob: 0301-6118067



اخوان، تربیت کا ایک زاویہ

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم ○

دورِ آدم علیہ السلام ہو کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ، بنی اسرائیل کا سلسلۂ نبوت ہو یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تا قیامت زمانہ، اللہ تعالیٰ نے ازل سے ابد تک فلاح و خسران کا ایک ہی پیمانہ متعین کیا ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانے کو ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ خود شمع اسلام کے پروانے حرص و ہوس کی آگ بھڑکانے لگے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ یہ چراغ کبھی گل نہ ہوگا۔ انبیا کی بعثت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد وہ رحمٰن و رحیم ذات اپنے برگزیدہ بندوں کو شمع ہدایت دے کر انسانوں کو بھٹکنے سے بچاتی رہے گی۔

۱۲ویں صدی ہجری میں جب عالم اسلام کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی اور تاریخ جاہلیت کا سبق دہرا رہی تھی۔ رب رحیم نے ہندستان میں سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید کو شجر اسلام کی آب یاری کے لیے چنا، ان کا خون بالاکوٹ کی سرزمین کو سیراب کر رہا تھا تو ادھر شیخ محمد بن عبدالوہاب بن سلمان سرزمین عرب کو اندھیاروں سے نکالنے میں مصروف تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا اور اللہ تعالیٰ نے ہر دور کے ارتقا کے ساتھ اور نئی جہت کے ساتھ اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے شمع رسالتؐ کے پروانوں کا انتظام فرمایا۔

یہ مغربی کفر و استبداد کا زمانہ تھا جب اللہ تعالیٰ نے 'ملا کی اذاں' اور 'مجاہد کی اذاں' کو واضح کرنے کے لیے برعظیم میں علامہ اقبال اور سید مودودی جیسے مفکر اسلام کی آواز کو شرق و غرب میں

○ شارجہ

پہنچایا اور مصر میں حسن البنا کی آواز 'مجاہد کی اذاں' قرار پائی۔ حسن البنا نے صرف بیس سال کے عرصے میں ایسا ذہنی وفکری انقلاب برپا کردیا کہ اس کی مثال خال خال ملتی ہے۔ اس فقیر منش انسان کو عاجزی وانکساری بے حد پسند تھی۔ ان کا ایک پسندیدہ شعر تھا ؎

ما لذة العيش الا صحبة الفقراء

هم السلاطين و السادات والامراء

(زندگی کا لطف اللہ والوں کی صحبت ہی میں ہے، دراصل وہی ہمارے سلطان، سردار اور رہنما ہیں۔)

مفتیِ اعظم فلسطین محمد امین الحسینی بیان کرتے ہیں: ''جب میں ۱۹۴۶ء میں یورپ سے مصر واپس لوٹا' تو میں نے پہلی مرتبہ حسن البنا کو بچشم سر دیکھا۔ میں نے متعدد مرتبہ ان کی گفتگو سنی۔ مجھے ان کے اندر صاف و شفاف روح نظر آئی۔ جوں جوں ہمارے تعلقات مستحکم ہوتے گئے مجھ پر انکشاف ہوتا گیا کہ اس عظیم انسان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی نادر خوبیوں، اعلیٰ خصائل اور کریمانہ صفات سے نواز رکھا ہے۔ گہرا اخلاص، عقل سلیم، عزم قوی، بلند ہمتی، ایثار کیشی، ثابت قدمی، مادی زندگی سے گریز، دنیاوی مال ومنال سے بے نیازی ان کی نمایاں صفات تھیں۔ سادگی ان کا طرۂ امتیاز تھا اور قناعت ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ یہی وہ اوصاف تھے جن کی بنا پر وہ قیادت کے منصب پہ سرخ رو ہوئے اور زندگی کی امانت اپنے رب کے حضور شہادت کے ساتھ واپس کی''۔

حسن البنا شہید کی زندگی مختصر تھی لیکن ان کی تعلیمات پُر اثر اور جدوجہد باثمر ہے۔ سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت کا فلسفہ انھوں نے سچ کردکھایا۔ حسن البنا شہید کے وہ انقلاب انگیز الفاظ جو آج بھی اخوان کے پروگراموں میں نعروں کی شکل میں گونجتے ہیں دلوں کے لیے نشاط انگیز اور میدان عمل کے لیے کسی حربی ترانے سے کم نہیں: ''اللہ ہمارا مقصود ہے رسولؐ اللہ ہمارے قائد ہیں۔ قرآن ہمارا دستور ہے۔ جہاد ہمارا راستہ ہے اور شہادت ہماری اعلیٰ ترین آرزو ہے۔ یہ الفاظ محض نعرہ ہی نہیں، بلکہ حسن البنا نے اپنے جسم کے روئیں روئیں میں اور زندگی کے ہر سانس میں ان کو اُتار لیا تھا۔ ہر لفظ کو ایک عہد و پیمان سمجھ کر اپنی روح میں اُتارا اور اسی جذبے اور تابانی روح کو اپنے ساتھیوں کے دلوں میں منتقل کیا اور ان کے ظاہر و باطن کو اُجلا کردیا۔

حسن البنا شہید نے جس دور میں اسلامی انقلاب کا علَم اٹھایا اس وقت شرکیہ عقاید، علم نجومِ

واوہام پرستی، فرقہ بندی، فقہی مسائل میں ائمہ دین کا آپس میں ٹکراؤ اور متشابہات کی من مانی تاویلات کا غلبہ تھا۔ ایک دین کے پیروکار ہوتے ہوئے بھی لوگ گروہ بندی، تعصب، بغض وعناد میں مبتلا تھے۔ حسن البنا شہید کے فہم وتدبر اور کردار کی پختگی واستقامت نے عوام الناس خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صحیح العقیدہ فہم عطا کیا۔

حسن البنا نے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کا حقیقی تصور اجاگر کیا۔ لوگوں نے یہ جان لیا کہ اسلام ہی مکمل ضابطہ حیات ہے، اور یہ سلطنت، وطن، حکومت، رعایا، ضابطۂ اخلاق، طاقت، رحم، عدل، ثقافت، قانون، علوم معاش میں فیصلہ کن طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام دعوت بھی ہے اور جہاد بھی۔ اسلام ہی جوش بھی ہے ہوش بھی۔ عقیدت ومحبت کا منبع وسرچشمہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ ہیں۔ حسن البنا شہید کی دوررس نگاہ نے تزکیہ نفس کے مروجہ خانقاہی طریقوں کے بارے میں لوگوں کا ذہن صاف کیا۔ دلیل کی روشنی میں حقیقت تک پہنچنے کی راہ سجھائی۔ حسن البنا شہید نے اپنے ممبران کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ نیک لوگوں سے تعلقات بنائیں۔ نیک صحبت اختیار کریں۔ حکمت مومن کی گم شدہ میراث ہے اس کی تلاش میں اور اس کے حصول میں کوشاں رہیں۔

ان کی تعلیمات میں 'فہم' پہلا تربیتی نکتہ تھا جس کو انھوں نے ایک عہد و پیمان کی طرح لوگوں کی روح وعمل میں اتار دیا، اور ساتھ ہی 'اخلاص' کا وہ رنگ قلب وذہن میں پختہ کردیا کہ ان صلوٰتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین حرز جان بن جائے۔ فہم واخلاص کا لازمی نتیجہ 'عمل' ہے اور عمل سے مراد ایسا عمل ہے کہ جو فہم اور اخلاص کا پھل ہو۔ اس پھل کو حاصل کرنے کے لیے کچھ منازل طے کرنا پڑتی ہیں۔ ان منازل کو طے کرانے کے لیے حسن البنا شہید نے خصوصی تربیتی کورس کروائے۔ سب سے پہلے مرحلے میں مضبوط جسم کے لیے صحت کا خیال رکھنا، اس کے لیے ورزش، محنت، مشقت، خواہشات نفس پہ کنٹرول کی تربیت، نفس کے خلاف جہاد اور اس سلسلے میں اپنا کڑا محاسبہ اور امتحان لیتے رہنا شامل ہے۔

دوسرا مرحلہ: قوا انفسکم و اھلیکم ناراً کی عملی تفسیر بننا۔ گھر کے ہر فرد، حتیٰ کہ خادموں کی تربیت اور حقوق کا دینی شعور پیدا کرنا۔

تیسرا مرحلہ: معاشرے کی اصلاح، راے عامہ کو اسلامی فکر کے لیے ہموار کرنا۔

چوتھا مرحلہ: اپنے وطن کو غیر اسلامی حکومت سے آزاد کرانے کی جدوجہد کرنا۔

پانچواں مرحلہ: حکومت کی اصلاح، تاکہ وہ صحیح اسلامی حکومت بن سکے اور حکومت کو صحیح اسلامی خطوط پہ استوار رکھنے کے لیے اس کی رہنمائی کرنا۔

چھٹا مرحلہ: امت مسلمہ کے حاکمانہ وجود کا احیا کرنا۔ اس کے لیے امت مسلمہ کی شیرازہ بندی کرنا --- اور امت مسلمہ کی مایوسی، پژمردگی، غلامانہ ذہنیت کو ختم کرنے کی جدوجہد کرنا۔

عمل کے اس پھل کا لازمی نتیجہ 'جہاد' ہے۔ کفر کو دل سے ناپسند کرنا جہاد کا ابتدائی درجہ ہے اور اللہ کی راہ میں جنگ لڑنا اس کا انتہائی درجہ ہے۔ دعوت اسلام، جہاد کے ذریعے ہی زندہ ہوسکتی ہے اور یہ جہاد: وجاھدوا فی اللّٰہ حق جھادہ سے ہی مکمل ہوسکتا ہے۔ حسن البنا شہید نے اسی لیے الجھاد سبیلنا کا نعرہ لگایا۔

جہاد کا لازمی تقاضا قربانی ہے۔ قربانی کا لازمی حصہ 'اطاعت' ہے۔ تنگی، ترشی، خوشی، غمی ہر حال میں حکم مانا جائے کہ سمعنا واطعنا کی تصویر بن جائے۔ 'اطاعت کاملہ' کا عہد کرنے والے لوگوں کو جہاد کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے چن لینا، منظم کرنا، دعوت کے نظام کے مطابق چلانا --- روحانیت کے اعتبار سے یہ ایک مجاہدانہ ٹیم ہوتی ہے۔ جو کسی فکر اور دل کی تنگی کے بغیر حکم سنے اور اطاعت کرے۔ اس ٹیم میں وہی لوگ شامل ہوسکتے ہیں جو تربیتی مراحل سے گزر کر جدوجہد کی قبا پہننے کے لیے پوری استعداد فراہم کرلیں۔

یہ ایک امتحان اور آزمایش ہے۔ اخوان المسلمون کے بانی ارکان نے ۵ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ کو اس امتحان اور آزمایش کے لیے عہد و پیمان کیا اور بعد کے حالات و واقعات نے ثابت کر دکھایا کہ اخوان المسلمون کے تاسیسی دستے میں کتنی استقامت اور ثابت قدمی تھی۔ اس امتحان و آزمایش کی بنیادی شرط استقامت یا ثابت قدمی ہے۔ ''ایمان دار لوگوں نے اپنا عہد سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کچھ لوگ اپنی منزل کو پہنچ گئے اور باقی انتظار میں ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے مقصد میں ذرہ برابر کوئی تبدیلی نہیں کی''۔ اسی استقامت اور ثابت قدمی کو پالینا ممکن ہی نہیں جب تک اللہ کے رنگ میں خود کو نہ رنگ لیا جائے۔ اس رنگ کو سامنے رکھ کر دعوت و جہاد کا کام ہوسکتا ہے۔ اس لحاظ سے اخوان المسلمون نے لوگوں کو چھے قسموں میں تقسیم کیا:

۱-مجاہد مسلمان ۲-بے دست و پا ہو کر بیٹھ رہنے والے مسلمان ۳-گناہ گار مسلمان ۴-ذمی ۵-معاہد غیر جانب دار ۶-محارب۔

اسلام کی عدالت میں ان سب لوگوں کے لیے الگ الگ حکم ہے۔ جس پہ جس قسم کا رنگ ہے اس کی روشنی میں اس سے معاملات رکھے جائیں۔ اسلام نے لوگوں کی اس تقسیم کے باوجود اخوت کا رشتہ برقرار رکھا ہے۔ اخوت دو طرح کی ہے: ایک انسانی اخوت اور دوسری عقیدے کی اخوت۔ حسن البنا شہید نے عقیدے کی اخوت کی بنیاد اس آیت کو بنایا: ومن یوق شح نفسه فاؤلئك هم المفلحون ''جو لوگ ذاتی مفادات کی خواہش سے بچا لیے گئے وہی کامیاب ہیں'' اور: والمومنون و المومنات بعضهم اولیآء بعض، ''مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں''۔

اخوت کی ترویج کا لازمی تقاضا باہمی اعتماد ہے۔ امرا و مامورین کو ایک دوسرے کی قابلیت، قائدانہ صلاحیت، خلوص پہ مکمل اعتماد ہو۔ اعتماد قائم کرنے اور حاصل کرنے کے لیے باہمی تعارف، تعلّق، دلی وابستگی کے لیے بھرپور کوشش کی جائے۔ حسن البنا شہید نے اخوت کے معانی کو معمول کے ایسے اچھے کاموں کے ذریعے حقیقت کا رنگ دیا جو کتابوں میں لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ اخوت کے تعلّق کو بڑھانے والی اور دلوں میں محبّت اور صلہ رحمی کے شعور میں اضافہ کرنے والی عادات خود بخود آتی ہیں۔ اسی مناسبت سے اسلام ایک مثالی خاندان کا نقشہ سامنے لاتا ہے کہ جہاں ہر مومن چاہے وہ کرہ ارضی کے کسی مقام پہ رہتا ہو ایک خاندان کا فرد ہے اور وہ مسلم خاندان ہے۔ جس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جسم سے تشبیہ دی ہے۔ اسی مثالی خاندان کا ایک عمل اخوان المسلمون کے ہاں 'اسرہ' کے نام سے رائج ہے۔ مثالی اجتماعیت کو سامنے لانے کے لیے اسرہ کی اصطلاح ۱۹۲۸ء میں استعمال کی گئی، جس کے لیے ۷۰ افراد کو منتخب کیا گیا۔

اس کے ایجنڈے میں یہ نکات شامل تھے:

۱-تلاوت و تجوید کی درستی ۲-خاص سورتوں اور آیات کا حفظ کرنا اور تفسیر جاننا ۳-خاص احادیث کو حفظ کرنا اور تشریح ۴-ایمان، عبادات، معاملات اور عام اخلاقی اصولوں کی تحریری رپورٹ بنانا ۵-اسلامی تاریخ کا مطالعہ اور اسلاف کی زندگیوں کا جائزہ ۶-سیرت کا مطالعہ،

خاص طور پر اس کے روحانی اور عملی پہلو، عملی زندگی میں نافذ کر کے محاسبہ کرنا۔

مرد و خواتین کے علیحدہ علیحدہ 'اسرہ جات' بنائے گئے۔ مردوں کے گروپ کا ایک مربی جو ان کے لیے استاد کا درجہ رکھتا ہے اور کچھ خاص وقت یا دنوں کے لیے ان کی تربیت کرتا ہے۔ اس طرح خواتین کی تربیت کا انتظام ہے۔ اسرہ جات کے پروگرام میں چند لازمی سرگرمیاں شامل ہوتی ہیں۔۔ مثلاً بیماروں کی عیادت، غیر حاضر ممبران کی مزاج پرسی وغیرہ۔ کھانا کھانا، صفائی ستھرائی، تک سب کام شرکا خود ہی انجام دیتے ہیں۔ اسرہ کے ممبران کی عملی تربیت کی جاتی ہے: ○ پروگرام کو منظم کرنے کی تربیت ○ تقریر لکھنے کی تربیت ○ اسرہ کے ثقافتی، عملی پہلو اجاگر کرنے کی تربیت ○ حالات حاضرہ کا تجزیہ کرنے کی تربیت ○ کسی خاص موضوع پہ تحقیق کرنے کی تربیت ○ مختلف شعبوں میں معاشرتی، اقتصادی پہلو سے تعلیم حاصل کرنے کی طرف توجہ اور وسائل کی فراہمی ○ عملی تربیت میں کھیل کے مقابلے، ورزش، تفریح، نامساعد حالات میں بالغ نظری کا مظاہرہ کیسے کیا جائے--- معاشی طور پر نازک حالات میں حلال کمائی کے لیے کسی بھی پیشے کو اختیار کرنا پڑے تو مختلف ہنر کی تربیت اور محنت مشقت، ریاضت کی کڑی تربیت ○ زبان کی حفاظت کی عملی تربیت، مجلس کے آداب، راز کو راز رکھنے اور تنظیم کے معاملات کو امانت جاننے کی تربیت، خطرناک صورت حال میں استقامت و ثابت قدمی کی ضرورت کی اہمیت اور عملی تربیت۔

حسن البنا شہید کی محنت کا ثمر ایک بہترین تربیت یافتہ گروپ کی شکل میں سامنے آیا جنھوں نے وقت کے فرعونوں کے سامنے سر نہ جھکایا۔ اس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی شامل رہیں۔

اسرہ، کتیبہ، رحلۃ، المعسکر، دورہ، ندوہ، موتمر، ان ناموں کے تحت کارکنان کو تربیت کے مختلف مراحل سے گزارا جاتا۔ اب بھی یہی نظام رائج ہے اور وقت و حالات کی نزاکتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بہتر سے بہتر مسلمان مجاہد تیار کیے جا رہے ہیں۔

اسرہ کے بعد کتیبہ کا مرحلہ ہے۔ اس میں بنیادی تربیت روحانی نشوونما کی ہوتی ہے۔ روحانی نشوونما: عبادات، ذکر، دعا کے ساتھ اخلاص نیت کی تجدید، اللہ تعالیٰ سے مضبوط تعلق، نامساعد حالات، بے آرامی اور مشقت کے ماحول میں خوش اسلوبی سے ڈیوٹی انجام دینے کی تربیت۔ اس نظام میں اطاعت امر کی خاص تربیت دی جاتی ہے۔ جی چاہے یا نہ چاہے، ضرورت

ہو یا نہ ہو، طبیعت چاہے نہ چاہے جو کام جس وقت کہہ دیا گیا وہ فوراً کرنا ہے۔

اسرہ اور کتیبہ کا مقصد زیادہ تر معاشرتی، نفسیاتی، علمی اور روحانی پہلو کی تربیت ہے، مگر تیسرے مرحلے (رحلۃ) کا مقصد زیادہ تر جسمانی ہے۔ اس میں جسمانی مشقت کی سخت تربیت ہوتی ہے۔ 'رحلۃ عموماً' ایک مہینہ میں ایک مرتبہ فجر سے مغرب تک کسی صحرا، میدان، شہر سے دور، پہاڑی مقام پہ ہوتا ہے۔ سخت گرم یا سخت سرد موسم میں محنت، مشقت کی تربیت، وسائل و ذرائع کی کمی کے ساتھ کی جاتی ہے۔

معسکر: اس شعبہ کے تحت صرف جسمانی تربیت ہی نہیں بلکہ دنیا کو اسلامی فوج کی تاریخ سکھانا بھی ہے۔ اسلام میں نماز کی صورت میں روزانہ پانچ مرتبہ تربیت اور تذکیر ہوتی ہے۔ اس کا مقصد ایک منظم و متحد امت کی اللہ کے سامنے بندگی اور خودسپردگی کا اظہار ہے' تاکہ اللہ کا دین غالب ہو جائے۔ معسکر کا مقصد نوع انسانی میں بھائی چارہ پیدا کرنا ہے--- وہ تمام مصائب و آلام جو نوع انسانی کے مشترک ہیں ان کا حل تلاش کرنا ایک دوسرے کے قریب آکر ہی ممکن ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی، بے راہ روی، انشورنس، سود، ذرائع ابلاغ کی بے حیائی دنیا کے ہر خطے کے انسان کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ ان سب کے بارے میں صحیح نقطہ نظر پیش کر کے فلاح کی راہ دکھانا۔

دورہ: اس شعبہ کا کام کسی ایک دن ایک ہی موضوع پہ لیکچر، ڈسکشن، تحقیق، قلیل المیعاد کورس تیار کروانا ہے۔

ندوہ: ماہرین کا ایسا گروپ جو کسی خاص موضوع یا مسئلے پر پورے دلائل و براہین کے ساتھ اپنی راے پیش کرے تاکہ عصری چیلنجوں کا مقابلہ کیا جاسکے اور ان کا حل پیش کیا جاسکے۔

اخوان المسلمون کے ارکان کے کردار کی تعمیر کے لیے جس قدر جاں فشانی سے کام لیا جاتا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ یہ یقیناً حسن البنا شہید کے اخلاص کا ثمر ہے اور اس کی آبیاری ان کے خون نے کی ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (یوسف ۱۲:۹۰)

***

حسن البنا کی حکمت عملی

ابو جرۃ عبداللہ سلطانی ○

امام حسن البنا کی شخصیت اور عرب دنیا میں پھیلی ہوئی ان کی تحریک اخوان المسلمون پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ میرے پیش نظر حسن البنا کی تعلیمات کی روشنی میں اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کے درج ذیل چار بنیادی نکات ہیں: ۱- اخوان کے فکر کا واضح ہونا ۲- مراحل کا واضح ہونا ۳- اہداف ومقاصد کا واضح ہونا ۴- وسائل وذرائع کا واضح ہونا۔

امام اپنے کتابچے دعـوتـنـا فـی طـور جـدیـد (ہماری دعوت نئے پیرایے میں) میں رقم طراز ہیں کہ: ''ہماری دعوت کا طریق کار اسلام کی پہلی دعوت کے طریق کار سے مختلف نہیں ہے، بلکہ یہ دعوت حقیقی معنوں میں اسی دعوت کی بازگشت ہے جس کا نعرہ صدیوں پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں بلند کیا تھا۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے ذہنوں کو نبوت کے اس روشن عہد کی طرف لوٹائیں جو وحیِ الٰہی کی عظمت کا شاہد تھا، تاکہ اپنے پہلے معلم سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے پیش نظر اصلاح معاشرہ کے اسباق دہرائیں اور نئے سرے سے دعوتی درس کی مشق کریں''۔

بہت بڑے ہدف ــــ پوری انسانیت کی اصلاح کی طرف ــــ یہ پہلا قدم ہے۔ اسی گذشتہ طریق کار کو پیش نظر رکھتے ہوئے، انھی خطوط پر چل کر اور اسی صاف وشفاف چشمے سے سیراب ہوکر ہی اس عظیم ہدف کی طرف پیش قدمی ممکن ہے۔ امام مالک نے ایک موقعے پر فرمایا تھا: ''امت کا آخر اسی نسخے سے شفایاب ہوگا جو اس کے آغاز کے لیے شفایاب ثابت ہوا ہے''۔

○ سربراہ تحریک پُرامن معاشرہ (حمس) اور وفاقی وزیر الجزائر۔ ترجمہ: سمیع الحق شیرپاؤ، فصیح اللہ عبدالباقی

اکثر مصلحین کے ساتھ مختلف زمانوں میں بنیادی طور پر مسئلہ یہ رہا ہے کہ وہ یا تو جذبات کے رو میں بہہ گئے اور یا بغیر کسی مناسب منصوبہ بندی کے، غیر منظم انداز میں اصلاحی تحریک کا آغاز کر دیا۔ نیک طینت عوام کا ایک گروہ ان کے گرد اکٹھا ہو گیا، جوشیلے نعرے لگائے اور ایک حد تک جذبات کا مظاہرہ کیا۔ پھر جب یہ دیکھا کہ تمام تر کوششوں کے باوجود، فساد اور خرابی نہ صرف قائم ہے بلکہ اس میں اضافہ ہو گیا ہے، تو طویل عرصہ ساتھ چلنے اور پھر فوری طور پر نتائج نہ پانے سے دل برداشتہ ہو کر بکھر گئے۔ ان کے حوصلے پست اور عزائم شکستہ تر ہو گئے۔ بعض اوقات اصلاحی تحریک کی قیادت اقتدار کے نشے اور حکمرانی کے لالچ میں آ کر باہم دست و گریبان ہو جاتی ہے۔ ان کی ساری توانائیاں ایک دوسرے پر الزام تراشی میں صرف ہو جاتی ہیں۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے اصلاح کا وہ کام جو بڑے جوش و خروش سے شروع ہوا تھا بری طرح ناکامی کا شکار ہو جاتا ہے اور مزید فساد کا باعث بنتا ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اصلاحی تحریک کی وہی لیڈر شپ جو ابھی ابھی ظلم اور فساد کے خلاف برسر پیکار تھی اور بپھرے ہوئے عوام کی قیادت کر رہی تھی، کچھ لوگ اس کے دشمن ہو گئے، عوام کو ان کے خلاف ابھارا۔ اگرچہ عوام کتنا ہی ان کی پاکیزگی اور لیاقت کا دم بھریں، ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کا یہی ایک جواب ہوتا ہے کہ: اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ○ (النمل ۲۷:۵۶) ''نکال آلِ لوط کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں''۔ اصلاحی تحریکوں کی تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، بلکہ ان سے قبل تمام انبیاے علیہم السلام ان مراحل سے گزرے ہیں۔

یہ چیز بھی عام طور پر مشاہدے میں آتی ہے کہ عوام الناس میں مفاد پرست ٹولے اور سرداروں کے ذریعے مفسد عناصر زور پکڑ لیتے ہیں اور اصلاحی تحریک پر داروغے بن کر فیصلے صادر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے عناصر، تحریک، اس کی قیادت، اس کے طریق کار، پروگرام اور افراد کی ہر لغزش و کوتاہی کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں اور کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، خاص طور پر جب ان مفسدین کے مفادات پر اصلاحی تحریک کے افکار کی ضرب پڑتی ہو: اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ (طٰہٰ ۲۰:۵۷) ''کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور

سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرے"۔ اس مناسبت سے تاریخ کے جھروکوں میں اسلامی تحریکوں کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

○ **تحریک کا نقطۂ آغاز:** یہ بات سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ ہر اصلاحی تحریک کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ امام حسن البنا کی فکری، دعوتی اور اصلاحی تحریک کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ انھوں نے گذشتہ تمام اصلاحی تحریکوں کے تجربات کی مناسب جانچ پرکھ کی، ان سے نئے نتائج اخذ کیے، اپنا حاصلِ مطالعہ ایک اصلاحی تحریک کے آغاز کے لیے چھے بڑے اصولوں کی صورت میں پیش کیا، اور پھر انھی اصولوں پر اپنی تحریک کی بنیاد بھی رکھی۔ انھوں نے واضح کیا کہ ایک اصلاحی تحریک کے اپنے تشکیلی دور میں طریق کار، خصوصیات، مراحل، اہداف اور وسائل کیا ہوتے ہیں؟ یہ بھی بتایا کہ دنیا میں تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ ایک تحریک کا طریق کار وسیع تر تناظر میں ہو، اس کی منصوبہ بندی حقائق پر مبنی راستہ بنانے کی بنیاد پر ہو، اور پیش قدمی کرنے کے لیے اس کا اُفق عالمی اور معتدل ہو۔ یہی اخوان المسلمون کی تحریک کی سب سے اہم خصوصیات ہیں۔

○ **فکری بنیادیں:** یہ اصول ایک وسیع تر تبدیلی کا ضامن ہونے کے ساتھ تمام اصلاحی تحریکوں کے لیے بھی مددگار ہیں۔ ان چھے اصولوں کو ہم مقصد کی وضاحت کا عنوان بھی دے سکتے ہیں۔ فکر، مراحل، اہداف، وسائل اور طریق کار کی وضاحت کو ہم اس نقشے اور ترتیب کے ساتھ پیش کریں گے:

۱- تحریکی اور دیگر افکار کے درمیان واضح اور حتمی طور پر فرق بیان کرنا۔

۲- ترجیحات (بڑے مقاصد) کی مرحلہ وار اہداف کے طور پر حد بندی کرنا، اور ان اصول وحدود کی نشان دہی کرنا کہ جن سے کبھی بھی مقاصد کے حصول کی خاطر تجاوز نہیں ہونا چاہیے۔

۳- راہ دعوت کے بڑے مراحل کی وضاحت کرنا (بیج بونا، اس کی دیکھ بھال کرنا، تنے کا زمین سے نکلنا، اس کا مضبوط ہونا اور پھر اپنی بنیادوں پر کھڑا ہونا)۔

۴- موجودہ بگاڑ کا اندازہ کرنا، اس کے حجم، وسائل، پھیلاؤ اور نشوونما کے سرچشمے کو جاننا۔

۵- اپنی افرادی قوت کا صحیح اندازہ لگانا۔ اصلاح اور تبدیلی کے لیے اپنے ساتھیوں کی قوت ارادی کا صحیح اندازہ ہونا، کیونکہ اصلاح اور تبدیلی کی کٹھن ذمہ داری انھی کو نبھانا ہوگی۔

۶-امکانات اور وسائل کو سامنے رکھنا اور انھیں اس طرح ترتیب دینا کہ ضرورت کے وقت ان کا استعمال ممکن ہوسکے، یا کم ازکم بنیادی اہداف کے لیے ان کو بروے کار لایا جاسکے۔

ان چھے اصولوں کو امام حسن البنا کی وسیع تر اصلاحی اٹھان کی فکری بنیادوں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کی توضیح وتشریح کے لیے بہت سی کتابوں میں مصنفین نے ان کا توصیفی اور شماریاتی حوالے سے تجزیہ کیا ہے۔ دعوتی، تربیتی، سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی پہلوؤں پر بحث کی ہے اور ان امور کا جائزہ لیا ہے، جن کو اس مکتب فکر کے بانی نے نئی مطلوبہ نسل کی تیاری کا ذریعہ بنایا اور جن کے بل بوتے پر ربع صدی کی قلیل مدت میں، قرآن کی علَم بردار پہلی منفرد جماعت تیار ہوئی تھی۔

امام حسن البنا کا ذہن صاف اور فکر پاکیزہ ہے۔ قاری ایک نظر ہی سے ان کی فکری گہرائی کا اندازہ کرلیتا ہے۔ ہر اس فکر کو جسے امام نے اپنی تحریروں، خطبوں، رسائل، ہدایات اور عملی کام کے ذریعے پیش کیا بغیر کسی الجھاؤ کے واضح طور پر سمجھ لیتا ہے۔

○ **اُمت مسلمہ کی زبوں حالی**: اسلام اور اسلامی فکر اجنبی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ علماے دین تک مغرب سے آئی ہوئی لادینیت سے مرعوب ہوچکے تھے اور مصطفیٰ کمال پاشا نے تو لادینیت کو اسلام کے متبادل کے طور پر پیش کردیا تھا۔ ایسے ہی حوصلہ شکن حالات میں ایک بار ایک انگریز مفکر نے کچھ حساس مسائل کے متعلق امام حسن البنا سے ایک طویل انٹرویو کیا۔ ترجمان حسن البنا کے واضح جوابات نقل نہ کرپایا۔ امام نے اس کو بے چین پاکر مترجم سے کہا: ''ان صاحب سے یہ دریافت کرو کہ کیا آپ نے قرآن پڑھا ہے اور کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟ کیونکہ یہی ہماری دعوت ہے، یہی ہماری پہچان ہے اور اسی کی طرف اخوان المسلمون دعوت دیتی ہے''۔

انھی واضح الفاظ اور جامع کلمات کے ساتھ ہی امام نے ایک بار ۱۹۴۱ء میں نوجوانوں کو مخاطب کرکے فرمایا تھا: ''اسلام اور مسلمانوں پر ایک ایسا زمانہ بھی آیا جب وہ بڑے دل خراش حوادث سے دوچار ہوئے، ان پر بہت شدید مصائب ٹوٹے۔ اسلام دشمن قوتیں اسلام کی شمع بجھانے پر تل گئیں اور اس کے شان دار اثرات کو زائل کرنے کی سعی شروع کردی۔ اس کے بیٹوں (ماننے والوں) کو گمراہ کرنے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ اس کی حدود اور قوانین کو

معطل کیا، اس کے لشکر کو کمزور بنا دیا۔ اس کی تعلیمات اور احکام کو کبھی اضافہ، کبھی کمی اور کبھی من مانی تعبیر کے ذریعے بے اثر بنانے کی کوشش کی۔ اسلام کی سیاسی قوت اور اسلامی خلافت کے زوال اور اسلامی لشکر کی سستی، بزدلی اور کمزوری نے ان دشمنان اسلام کو مزید تقویت بہم پہنچائی۔ یہاں تک کہ عالم اسلام کا خاصا بڑا حصہ اہل کفر کے قبضے میں چلا گیا اور مسلمانوں کو طاغوتی سامراج کے زیرسایہ ذلت و رسوائی کے برے دن دیکھنے پڑے"۔

یہ اس ناگفتہ بہ حالت اور شکست خوردہ امت کا ایک ٹھوس تجزیہ ہے، جس کے مطابق عالمِ اسلام کے خلاف ان تین محاذوں پر معرکہ برپا تھا:

اندرونی محاذ: عالم اسلام میں علما کی بے بسی، عوام کی جہالت و نادانی اور مسلمانوں کی صفوں میں کمزوری اور اختلاف سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو ذلت و رسوائی سے دوچار کرنے کے لیے یہ محاذ کھولا گیا۔

بیرونی محاذ: یہ محاذ اسلام دشمن عناصر کی جانب سے دین اسلام کو کھوٹا ثابت کرنے، اس کے پیروکاروں کو گمراہ کرنے، عالم اسلام پر قبضہ جمانے اور اس کے ذخائر اور معادن کو چرانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

معنوی محاذ: یہ محاذ ملت کفر کی طرف سے اس لیے قائم ہوا کہ اس کے ذریعے اسلام کی سیاسی قوت کو زائل کیا جائے۔ خلفاے راشدین سے ورثے میں ملے ان تمام اثاثوں یہاں تک کہ ان کی آخری دستاویزات تک کو ضائع کردیا جائے، اسلام کی بچی کھچی فوجی قوت کو تہس نہس کردیا جائے اور عثمانی خلافت (جس کو 'مرد بیمار کے نام' سے یاد کیا جاتا تھا) کے ترکے کو تقسیم کیا جائے اور بالآخر بحیثیت ملّت، مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

○ **اُمت کے لیے لائحہ عمل**: امام حسن البنا نے امت مسلمہ کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ان تمام جان لیوا امراض سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ انھوں نے امت کی اندرونی کمزوری، بیرونی تسلط، قیادت کے فقدان اور اسلامی خلافت سے محرومی جیسے مہیب خطرات کے بارے میں خبردار کیا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسا کر کے ان خطرات سے نبٹنے اور ان مہلک بیماریوں کے علاج کے لیے ایک واضح لائحہ عمل کی شکل میں یہ نسخہ تجویز کیا: 'اخوان المسلمون' کی سب سے پہلی ذمہ

داری یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اسلام کا صحیح اور درست تصور پیش کریں، ایسا تصور جس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو، جس میں کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ نہ ہو۔ یہ ہماری فکر اور ہمارے لائحہ عمل کا نظری پہلو ہے۔ اسلام کو صحیح طرح سمجھنے کے بعد ہمارا دوسرا کام یہ ہے کہ ہم لوگوں سے پرزور مطالبہ کریں کہ اب اس اسلام کو عملی جامہ پہنائیں اور عملی زندگی میں اس کو نافذ کریں۔ یہ ہماری فکر اور ہمارے لائحہ عمل کا عملی پہلو ہے۔ اس پوری تحریک اور اس کے لائحہ عمل میں اللہ کی لاریب اور محکم کتاب، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ احادیث، سلف صالحین کا کردار اور ان کی سیرت ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ ہماری ساری جدوجہد سے ہمارا مقصود صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول، اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا اور تمام انسانوں کے لیے راہ نمائی اور ہدایت کا سامان کرنا ہے"۔

امام کے یہ چند جملے اسلام کے ہر مجاہد اور دین کے ہر پاسبان کے لیے زادِ راہ اور نقشۂ کار (روڈمیپ) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امام کے ان چھے نکات کی تشریح سے درحقیقت اس پریشان کن سوال کا جواب اور اس بڑے چیلنج کا توڑ فراہم ہوا، جس کے سامنے عثمانی خلافت کے خاتمے سے لے کر اس وقت تک بہت ساری اسلامی اور اصلاحی تحریکیں لاجواب نظر آتی تھیں اور وہ پیچیدہ سوال یہ تھا کہ: ہمیں کیا کرنا ہے؟ یا یہ کہ: ہم کیا کرنا چاہتے ہیں؟

اس سوال کا تفصیلی اور جامع جواب دیتے ہوئے امام حسن البنا نے فرمایا:

فرد کی تیاری: سب سے پہلے ہم ایک ایسا مسلم فرد تیار کرنا چاہتے ہیں، جو اپنی فکر و عقیدے، اخلاق و جذبات اور اپنے عمل کے لحاظ سے مکمل طور پر مسلمان ہو۔ یہی ہماری بنیاد ہے۔

مسلم گھرانا: ہم ایک مسلم گھرانا بنانا چاہتے ہیں، ایسا گھرانا جو اپنے فکر و عقیدے، اپنے اخلاق و جذبات اور اپنے عمل اور تصرف کے لحاظ سے مسلمان ہو۔ اس لیے ہم خواتین کے لیے بھی اتنا ہی اہتمام کرتے ہیں جتنا مردوں کے لیے، اور بچوں کے ساتھ اتنی ہی رعایت برتتے ہیں جتنی جوانوں کے ساتھ۔ ایک مسلم گھرانے کی تشکیل بھی ہمارے تربیتی پروگرام کا حصہ ہے۔

مسلم معاشرے کی تعمیر: تربیت کے ان تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم مسلم معاشرے کی تعمیر چاہتے ہیں۔ اس لیے ہم دن رات ایک کر کے اپنی دعوت ہر گھر تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ ہماری آواز ہر جگہ سنی جائے۔ گاؤں گاؤں اور شہر شہر اس کا چرچا ہو۔ اپنی

دعوت لوگوں تک پہنچانے میں ہم کسی بھی جائز ذریعے کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور اس سلسلے میں کوئی کوتاہی اور لاپروائی نہیں ہونے دیتے۔

اسلامی ریاست کی تشکیل: اگلے قدم میں ہم ایک ایسی اسلامی ریاست کی تشکیل چاہتے ہیں، جو مسجد کی طرف لوگوں کی راہ نمائی کرے۔ لوگوں کو اسی طرح اسلام کی راہ پر لگائے جس طرح اس سے پہلے ابوبکرؓ، عمرؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ نے لگایا تھا۔ ہم واشگاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ہم کسی بھی ایسے حکومتی نظام کو نہیں مانتے جو اسلام کی بنیاد پر استوار نہ ہو اور اسلام سے راہ نمائی نہ لیتا ہو۔ ہم اسلام کی تمام اخلاقیات کو زندہ کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کریں گے اور اسی بنیاد پر اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے سرتوڑ کوششیں کرتے رہیں گے۔

متحدہ عالم اسلام: ہم عالم اسلام کے ہر اس حصے کو آپس میں جوڑیں گے جو مغربی سیاست اور یورپی لالچ کی بدولت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر شکست وریخت کا شکار ہو گیا ہے۔ ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اس جغرافیائی تقسیم اور ان عالمی معاہدات کو تسلیم نہیں کرتے جن کی وجہ سے عالم اسلام کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، جنھیں بڑی آسانی کے ساتھ کوئی بھی غاصب تر نوالہ بنا سکتا ہے۔ ایک بالشت بھر زمین جہاں ایک بھی کلمہ گو مسلمان بستا ہو، اگر دشمن کے قبضے میں ہو تو ہماری غصب شدہ اسلامی سرزمین ہے، اس کی آزادی ہمارا فرض ہے۔ اسی طرح عالم اسلام کے تمام حصوں کو آپس میں جوڑنا بھی ہمارے پروگرام کا حصہ ہے۔ اسلامی عقیدے کی رو سے ہر طاقت ور مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ہر اس شخص کا حامی اور مددگار بنے جو قرآن پاک پر ایمان رکھتا ہو۔ کسی بھی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ایمان اور عقیدے کے رشتے پر دوسرے رشتوں کو مقدم رکھے۔ اسلام میں عقیدہ ہی اصل بنیاد ہے۔

سامراجی و غاصبانہ قبضے کا خاتمہ: ہمارا عزم ہے کہ ان تمام سرزمینوں پر ایک بار پھر اسلام کا پرچم بلند ہو جو کسی زمانے میں اسلام کی برکات سے فیض یاب ہوئیں اور جہاں مؤذن نے ایک بار بھی تکبیر اور تہلیل کی آواز بلند کی ہو، اور جن کو ظالم اور غاصب طالع آزماؤں نے اسلام کی روشنی اور برکات سے محروم کر کے کفر کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔

وہ اپنی بات کو خوبی سے اس مختصر جملے میں سمیٹ لیتے ہیں: ''ہم پر فرض ہے کہ ہم اس

اسلامی سلطنت کی عظمت رفتہ کو لوٹانے کے لیے کوشاں رہیں جو عدل و انصاف پر مبنی تھی اور جس کا مقصد لوگوں میں ایمان کی روشنی پھیلانا اور ان کو ہدایت سے ہم کنار کرنا تھا''۔

اس مختصر جملے سے ہم واضح طور پر ان کے طریق کار اور پروگرام کو سمجھ سکتے ہیں۔ کیا ہم اس واضح تصور کو ان لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں جو ابھی تک اپنے ان سوالات کے اسیر بن کر یہ پوچھتے ہیں کہ: ہم کون ہیں؟ کیا خیر امة اخرجت للناس کا اعادہ اسی طریق کار کے مطابق ممکن ہے، جس کے ذریعے سے صحابہ کرامؓ کی جماعت تیار ہوئی تھی؟ امام حسن البنا نے جو طریق کار مذکورہ بالا چھے نکات میں بیان کیا ہے، کیا یہ امت کو غلامی سے نجات دلانے اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے اعادے کے لیے کامیاب نسخہ ہے؟ کیا دوسرے پروگرام، اصلاحی تحریکیں اور طریق کار بھی اس حوالے سے موجود ہیں؟

میں اپنے مقالے ان سوالات کے مختصر جوابات اس انداز سے پیش کرنے کی کوشش کروں گا، جس سے امام حسن البنا کے طریق دعوت اور اصلاحی پروگرام کی بہتر وضاحت ہو سکے۔

○ **واضح فکری بنیادیں:** ہماری نظر میں حسن البنا کی فکر میں جو نیا اسلوب پایا جاتا ہے اس کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے: اسلام کا وسیع تر اور جامع فہم اور مخاطبین دعوت کی نفسیات اور شخصیت سے آگاہی۔

اندرونی جھگڑوں، اختلافات اور کھینچا تانی کے سبب اسلامی فکر کی اساسی بنیادیں ذہنوں سے محو ہو چکی تھیں۔ اجتہادی مدارس بانجھ ہو چکے تھے اور فقہی اور دینی مراکز رخصت ہونے کو تھے، جن کے سبب اسلام کی بنیادی فکر فقہی مدارس، مختلف فکری مکاتب، تربیتی مناہج، علمی اداروں، تصوف کے نزاعات، متنازع اصلاحی تحریکوں، ادھوری انفرادی کوششوں اور حکومتی اداروں میں تقسیم ہو کر گردش زمانہ کی نذر ہو چکی تھی۔

اسی دوران حسن البنا نے گذشتہ عہد اور عصر حاضر کے فکری مکاتب اور اصلاحی تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا اور ان سب کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے جدید فکری خطوط وضع کیے۔ درج ذیل تین اہم خصوصیات کی وجہ سے ان کی اس فکر کو امتیاز اور فوقیت حاصل ہے:

۱- یہ جدید طرز فکر، انتہائی واضح سلیس اور عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۲- یہ اسلام کے وسیع تر تصور، روایت اور دقیق فہم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

۳- یہ ہمہ گیریت ایک دوسرے سے تعاون کرنے سے عبارت ہے۔

میری راے میں یہ ہیں وہ بنیادی نکات، جو امام حسن البنا کی اس تجدیدی فکر کو دوسرے تمام مکاتب فکر سے جدا کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ عمدہ اور اہم تجدیدی کام جس کی بدولت اسلامی دعوت اور اسلامی فکر اپنے اصل سرچشمے کی طرف لوٹی۔ اس کی برکت سے اس اضطراب کا ازالہ ہوا جو اس وقت اسلام کے بارے میں لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں پایا جاتا تھا اور اسی کے سبب اس دورنگی اور تضاد سے چھٹکارا ملا جس میں مسلمان عملی طور پر مبتلا تھے۔

امام حسن البنا کا یہ کارنامہ، فکری تجدید کے میدان میں ایک اہم پیش رفت ہے۔ افکار کی پراگندگی اور اضطراب دوسری مشکلات کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ اور تکلیف دہ ہوا کرتا ہے۔ معاشرہ پراگندہ افکار، اجتماعی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے شکست و ریخت سے دوچار تھا۔ امت مسلمہ قیادت کے بحران اور انتشار کا شکار تھی۔ کچھ کام اجتماعی اور انفرادی سطح پر اخلاص کی بنیاد پر بھی کیا گیا۔ لیکن فہم کی کمزوری مطلوبہ نتائج کے راستے میں رکاوٹ تھی۔ ہر مکتب فکر ایک مخصوص خول میں بند تھا۔ تنگ نظری اور عدمِ برداشت ایک بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ ہر مکتب فکر کی قیادت اس کوشش میں تھی کہ صرف اسی کی فکر کو فروغ ملے۔

نمایاں طرز ہاے فکر: اس زمانے میں فکری میدان دو قسم کے طرز فکر رکھنے والوں کے لیے خالی تھا۔

صوفی طرزِ فکر: علم فضائل اور علم سلوک اس مکتب فکر کے اہتمام کا مرکز بنے رہے۔ بلاشبہہ اس مکتب فکر کی کچھ اچھائیاں بھی ہیں لیکن کئی کمزوریاں یا خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

فلسفی اور جدلی طرز فکر: جس کا بنیادی کام اسلام کے حوالے سے شکوک وشبہات کو دفع کرنا، فقہی مسائل پر توجہ دینا اور مناظروں اور مباحثوں کا بھرپور اہتمام کرنا تھا۔ اس مکتب فکر کے اپنے منفی و مثبت پہلو ہیں۔

○ **اصولی نقطۂ نظر**: اسی اثنا میں امام حسن البنا نے قرآن کریم کی سورۂ انفال (۸:۶۱) کے ایک جامع لفظ 'اعدو' پر ہاتھ رکھ کر پوری انسانیت کو مخاطب کر کے کہا کہ لوگو! راستہ یہاں

ہے۔ انھوں نے اس کلمے کو اپنی جماعت کا شعار بنا لیا، تاکہ تیاری کا فریضہ ایک مستقل اور پایدار فریضے کے طور پر ہمیشہ امت کے سامنے رہے، جو قرآن پاک کی تعلیمات کی روشنی میں جاری و ساری رہے گا۔ قرآن کریم (مصحف شریف) کے گرد دو تلواریں بنا کر اس بات کو ذہن نشین کرایا کہ اس قرآنی قانون اور قرآنی ہدایات کو درحقیقت حکمرانی کا اختیار حاصل ہے۔

ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے امام نے جو ارشاد فرمایا، اس سے پوری فکر کی وضاحت ہو جاتی ہے اور مستقبل کے جامع لائحہ عمل پر روشنی پڑتی ہے: ''ہم قرآن پاک کی جامع دعوت کی حامل تحریک ہیں۔ نفس کے تزکیے، روح کی پاکیزگی و بالیدگی اور اللہ بزرگ و برتر سے دلوں کو جوڑنے میں ہم اہل تصوف کا تسلسل ہیں۔ خدمت خلق سے سرشار، انسانیت کے لیے نافع، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے، مصائب اور تکالیف میں مبتلا لوگوں کے کام آنے والے، معاشرے کے پسے ہوئے، غریب اور نادار افراد کی امداد کے لیے ہمیشہ تیار، اور باہم برسرپیکار گروہوں میں صلح و صفائی کرانے کے ناتے ہم ایک فلاحی تنظیم ہیں۔ ہر قسم کے جہل اور فقر سے نبرد آزما اور روحانی و جسمانی تمام امراض کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم ایک سماجی وفلاحی (social) ادارہ ہیں۔ ہم وہ اصولی سیاسی پارٹی ہیں جس کا مقصد امت میں وحدت کا قیام ہے، جو کہ تمام شخصی مصالح اور اغراض سے بالاتر ہو کر اہداف کا تعین کرنے، لوگوں کی راہ نمائی کرنے اور ان کو صحیح سمت دینے کے لیے کوشاں ہے۔ لوگو! سنو: جو اسلام کو صحیح طور پر جان گیا، وہ ہمیں اسی طرح پہچان لے گا جس طرح اپنے آپ کو پہچانتا ہے۔ پس اسلام کو سمجھو--- پھر ہمارے حوالے سے جو کچھ کہنا چاہو کہو''۔

امام حسن البنا نے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے: ''میں وہ سیاح ہوں جو حقیقت کی تلاش میں نکلا ہے۔ وہ انسان ہوں جو لوگوں کے درمیان انسانیت کو ڈھونڈنے چلا ہے، اور وطن کا ایسا باشندہ ہوں جو اپنے وطن کے لیے دل کی گہرائیوں سے اسلام کے سایے تلے عزت، آزادی، امن اور پاکیزہ زندگی کا خواہاں ہے''۔

اسلام کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ''اسلام زندگی بھر کے تمام مسائل کو منظم کرتا ہے۔ اس کے ہر مسئلے میں فتویٰ اور حکم دیتا ہے اور ہر معاملے کو سلجھانے کا منظم اور واضح طریق کار پیش کرتا

ہے۔ کسی بھی بنیادی اصلاح طلب مسئلے کو حل کرنے میں لاجواب ہی نہیں بلکہ ان تمام نظاموں کی اصلاح کی مکمل اہلیت رکھتا ہے جن کی اصلاح کی بنی نوع انسان کو ضرورت پیش آسکتی ہے"۔

اپنی فکر کو بڑے مختصر اور جامع انداز میں یوں پیش کیا: "ہماری فکر کا خلاصہ یہ ہے: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مومنوں کی ایک ایسی نئی نسل تیار کرنا جو اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں اعلیٰ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو، اس کے بلند اخلاقی معیارات پر کاربند ہو اور اپنی پوری زندگی اسلام کے رنگ میں رنگ لے: صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرہ ۲:۱۳۸)
"اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟"

۱۹۲۸ء، یعنی یوم تاسیس ہی سے اس تحریک میں وہ تمام حرکی ادبیات موجود تھیں، جو اب ایک ہمہ گیر عالمی مکتب فکر کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ اس لیے کہ اخوان المسلمون، اسلام کی پہلی دعوت کا تسلسل اور اس کی صداے بازگشت ہے۔ حقیقت میں اسی روز سے اس دعوت کا آغاز ہو گیا تھا جس دن قرآن پاک کی پہلی آیت اقــرا ـــ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ بنیادی طور پر یہی اقرا کا کلمہ ہی مسلمان علما اور مفکرین کی تشریحات کی روشنی میں اس بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور زندگی کے تمام شعبوں کی اصلاح کے لیے ایک اصولی پروگرام کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں پوری اُمت کے لیے ایسے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، جس کی بدولت لوگوں کے عقیدے، اخلاق، طرز فکر، تغیر اور انقلاب کے اسالیب اور اسی طرح زندگی کے ہر میدان میں ایک تغیر رونما ہوا۔ لوگ، لات، منات، عزیٰ اور ہبل کو چھوڑ کر ایک اللہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

یہ اصولی پروگرام پوری کائنات اور کائنات کی ہر ایک چیز کے لیے وضع کیا گیا۔ چنانچہ جمادات، نباتات، حیوانات، انسان، جن اور ملائکہ سب کے سب اس نظام کے پابند ہیں۔ سب اللہ پاک کی تقدیس اور تسبیح کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جو شخص اسلام کے اصل سرچشمے سے سیراب ہونے کا ارادہ رکھتا ہو، اس کے لیے اسلام کا پیغام کتنا واضح اور آسان ہے اور نشانات راہ دکھانے کے لیے اس کا طریق کار کتنا روشن ہے ـــــ ذرا ملاحظہ کیجیے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو اپنا سفیر بنا کر یمن روانہ فرمایا تو چار مختصر جملوں میں انھیں دعوت اور تبلیغ کا پورا طریق

سمجھا دیا۔ آپؐ نے فرمایا: سب سے پہلے ایمان کی دعوت (شہادتین کا اقرار)، اگر اس کو انھوں نے قبول کرلیا تو اس کے بعد ان کو اسلام کے بنیادی قواعد وضوابط کی طرف دعوت دینا، اگر اس کو بھی انھوں نے تسلیم کرلیا تو پھر ان کو مقاصد کلمہ کی طرف دعوت، اور اس کے بعد پھر اجتہاد کا مرحلہ آتا ہے۔ کتنے واضح آسان تدریجی اسلوب کی راہ نمائی اس مثال میں ملتی ہے۔

اخوان المسلمون کی فکر کا خلاصہ اس کے بانی کی نظر میں ان کلمات میں پیش کیا جاسکتا ہے: عالمِ اسلام اور اس کے توسط سے پوری نوع انسانیت اپنی دینی پیاس بجھانے کے لیے اس صاف وشفاف چشمے کی طرف لوٹ آئے جس کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا: ''میں تمھارے درمیان دو ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم اس پر کاربند رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے، اللہ کی کتاب اور میری سنت''۔

انفرادی دعوت اور تدریجی اصلاح سے اس کام کا آغاز ہوگا۔ یہ کام فرد سازی سے لے کر زمانے کی راہ نمائی، خلافت کی اقامت اور ہر طاغوت سے پورے عالم اسلام کی مکمل آزادی تک جاری رہے گا۔ اس ہمہ گیر تحریک میں ہمارا زادِ راہ گہرا اور پختہ ایمان، مستحکم تربیت، مضبوط اخوت اور بھائی چارہ اور پیہم اور مسلسل عمل ہوگا۔ انھی عام فہم بنیادی اصولوں پر امام حسن البنا نے اپنی تحریک کے طریق کار کی بنیاد رکھی، جس نے اخوان المسلمون کی صورت میں ایک بہت بڑی عالمی تحریک کی حیثیت اختیار کی۔

جوانوں کے نام ایک پیغام میں امام حسن البنا شہید نے اس تحریک کے مراحل اور وسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: ''اخوان المسلمون کی تحریک کے مراحل متعین اور واضح ہیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کو کیا کرنا ہے۔ وہ تمام وسائل بھی بالکل ہماری نگاہ کے سامنے ہیں جن کو استعمال کر کے ہم اپنے وضع کردہ مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے مسلمان فرد، مسلم گھرانے، مسلم معاشرہ اور اس کے بعد اسلامی ریاست کا قیام، عالم اسلام کی تمام سرزمینوں کو یک جا کر کے ایک بڑی اسلامی مملکت کا قیام ہمارے پروگرام کا حصہ ہے، جہاں اسلام کا پرچم سربلند ہو۔ اس کے بعد ہم تمام انسانیت کے سامنے برملا اور ہر حالت میں اس دعوت کا اعلان کریں گے اور دنیا کے کونے کونے تک اس کو پہنچائیں گے''۔

○ **دعوت دین کی بنیادیں:** یہ بات درست ہے کہ اسلام اپنی بنیادی تعلیمات کے لحاظ سے بالکل واضح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (یوسف ۱۲:۱۰۸) ''اے نبیؐ ان سے کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں''۔ چنانچہ راستہ روشن ہے۔ دعوت الی اللہ کا مفہوم واضح ہے، بصیرت موجود ہے، ذمہ داری متعین ہے، تزکیہ نفس یقینی ہے اور کفر و شرک کے شائبے سے دوری ان سب کی بنیاد ہے۔

یہ عام بنیادی اصول ہیں جو کہ تمام داعیان دین، مصلحین امت اور علما و فقہا کے درمیان قدر مشترک ہیں، لیکن ان کی روشنی میں کچھ خاص اصول متعین کرنے کی ضرورت ہے جن کے ذریعے سدالذراع کے دائرے میں رہ کر باریک بینی اور اعتماد کے ساتھ اپنے اہداف کی طرف پیش قدمی کا طریق کار متعین کیا جاسکے، اور اندھیرے میں تیر چلانے والوں کے لیے غلط تاویلات کا دروازہ بند کیا جاسکے، جو کہتے ہیں کہ جب اسلام موجود ہے تو پھر لوگوں کو اسلام کا جدید فہم حاصل کرنے کی تجویز دینے کا کیا مطلب؟ جب اسلام کے اصول و مبادی بدیہی طور پر دین کا حصہ ہیں تو پھر اس پر نظر ثانی اور نئی کانٹ چھانٹ کی کیا ضرورت ہے جس کو تم اپنے کارکنان کے لیے معیار قبولیت بناتے ہو۔ ان تمام سوالات کا جواب نہایت سیدھا اور آسان ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فکر و تدبر اور زمین و آسمان کی پیدایش میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ خود اسلام نے ہمیں اجتہاد و تجدید کی طرف بلایا ہے۔

جن قابل ذکر مسائل میں نظر ثانی اور تجدید کی ضرورت ہے ان میں ایک مسئلہ وہ اصول و مبادی ہیں جن کا بنیادی تعلق میدان دعوت سے متعلقہ مسائل سے ہے، تاکہ ایسے مشترکہ اصول وضع کیے جاسکیں جو تمام مسلمانوں کے لیے ایک مشترک فکری پس منظر قائم کرسکیں۔

اگر پوری دنیا کے مسلمان قرآن پاک کو ایک درست اور مقدس قانون کے طور پر تسلیم کرتے اور مانتے کہ: لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۴۱)

''باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے'' تو پھر خود زمانے کے افکار و نظریات کی تصحیح و ترمیم کے لیے کچھ مشترکہ اصول وضع کرنے ہوں گے، اور ایسے متفقہ قواعد و ضوابط مرتب کرنے ہوں گے جن کے ذریعے اسلام کو سمجھا جاسکے۔ دعوت کا آغاز اس اصول کے تحت کیا جائے کہ علما دین کا اجماع حجت قاطع ہے اور ان میں اختلاف کی صورت میں فیصلہ کن حیثیت قرآن کو حاصل ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○ (النساء ۴:۶۵) ''نہیں اے محمدؐ، تمھارے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو، اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ اسے پوری طرح تسلیم کرلیں''۔

امام حسن البنا ارشاد فرماتے ہیں: ''میں چاہتا ہوں کہ اس وضاحت کو پرکھنے کے لیے میں ایک معیار مقرر کروں۔ میری کوشش ہوگی کہ بات آسان اور سلیس زبان میں ہو اور قاری کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، اور اُمت اسلامیہ میں سے کوئی بھی میری اس بات سے اختلاف نہیں کرے گا کہ وہ معیار اللہ کی کتاب ہے، جس کے سرچشمے سے ہم سیراب ہوتے ہیں اور جس کی حکمت و دانائی کی طرف ہم رجوع کرتے ہیں۔''

امام حسن البنا نے اسلام اور اسلامی دعوت کو سمجھنے کے لیے قرآن پاک ہی کی مدد سے مراحل کا تعین کیا اور انھیں ۲۰ اصولوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے ان اصولوں کو دو اہداف کے حصول کے لیے تمام مسلمانوں کے مابین قدر مشترک قرار دیا ہے:

۱- روز بروز بڑھتے اور شدت اختیار کرتے ہوئے اختلافات سے اجتناب۔

۲- ایک ایسی دینی قیادت کی تشکیل، جس کی طرف اسلامی امور میں رجوع کیا جاسکے۔

یہ ایک ایسی کوشش ہے جس کی صحت اور وقعت تاریخ نے ثابت کردی۔ یہ اتحاد بین المسلمین کی طرف ایک اہم پیش رفت ہے جس پر بالاجماع تمام مسلمان متفق ہیں۔ یہ دوریاں ختم کرتی ہے، ایسے آسان راستوں کی نشان دہی کرتی ہے جس کے ذریعے ہم عقائد، اصول اور سیاسی اجتہادات کے حوالے سے موجود نظریات کی درستی اور ان کا صحیح فہم و ادراک کرسکیں۔

یہ '۲۰ اصول' اتنے مشہور ہو چکے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان تہذیبی یک جہتی کے دستور کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ لہٰذا ان کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان اصولوں کے اصل مصدر رسالۃ التعالیم اور خاص طور پر محمد الغزالی اور یوسف القرضاوی کی تحریروں کا حوالہ دینا کافی سمجھتا ہوں۔ تاہم اپنے موقف کی وضاحت کے لیے بعض مقامات کی طرف صرف اشارہ کروں گا۔

امام حسن البنا فرماتے ہیں: ''اسلام ایک ہمہ گیر نظام ہے جو زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے، چنانچہ وہ ریاست وحکومت کے معاملات میں بھی دخل دیتا ہے اور تعمیر وطن وتشکیل امت کی ذمہ داری بھی اپنے سر لیتا ہے۔ وہ اخلاق وکردار اور شفقت ورحمت کا مظاہرہ بھی کرتا ہے اور علم وثقافت اور قانون وعدل کا انتظام بھی کرتا ہے۔ وہ کسب مال اور دولت وثروت کی راہیں بھی متعین کرتا ہے۔ یہ ایک دعوت، ایک نظریہ، ایک جہاد اور لشکر بھی ہے اور ایک سچا عقیدہ اور عبادت بھی ہے''۔ گویا اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔

دعوت کے مشترکہ اہداف: یہ ہے اسلام کی اصل حقیقت، جو اللہ کا نازل کردہ دین ہے، زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ عملیت پسند اور متوازن ہے اور ہر زمانے اور ہر جگہ ہر انسان کے لیے قابلِ عمل ہے۔ اصل مسئلہ ان کُلی اصولوں کے سمجھنے کا ہے کہ کس طرح ہم ان سے فروعی مسائل اخذ کر سکتے ہیں اور کس طرح ہم تدریج کے ساتھ ان سے شرعی احکام کے نفاذ کے لیے جزئیات اخذ کر سکتے ہیں؟

اس کے جواب میں امام شہید نے فرمایا: ''قرآن کریم اور سنت مطہرہؐ، اسلامی احکام کے سمجھنے میں تمام مسلمانوں کے لیے مرجع ہے، اور قرآن بغیر کسی مشکل کے سمجھا جاسکتا ہے، جب کہ سُنت نبوی کے مطالب سمجھنے کے لیے بااعتماد ماہرین حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ پھر اس بنیادی اصول سے کئی ضوابط نکلتے ہیں:

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں ہے۔

— سلف نے اپنے دور میں اجتہاد کیا، اس میں جو کچھ قرآن وسنت کے موافق ہے اسے ہم قبول کریں گے اور جو مخالف ہے اسے رد کریں گے، تاہم ان پر طعن وتشنیع نہیں کریں گے۔

— ہر عالم کا حق ہے کہ وہ قواعد وضوابط کے مطابق اجتہاد کرے۔ جو لوگ عالم نہیں ہیں

وہ ائمہ دین میں سے کسی کا اتباع کریں گے، اور خود بھی کوشش کریں گے کہ کسی شرعی قاعدے کی مخالفت سے بچتے ہوئے احکام کے دلائل معلوم کریں۔

— فقہا کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کریں اور اختلاف و تفرقہ کے مسائل سے بچیں، خواہ وہ نص کے ظاہری معنی مراد لیں یا مقاصد شریعت کی روح کو مدنظر رکھیں۔

— عقیدہ عمل کی بنیاد ہے، نیت اعمال سے زیادہ اہم ہے، تاہم دونوں میں کمال حاصل کرنے کی کوشش مطلوب ہے۔

— ان معاملات میں اجتہادی رائے قابل احترام اور قابل عمل ہے کہ جن کے بارے میں کوئی صریح نص موجود نہ ہو یا نص تو موجود ہو، لیکن اس میں مختلف معانی کا احتمال ہو اور جس کا مقصد مصالح عامہ کا حصول ہو۔ تاہم اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ کسی شرعی قاعدے سے متصادم نہ ہو اور عرف و عادت اور زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

— فقہی اختلافات کو تفرقہ بازی کے لیے وجہ جواز نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ اخوت و محبّت اور باہمی تعاون کی فضا میں فقہی اختلافات میں بحث وجستجو کرنا عبادت ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ حقیقت تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔

— ہر وہ مسئلہ جس کا تعلق عمل سے نہیں، اس میں وقت صرف کرنا صحیح نہیں ہے۔ غلط 'عرف' شرعی الفاظ کی حقیقت کو نہیں بدل سکتا۔ شریعت میں چیزوں کے نام نہیں ان کی حقیقت معتبر ہے۔

— یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی مسلمہ سائنسی حقیقت شریعت کے کسی قاعدے سے متصادم ہو، جو چیز قطعی ہو وہ ظنی پر مقدم ہے اور تصادم کی صورت میں شرعی اصول کا اتباع مقدم ہوگا۔

— اسلام عقل کو وہم اور خرافات سے آزاد کرتا ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ حدیث نبویؐ ہے: علم و حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہے۔ جہاں کہیں بھی اسے ملے وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔ (ترمذی)

یہ بنیادی اصول امام حسن البنا کی فکر کے واضح پیمانے ہیں۔ امام حسن البنا شروع ہی سے اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ اصل مسئلہ جو اسلام اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہے، وہ مقاصد شریعت کے صحیح فہم کا نہ ہونا اور ان بنیادی اصولوں کے معیار کا فقدان ہے۔ حسن البنا شہید نے اپنے

۲۰ اصولوں میں ان باتوں کی وضاحت کی ہے۔ چھٹی سالانہ کانفرنس سے خطاب میں یہ کہتے ہوئے اس پر مہر تصدیق ثبت کی کہ: ''میرے بھائیو! اچھی طرح سے جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے اوپر احسان کیا اور تمھیں اسلام کا صحیح اور وسیع تر مفہوم عطا کیا جو زمانے کو ساتھ لے کر چلتا ہے، تمام امتوں کی ضروریات کو پورا کرتا ہے، اور لوگوں کو خوشی فراہم کرتا ہے۔ جو جمود، اباحیت اور فلسفیانہ پیچیدگیوں سے پاک ہے، جس میں کوئی افراط و تفریط نہیں ہے، جو قرآن و سنت اور سلف صالحین کی سیرت سے منصفانہ طریقے سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ ایک سچے مومن کے دل سے تم نے اسے قبول کیا اور اسی سے آپ نے عقیدہ و عبادت، وطن و شہریت، حکومت و قوم، قرآن و تلوار اور اللہ کی سرزمین پر مسلمانوں کی نیابت کی پہچان حاصل کی''۔

○ **نصب العین:** امام حسن البنا نے بنیادی طور پر صرف ایک ہی ہدف کو اپنا نصب العین بنایا جو باقی تمام متعلقہ اہداف کا سرچشمہ ہے۔ وہ تمام آرزوئیں اور خواہشات اس سے خارج ہو جاتی ہیں، جو انفرادی اور اجتماعی طور پر انسانی زندگی کو لاحق ہوتی رہی ہیں۔ بنیادی ہدف کو بالکل واضح، بلند اور محبوب ہونا چاہیے۔ اسے صرف وہ حاصل کرسکتا ہے جو اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لے اور اس کے لیے اپنے دل میں اخلاص پیدا کرلے۔ وہ پہلے مرحلے میں لوگوں کو اللہ سے جوڑے اور دوسرے مرحلے میں اپنی آرزوؤں کو جنت کے لیے مؤخر کرے۔ یہ بلند نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے، جس کے لیے امام حسن البنا نے تگ و دو کی، اسے اپنا شعار بنایا اور لوگوں کو دعوت دی کہ اس کو اپنے نفس اور اپنی زندگی میں عمل میں ڈھال دیں تاکہ وہ اللہ والے بن جائیں۔ اخوان المسلمون نے اس ہدف کو امام کی زندگی میں اور ان کی شہادت کے بعد اپنے متفقہ نعرے ''اللہ ہمارا مقصود ہے'' کے ذریعے دوام بخشا۔ چنانچہ امام کی زندگی ہی میں انھوں نے بھرپور جرأت اور اعتماد کے ساتھ اپنے زوردار نعروں کے ذریعے زمین کو ہلا کر رکھ دیا، جو محض نعرے نہیں تھے بلکہ یہ ایک قابل تنفیذ پروگرام اور قابل عمل رویہ ہے۔

یہ ایسا قول فیصل ہے جو اخوان المسلمون کو تمام جماعتوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ نصب العین کتنا واضح ہے، جو اخوان المسلمون کی پہچان بن چکا ہے۔ اخوان کے کارکن اسی کو سامنے رکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اسی کو حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں،

اور بانیِ جماعت کی ہدایات کے مطابق اسی کے گرد جمع ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ انھوں نے اپنے قریبی ساتھیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ: ''ہم کیا چاہتے ہیں؟'' اور پھر خود ہی اخوان کے واضح طریق کار کے مطابق جواب دیا: ''کیا ہم مال و دولت چاہتے ہیں جو سایے کی طرح عارضی ہے، یا ہم دنیا کے جاہ وجلال کے طلب گار ہیں، یا ہم زمین کے اوپر حکمرانی اور سلطنت چاہتے ہیں، حالانکہ یہ زمین اللہ کی ہے اور يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ط (اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ الاعراف ۷:۱۲۸)، جب کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سامنے رکھتے ہیں: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (القصص ۲۸:۸۳) ''وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے''۔ اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ ہم اس دنیا اور اس کے جاہ و جال سے کچھ نہیں چاہتے، نہ ہم اس کے لیے کام کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف دعوت دیتے ہیں بلکہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ آپ کے سامنے صرف دو اہداف ہیں:

۱- ایک یہ کہ اسلامی ممالک ہر بیرونی تسلط سے آزاد ہو جائیں۔ یہ ہر انسان کا فطری حق ہے، جس کا انکار کوئی ظالم و جابر آمر ہی کر سکتا ہے۔

۲- دوسرا یہ کہ اس آزاد وطن میں ایک آزاد اسلامی سلطنت قائم ہو جو اسلام کے احکام پر عمل کرے، اس کے اجتماعی نظام کو نافذ کرے، اس کے راست اصولوں کا اعلان کرے اور اس کی حکیمانہ دعوت کو تمام لوگوں تک پہنچائے۔ جب تک یہ حکومت قائم نہیں ہوگی تمام مسلمان گنہگار رہوں گے اور اس کے قیام کے سلسلے میں کوتاہی و لاپروائی پر اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہوں گے''۔

''ہماری دعوت کے دو نکتے روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں: وطن کی آزادی اور اسلامی مملکت کا قیام''۔ اس کے بعد امام حسن البنا اپنے طریقۂ کار کے مراحل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ہم چاہتے ہیں کہ پہلے ایک مسلم فرد، پھر مسلم گھرانا اور مسلم قوم پیدا ہو۔ پھر ایک مسلم حکومت قائم ہو اور پھر ایک ایسی مملکت وجود میں آئے جو تمام اسلامی حکومتوں کی قیادت کرے، بکھرے ہوئے مسلمانوں کو یک جا کر کے انھیں ان کا کھویا ہوا مقام واپس دلا دے اور ان کی غصب شدہ

زمین اور چھینے ہوئے علاقے بازیاب کرائے۔ پھر وہ جہاد اور دعوت الی اللہ کا علم بلند کرے تاکہ پوری دنیا اسلام کی تعلیمات سے بہرہ مند ہو جائے۔"

اخوان المسلمون کا بنیادی ہدف لوگوں کو اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی عبادت، جس کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں، کے ذریعے سے اللہ کی رضا تک پہنچانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ○ (ذاریات ۵۱:۵۶) "میں نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے"۔ اور عبادت کا حق ادا کرنے کے لیے تعمیر وطن اور ہر طاغوت سے اس کی آزادی ضروری ہے، تاکہ لوگ اللہ سے جڑ سکیں اور انھیں ایمان باللہ اور اعمالِ صالحہ پر اُبھارا جاسکے۔

یہ وسیع تر پیغام ہے جسے اخوان تمام لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ امام البنا نے اس پیغام کا دو مختصر جملوں میں خلاصہ پیش کیا:

۱- اُمت کو تمام سیاسی پابندیوں سے نجات دلانا تاکہ اسے مکمل آزادی حاصل ہو جائے۔

۲- اُمت کی تشکیل نو کرنا، تاکہ وہ دیگر اقوام کے اندر رہ کر آگے بڑھے اور معاشرتی بلندیوں کو حاصل کرنے میں اُن کا مقابلہ کرے۔

یہ دونوں جزو لازم و ملزوم ہیں۔ تعمیر تو اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سابقہ عمارت کو گرایا نہ جائے، مثلاً ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے غیر اللہ کا انکار کرنا ضروری ہے۔ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ (البقرہ ۲:۲۵۶) "جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے"۔ لہٰذا تعمیر سے پہلے آزادی ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ امام حسن البنا ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اخوان کے کارکنان نے ایک امر بدیہی کے طور پر اسے حفظ کرلیا اور اسی کو عملی جامہ پہنانے کی تگ و دو کرتے رہے۔ امام حسن البنا نے اپنے رسالے اَلٰی اَیِّ شَیءٍ نَدعُو النَّاس؟ (ہم لوگوں کو کس چیز کی دعوت دیتے ہیں) میں اجمالاً اسی کا تذکرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں: "ہمارا کام اجمالی طور پر یہ ہے کہ ہم مادیت، اباحیت اور الحاد کے سیلاب کی بے رحم موجوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہوں، جو ملت اسلامیہ کی وحدت کو بہالے گئی ہیں اور اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت اور قرآن کی ہدایت سے بھی محروم کردیا ہے"۔

اسی مضمون کو اپنے دوسرے رسالے تحت رایۃ القرآن (پرچمِ قرآن تلے) میں جگہ جگہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ اس میں انھوں نے اخوان کے اصول، اہداف، وسائل اور کامیابی کے مختلف مراحل کا ذکر کیا اور یوں مسلم فرد سے لے کر اسلامی خلافت کے قیام تک کے خلا کو پُر کر دیا۔ اس طویل وضاحت کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا: ''یہ وہ پیغام ہے جو اخوان المسلمون لوگوں تک پہنچانا چاہتی ہے۔ وہ امت مسلمہ سے اپیل کرتی ہے کہ اسے بھی یہ سمجھنا چاہیے اور پرعزم ہو کر اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کو اخوان المسلمون نے اپنی طرف سے نہیں بنایا، بلکہ یہ وہی پیغام ہے جو قرآن کی ہر ہر آیت میں نظر آتا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث میں نمایاں ہے، قرونِ اولیٰ کے مسلمان جو اسلام کے فہم اور نفاذ کا اعلیٰ نمونہ تھے، اُن کے ہر ہر عمل سے مترشح ہوتا ہے۔ اگر مسلمان اس پیغام کو قبول کریں گے تو یہ صحیح ایمان و اسلام کی نشان دہی ہوگی اور اگر انھیں اس میں کوئی نقص یا عیب نظر آئے تو پھر اللہ کی کتاب ہمارے درمیان قولِ فیصل ہوگی۔ وہ عدل کے ساتھ ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان فیصلہ کرے گی۔ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا یا ہمارے خلاف، یہ معلوم ہو جائے گا: رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۝ (اعراف ۷:۸۹) ''اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما۔ یقیناً تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے''۔

چھٹے اجتماع عام میں امام حسن البنا نے بنیادی مقصد (اللہ ہمارا مقصود ہے) کو دو ذیلی اہداف میں تقسیم کیا، جس پر عمل کر کے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا: ''اخوان المسلمون دو مقاصد کے لیے کام کرتی ہے۔ ایک مقصد قریب ہے جس کے ثمرات اخوان میں شامل ہوتے ہی نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں یا اخوانیت اس کے اندر نظر آنے لگتی ہے۔ ایک مقصد دور ہے جس کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے، اور جس کے لیے پہلے تربیت اور اچھی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ قریب کا مقصد ہر قسم کی عام نیکیوں میں حصہ لینا اور حالات کے مطابق سماجی خدمات انجام دینا ہے۔ اخوان المسلمون کے ساتھ جیسے ہی کوئی منسلک ہوتا ہے تو اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ:

اپنے نفس کو پاک اور اپنے رویے کو درست کرے۔ روح، عقل اور جسم کو ایک لمبے جہاد کے لیے تیار کرے۔

— اس دعوت کو اپنے خاندان، دوستوں اور معاشرے میں عام کرے۔ کوئی بھائی اس وقت تک صحیح مسلمان نہیں بن سکتا جب تک وہ اسلام کے احکام و اخلاق پر عمل نہ کرے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ان حدود سے تجاوز نہ کرے جو رسولؐ اللہ نے مقرر فرمائی ہیں۔

''میرے بھائیو! کیا تحریک اخوان صرف یہ چاہتی ہے؟ نہیں، بلکہ یہ تو اخوان کے مقاصد کا ایک جزو ہے جس کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کرنا مقصود ہے۔ یہ تو ہمارا چھوٹا سا ہدف ہے کہ نیکی و اطاعت میں اپنا وقت صرف کریں اور مکمل اصلاح اور مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مناسب حالات کا انتظار کریں''۔

''اخوان المسلمون کوشش کرتی ہے کہ نظام مملکت کو نیک حکمرانوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اسلامی خلافت کا احیا کیا جائے اور اسلام کے احکام کو نافذ کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الجاثیۃ ۴۵:۱۸) ''اس کے بعد اب (اے نبیؐ) ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہ راہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کو خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے''۔

امام حسن البنا نے اپنی دعوت کی بار بار وضاحت کرنے سے کبھی بھی اکتاہٹ کا اظہار نہیں کیا، تاکہ یہ اہداف کارکنان کے ذہنوں میں راسخ ہو جائیں اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے مسلسل اس کے ساتھ وابستہ رہیں، کیونکہ وابستگی ہی اہداف کو حاصل کرنے کا راستہ ہے اگرچہ دسیوں سال بعد ہو۔

بانیِ اخوان کے پیش نظر اہداف یہ ہیں: ○ بنیادی ہدف: اللہ ہمارا مقصود ہے ○ مقصد قریب: اسلامی جماعت کا قیام۔ ○ مقصد بعید: وطن اسلامی کو ہر بیرونی تسلط سے آزاد کرانا، اسے پھر سے اللہ تعالیٰ سے جوڑنا، اور اس تیاری کے بعد وہ اُمت خیر کو تشکیل دینا جس کی بشارت قرآن نے پہلے ہی دے رکھی ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (اٰل عمرٰن ۳:۱۱۰)

○ **وسائل و ذرائع:** اخوان کے وسائل بھی بالکل واضح اور غیر مبہم ہیں۔ امام حسن البنا فرماتے ہیں: ''ہمارے عام وسائل یہ ہیں کہ ہم لوگوں تک اپنی دعوت پہنچا کر انھیں قائل کرتے ہیں۔ تمام ممکنہ وسائل تبلیغ سے اپنی دعوت کو پھیلاتے ہیں، تاکہ رائے عامہ اسے سمجھے اور عقیدہ وایمان کے ساتھ اس کا ساتھ دے۔ پھر قوم سے نیک اور صالح لوگوں کو چن کر انھیں اس فکر کا مضبوط ستون بناتے ہیں۔ پھر دستوری جنگ شروع کرتے ہیں تاکہ اس دعوت کی گونج سرکاری ایوانوں تک پہنچے۔ وہاں سے اس کی تائید میں آواز بلند ہو جائے اور وہ لوگ بھی اس راستے میں شامل ہو جائیں جو قانون نافذ کرنے کے ذمہ دار ہیں''۔

''اس بنیاد پر مناسب وقت آتے ہی اخوان کے امیدوار قانون ساز اسمبلیوں میں منتخب ہونے کے لیے الیکشن لڑیں گے اور چونکہ ہمارا مقصد صرف رضائے الٰہی حاصل کرنا ہے، اس لیے ہمیں اللہ کی مدد پر بھروسا ہے کہ ہمیں کامیابی ملے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ○ (الحج ۲۲:۴۰) ''اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقت ور اور زبردست ہے''۔

''اس کے علاوہ ہم کبھی کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کریں گے، الا یہ کہ ہمیں مجبور کیا جائے۔ ہمارا مقصد واضح اور راستہ متعین ہے۔ اس میں کوئی ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے۔ ہم اپنے اس کام کے تمام نتائج کے لیے تیار ہیں۔ ہم کسی دوسرے پر اس کا بوجھ نہیں ڈالیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے لیے جو اجر وثواب ہوگا وہی بہتر اور پایدار ہے۔ حق کے راستے میں فنا ہونا دراصل بقا ہے۔ دعوت بغیر جہاد کے ممکن نہیں اور جہاد بغیر مشقت کے نہیں ہوتا۔ اس انداز سے کام کرنے پر کامیابی ہمارے قریب ہوگی اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہماری حالت پر صادق آئے گا: پہلے پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا کہ وہ مدتوں نصیحت کرتے رہے اور لوگوں نے سن کر جواب نہ دیا یہاں تک کہ پیغمبر، لوگوں سے مایوس ہو گئے، تو یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ پھر جب ایسا موقع آجاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جاسکتا۔ (یوسف ۱۲:۱۱۰)

پس دعوت وتبلیغ اور منظم جدوجہد اخوان کے اہم ظاہری وسائل ہیں۔ ہم ان وسائل کے

ذریعے اپنے اعلیٰ مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کو مطمئن اور قائل کر کے ان کے ذریعے ملکی قیادت کے لیے ایسے اہل ذمہ داروں کا انتخاب ممکن بنائیں جو معاشرے کی تعمیر و تربیت کی ذمہ داری ادا کرسکیں اور لوگوں کو اصلاح کی تین بنیادوں پر جمع کرسکیں:

— اصلاح و ترقی کا درست طریق کار
— اس طریق کار پر یقین رکھنے والے افراد کی تنظیم
— ایسی باکردار قیادت کی تشکیل، جو ادارہ چلانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو اور دعوت کے لیے مطلوب نرمی سے بھی مزین ہو اور سختی و تشدد اور افراط و تفریط سے اجتناب کرتی ہو۔

امام حسن البنا نے ہماری دعوت نئے مرحلے میں ہے میں فرمایا ہے: ''طاقت اور تشدد ہمارا ذریعہ و وسیلہ نہیں ہے۔ حق کی دعوت براہ راست روح کو مخاطب کرتی ہے، دلوں کے ساتھ مناجات کرتی ہے، اور دل کے بند دروازوں پر دستک دیتی ہے۔ یہ دعوت کبھی بھی زبردستی کسی کے دل میں جگہ نہیں پیدا کرسکتی۔ جو لوگ جماعتوں کی تاریخ جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ ایمان و عمل صالح اور اخوت و محبت ہی وہ بنیادیں ہیں جنھیں دعوت کو مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان وسائل کو اخوان کے تین نعروں میں بھی بیان کیا گیا: پختہ ایمان، بہترین تربیت، جہد مسلسل''۔ یہ منشور حسن البنا کے کتابچے بین الأمس و الیوم (آج اور کل) سے لیا گیا ہے۔

بعد میں اس کے ساتھ ایک اور وسیلے 'اخوت و محبت' کا اضافہ کیا گیا، تاکہ تربیت کے ارکان اور دعوتی سرگرمیوں کے وسائل کی تکمیل ہوجائے۔ ان وسائل کے دقیق مطالعے سے دو پہلو قابل غور نظر آتے ہیں:

۱- ہر پُرامن طریقے سے دعوت عام کرنا، اس کے لیے لٹریچر، تبلیغ، وعظ و نصیحت اور خطابت و اعلان کو ذریعہ بنانا تاکہ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچایا جاسکے اور اس کے مقاصد و اہداف کی وضاحت ہوجائے۔

۲- رفاہِ عامہ کے کاموں میں حصہ لیتے ہوئے معاشرتی اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے دعوت کو عام کرنا۔ اس کے لیے مختلف فلاحی ادارے، مدارس، سکول، ہسپتال اور مساجد وغیرہ قائم کرنا تاکہ دین کا تصور ہر شعبۂ زندگی پر محیط ہوسکے۔ اس طرح رائے عامہ کو اخوان المسلمون کی دعوت،

اس کے پروگرام اور اغراض و مقاصد سے متفق اور معاون و مددگار بنایا جائے۔

اس سے یہ واضح ہوگیا کہ ہر ممکن اور جائز وسائل سے استفادہ کرنا اخوان کا امتیازی وصف ہے جو وہ داخلی اور خارجی وسائل سے حاصل کرے گی۔ داخلی وسائل سے مراد جماعت کی اندرونی قوت، بہترین نظام کار اور وہ مضبوط حصار ہے جو اسے ہر قسم کے طوفان و سیلاب سے بچائے، جب کہ خارجی وسائل میں عوام سے مضبوط تعلق کی بنیاد پر ہر حالت میں صداے حق بلند کرنا ہے:

— دستوری اور سیاسی جدوجہد کرنا، تاکہ اس دعوت کی آواز سرکاری ایوانوں تک پہنچ جائے، جب کہ ملک کے قانونی اور آئینی ادارے بھی اسے قبول کریں اور عوام بڑے پیمانے پر اس کے ہمدرد بنیں۔

— اس دعوت کی حمایت کے لیے شرعی قواعد و ضوابط کے دائرے میں رہتے ہوئے جہاد کیا جائے۔ یہ اس صورت میں ہوگا کہ جب لوگ اس دعوت کے راستے میں حائل ہوں اور اللہ کے راستے سے لوگوں کو منع کریں۔ امام حسن البنا نے جہاد کو چھے مراتب میں تقسیم کیا ہے۔ انھوں نے التعـــالیم میں فرمایا ہے کہ: جہاد کا پہلا مرتبہ دل کا انکار ہے اور آخری مرتبہ قتال (مسلح جدوجہد) فی سبیل اللہ ہے۔ اس کے درمیان والے درجے زبان، قلم اور ہاتھ کے ذریعے جہاد اور جابر و ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنا ہیں۔

جہاد کے مختلف درجات ہیں: سب سے پہلے عقیدہ و ایمان کی قوت پیدا کرنا، پھر وحدت و یگانگت کی قوت حاصل کرنا اور پھر فوجی اور اسلحے کی قوت پیدا کرنا۔ اگر یہ تمام اوصاف موجود نہ ہوں تو کسی جماعت کو طاقت ور جماعت نہیں کہا جاسکتا۔ داخلی اور خارجی وسائل کے بارے میں امام حسن البنا کی تمام تفصیلات کا نچوڑ چار نکات میں واضح ہوجاتا ہے: • دعوت و تبلیغ • تعلیم و تربیت • نشرواشاعت • طاقت و جہاد۔

پانچویں اجتماع عام کے خطاب میں انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''اخوان اتنے ظاہر بین اور سطحی نہیں ہیں کہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکیں اور نتائج کا اندازہ نہ کرسکیں''۔ امام حسن البنا نے اس قول کے ذریعے اجتہاد کی دعوت دی اور کارکنان کو متوجہ کیا ہے کہ حالات اور زمانے کو مدنظر رکھ کر اس کی مناسبت سے نئے وسائل ایجاد کیے جاسکتے ہیں، بجاے اس کے کہ سایے میں بیٹھ کر

چھت اور اس کے نقش و نگار سے لطف اٹھائیں۔ اگر ہر قسم کی قوت و طاقت حاصل ہو جائے اور کامیابی کے امکانات مکمل طور پہ واضح ہوں، تب بھی ہمیں اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر تمام قوتیں کھپا دینی چاہییں۔ ساتھ ہی ساتھ اسلامی آداب و احکام کی پابندی بھی لازم ہے۔

امام حسن البنا نے اسی اجتماع میں فرمایا کہ: ''کیا اسلام نے ہر حال میں قوت کے استعمال کا حکم دیا ہے، یا اس کے لیے کچھ حدود و قیود متعین کی ہیں؟ کیا طاقت کا استعمال پہلا ذریعہ اور وسیلہ ہے، یا سب سے آخری حربہ ہے؟ کیا یہ ضروری نہیں کہ انسان طاقت کے استعمال کے اچھے بُرے نتائج کا موازنہ کرے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کا جائزہ لے؟ یا اس کا فرض ہے کہ وہ بہرصورت قوت کا استعمال کرے اور کہے کہ بس اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا؟''

''یہ سوالات انتہائی آسان، عام فہم اور لوگوں تک پہنچانے میں نہایت آسان ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- اسلام ایک مضبوط دین ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہر نوع اور ہر قسم کی قوت پیدا کریں، وہ قوت جو معروف ہے اور وہ بھی جو معروف نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ (الانفال ۸:۶۰)، یعنی ہر قسم کی جائز اور ممکن قوت و طاقت کو حاصل کرو۔

۲- اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ ہم ہر کام کو سنجیدگی سے لیں اور اسے حق، دلیل، بلاغت، بیان، اتحاد، ایمان اور اسلحے و بازو کی طاقت سے تقویت دیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تواضع، عجز و انکساری کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ طاقت کا مطلب جدوجہد کرنا اور متانت و ذمہ داری ہے۔ یٰاَیَحیٰ خذ الکتاب بقوۃ کا یہی مطلب ہے۔

۳- اگر مسلمانوں (جماعت) کو طاقت کے استعمال پر مجبور کیا گیا تو اس صورت میں بھی عرف و عادت، زمانے اور حالات کے مطابق شریعت کے قواعد و ضوابط اور حدود و قیود کی پابندی لازمی ہوگی۔ اور اس قوت کو اپنے مقاصد کے حصول اور اللہ کے حقوق کی پاس داری کے لیے حکیمانہ انداز میں استعمال کرنا ہوگا۔

۴- طاقت خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اس کی طرف اس وقت رجوع کیا جائے گا، جب

دیگر تمام ذرائع ناکام ہو جائیں، لہٰذا اس کا استعمال آخری حربہ ہونا چاہیے۔ طبیب مریض کا علاج اس وقت جراحت سے نہیں کرتا ہے جب تک علاج کے دیگر طریقوں سے مایوس نہ ہو جائے۔

۵-ضرورت کے وقت طاقت کے استعمال اور عدم استعمال کے درمیان موازنہ کرنا، اس کے منفی و مثبت اثرات کا جائزہ لینا، اس کے استعمال کے جواز و عدم جواز وغیرہ پر غور کرنا، یہ ساری چیزیں جاننا انتہائی ضروری ہے"۔

امام حسن البنا کے سامنے یہ ساری چیزیں روز روشن کی طرح عیاں تھیں۔ یہ ان کی واضح راے ہے، تاکہ طاقت فساد کا ذریعہ نہ بنے، اور ہمارا کام تعمیر ہے تخریب نہیں۔

خلاصہ: اس پوری بحث کو امام حسن البنا شہید کے رسالے اخوان قرآن کے سایے تلے کے کچھ اقتباسات سے سمیٹتا ہوں۔ امام نے اس رسالے میں کہا ہے کہ: "میرے بھائیو! ہم کوئی سیاسی جماعت نہیں، اگرچہ اسلام کے قواعد و ضوابط کے مطابق سیاست ہماری فکر کا حصہ ہے۔ ہم محض فلاحی یا خیراتی ادارہ بھی نہیں ہیں، اگرچہ رفاہی و فلاحی کام ہمارے اولین مقاصد میں شامل ہیں۔ ہماری جماعت کوئی کھیل کی ٹیم بھی نہیں ہے، اگرچہ جسمانی و روحانی ورزش ہمارے اہم ترین وسائل میں سے ہے۔ ہمارا اس قسم کی تنظیموں سے کوئی واسطہ نہیں، ان کے اغراض و مقاصد کسی ایک بات پر مرتکز ہوتے ہیں، بلکہ کبھی تو اس طرح کے اداروں کا قیام محض ذاتی خواہشات پر مبنی ہوتا ہے یا پھر نام پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

"ہم تو ایک نظریے اور عقیدے کو لے کر اٹھے ہیں۔ ہم ایک نظام اور طریق کار پر چل رہے ہیں۔ ہمارا کام کسی ایک موضوع یا کسی ایک قومیت تک محدود نہیں ہے۔ یہ دعوت کسی قسم کی جغرافیائی حدود کی پابند نہیں ہے اور نہ یہ کسی واقعے کے نتیجے میں ختم ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے"۔

"ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں۔ ہم ان کے بعد ان کی دعوت کا جھنڈا بلند کرنے والے ہیں۔ ان کی دعوت کو عام کرنے والے ہیں جس طرح انھوں نے قرآن کی حفاظت کی، اسی طرح ہم قرآن کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یہ ہمارا واضح نظریہ ہے۔ یہی ہمارے اصول ہیں۔ یہ ہمارا ہدف ہے اور جائز حدود کے اندر رہ کر یہ ہمارے مختلف وسائل ہیں۔

ان میں سے جو ناقابلِ تغیر ہیں وہ اساسیات ہیں، ان سے ہم ہٹ نہیں سکتے، اور جو قابلِ تغیر ہیں اس میں اجتہاد کر کے اسے شرعی مقاصد اور شرعی قوانین کی خدمت کے لیے استعمال کریں گے۔

ہمارا پہلا اور آخری مقصد دو بنیادی باتیں ہیں:

۱- ایمان وعملِ صالح کے ساتھ دنیا کی امامت وسیادت۔

۲- آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے نتیجے میں خوش نودی اور جنت کا حصول۔

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ (النساء ۴:۶۹) وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیا اور صدیقین اور شہدا اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔

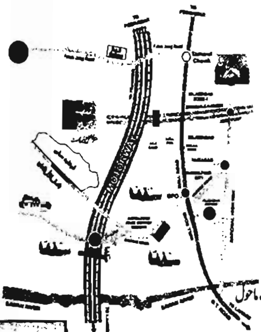
***

الصُفّہ ماڈل ٹاؤن

نزد قرطبہ سٹی (موٹر وے چکری انٹرچینج) انڈسٹریل زون راولپنڈی

محل وقوع

قرطبہ سٹی سے نزدیک بین الاقوامی معیار کے مطابق زیر تکمیل انٹرنیشنل ائرپورٹ سے قریب تر، چکری کے خوبصورت پہاڑوں کے دامن تلے کھلے اور پرفضا ماحول میں موٹر وے چکری انٹرچینج سے چند منٹ کی مسافت پر



خصوصیات

- کشادہ گلیاں اور سڑکیں، کالونی کا اپنا سکیورٹی سسٹم
- ہر سیکٹر کا علیحدہ پارک، خوبصورت پرفضا اور آلودگی سے پاک ماحول
- معاشرتی آلودگیوں سے پاک پاکیزہ اسلامی معاشرہ
- انڈسٹریل زون کی وجہ سے ملازمتوں کے مواقع
- تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کی بدولت اعلیٰ تعلیم کے زیادہ مواقع
- وقت کے ساتھ قیمتوں میں اضافہ کی بدولت منافع بخش سرمایہ کاری

سہولیات

- 24 گھنٹے ٹرانسپورٹ
- پانی، بجلی، فون
- کمرشل ایریا، مسجد، مدرسہ
- سکول، پارک، کلینک
- اسلامک سنٹر، لائبریری، ہسپتال

تمام رقوم بذریعہ چیک / ڈرافٹ / پے آرڈر بنام
محمد امین خان
کرنٹ اکاؤنٹ: 28-6475
حبیب بینک برانچ کمیٹی چوک مری روڈ راولپنڈی

برائے کرم ڈرافٹ / پے آرڈر کے پیچھے اپنا مکمل پتہ نام اور (رجسٹریشن نمبر آصفہ کیلئے) واضح درج فرمائیں۔ درخواست فارم ادارے سے مفت منگوائیں۔ نیز بینک سے ملنے والی رسید کی فوٹو کاپی ماہانہ قسط کے ساتھ ارسال کریں پہلے آئیے پہلے پائیے کی بنیاد پر بکنگ تیزی سے جاری ہے۔

نمائندگان کی فوری ضرورت ہے تحریکی ساتھیوں کو ترجیح دی جائیگی۔

آسان طریقہ ادائیگی

	پلاٹ سائز	ایڈوانس	ماہانہ قسط	کل قیمت
5 مرلہ	25 x 50	15000/-	2000/-	150,000/-
7 مرلہ	30 x 60	21000/-	2800/-	210,000/-
10 مرلہ	35 x 70	30,000/-	4000/-	300,000/-
ایک کنال	50 x 90	60,000/-	8000/-	600,000/-
کمرشل	1 سے 5 مرلہ تک	10%	فی مرلہ 7000/-	فی مرلہ [illegible]

یہ شیڈول 31 مئی 2007 تک قابل عمل ہے

پلاٹ کی قیمت میں ہر قسم ترقیاتی اخراجات شامل ہیں

الصُفّہ انٹرپرائزز

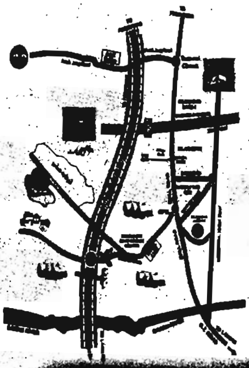
الھدیٰ سٹی

نزد قرطبہ سٹی (موٹروے چکری انٹرچینج) انڈسٹریل زون راولپنڈی

قرطبہ سٹی سے نزدیک بین الاقوامی معیار کے مطابق زیرِ تکمیل انٹرنیشنل ائرپورٹ سے قریب تر، چکری کے خوبصورت پہاڑوں کے دامن تلے کھلے اور پرفضا ماحول میں موٹروے چکری انٹرچینج سے چند منٹ کی مسافت پر

- کشادہ گلیاں اور سڑکیں، کالونی کا اپنا سکیورٹی سسٹم
- ہر سیکٹر کا علیحدہ پارک، خوبصورت پرفضا اور آلودگی سے پاک ماحول
- معاشرتی آلودگیوں سے پاک پاکیزہ اسلامی معاشرہ
- انڈسٹریل زون کی وجہ سے ملازمتوں کے مواقع
- تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کی بدولت اعلیٰ تعلیم کے زیادہ مواقع
- وقت کے ساتھ قیمتوں میں اضافہ کی بدولت منافع بخش سرمایہ کاری

- 24 گھنٹے ٹرانسپورٹ
- پانی، بجلی، فون
- کمرشل ایریا، مسجد، مدرسہ،
- سکول، پارک، کلینک
- اسلامک سنٹر، لائبریری، ہسپتال



5 مرلہ	25 x 50	15000/-	2000/-	150,000/-	15%	[illegible]
7 مرلہ	30 x 60	21000/-	2200/-	210,000/-	15%	[illegible]
10 مرلہ	35 x 70	30,000/-	4000/-	300,000/-	15%	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	15%	[illegible]

تمام رقوم بذریعہ چیک/ڈرافٹ/پے آرڈر

کرنٹ اکاؤنٹ: 1531-9

الائیڈ بینک لمیٹڈ آف پاکستان

چوہڑ ہڑپال برانچ راولپنڈی



3000 روپے فی مرلہ ایڈوانس 400 روپے فی مرلہ ماہانہ قسط

پلاٹ کی قیمت میں ممکنہ ترقیاتی اخراجات شامل ہیں

یہ شیڈول یکم مئی 2007 تک قابل عمل ہے

الھدیٰ ایسوسی ایٹس

موبائل 0345-9702560

مینیجنگ ڈائریکٹر

لاہور، اسلام آباد اور مری میں 14 رہائشی منصوبوں کی شاندار کامیابی کا حامل اور آپ کے کامل اعتماد کا مظہر

احباب گروپ آف کمپنیز

مستقبل میں اسلام آباد کا سیکٹر B-18، RDA اور CDA کے Development اصولوں کے عین مطابق

منظر کوہسار

(اسلام آباد)

قیمت صرف
150,000
روپے فی مرلہ

نوٹ: ہم فائلوں کا کاروبار نہیں کرتے

سیکٹر 1 میں کشادہ سڑکیں، پارکیں، سیوریج، واٹر سپلائی مکمل نیز کالونی میں 50 کنال کی خوبصورت جھیل و پارک بھی مہیا کی جائے گی۔

سیکٹر II کے ترقیاتی کام 80% مکمل اور سیکٹر III کے ترقیاتی کام تیزی سے مکمل کیے جا رہے ہیں۔

لوکیشن: راولپنڈی سے ٹیکسلا جاتے ہوئے مرگلہ ہلز سے بائیں طرف پٹرول پمپ کے ساتھ ڈسٹرکٹ کونسل روڈ پر ڈیڑھ کلومیٹر موٹروے انٹرچینج اور نئے ائیرپورٹ سے 8 کلومیٹر سنگ جانی ٹول پلازہ سے متصل بڈھانہ جھیل سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔

بکنگ: 20 ہزار روپے فی مرلہ کے حساب سے بقیہ ادائیگی 3 سال کی ماہانہ یا سہ ماہی اقساط میں بکنگ کے لئے ڈرافٹ بنام احباب ہاؤسنگ سوسائٹی پرائیویٹ لمیٹڈ اکاؤنٹ نمبر 966 بنک آف پنجاب وحدت روڈ لاہور بھیجیں۔

10،5 مرلہ اور ایک اور دو کنال کے صرف چند کینسل شدہ پلاٹ باقی (1 کنال = 500 مربع گز)

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی پرائیویٹ لمیٹڈ

15۔ نظام بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، مین وحدت روڈ، مقابل امتحانی سینٹر نیو کیمپس، لاہور

فون: 5418717, 5423295 ای میل: ahbab_group@hotmail.com

ایک قرآن، دو تلواریں

محمد تابعی ○

مرشد عام استاذ حسن البنا کو دو سالوں میں دو بار دیکھا۔ پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا جب وہ میڈیکل کے طلبہ کے ایک گروپ سے مخاطب تھے اور دوسری دفعہ جب وہ چند پڑھے لکھے نوجوانوں سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ دونوں مرتبہ سامعین نے ہنسی مذاق اور شور و شغب میں ان کی بات کو غیر مؤثر کرنا چاہا، لیکن وہ اس طرح محو گفتگو رہے کہ سننے والوں کے دل موہ لیے، بلکہ دلوں پر قبضہ جما لیا، یوں دونوں مواقع پر اپنے مخالفین پر چھا گئے۔

میں نے انھیں خاموشی سے غور و فکر کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے، اور گفتگو کرتے ہوئے بھی۔ دونوں حالتوں میں ان کے چہرے پر متانت و سنجیدگی کے گہرے نقوش عیاں اور کشادہ و روشن پیشانی پر فہم و فراست کی کرنیں جیسے پھوٹ رہی ہوں، جس کے درمیان کثرت سجود سے بن جانے والا سیاہی مائل نشان نمایاں نظر آتا ہے۔

ان کی آنکھیں مُقطّم (مصر میں ایک پہاڑ) کے چشموں کی طرح تھیں جنھیں تم کم گہرا سمجھتے ہو، مگر جب ان میں کوئی پتھر پھینکتے ہو تو وہ لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لڑھکنے کی آواز دیر تک آتی رہتی ہے، حتیٰ کہ آواز آنا بند ہو جاتی ہے مگر وہ پتھر لڑھکتا ہی رہتا ہے۔

○ محمد تابعی مصر کے بڑے معروف صحافی تھے۔ یہ مکالمہ اور خاکہ انھوں نے آخر ساعۃ (آخری گھڑی)' مارچ ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ یہ حسن البنا کے ادبی حسن و جمال اور لطافت و رعنائی خیال سے بھرپور خاکہ ہے۔ اس کی ادبی لطافتوں کو ترجمے میں منتقل کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ترجمہ: ڈاکٹر محمد اسحاق منصوری

ہمیشہ مسکراتے ہوئے' چاق و چوبند' کشادہ قد وقامت' ایسے مضبوط جیسے شاہ بلوط کا درخت۔ ان کی آواز میں گہرائی' گیرائی اور زیر و بم ہے۔ ان کی زبان میں اثر پذیری کا جادو ہے۔ جب بولتے تو اہل عقل وخرد مسحور ہو جاتے۔ عقلی دلائل اور شوکت اسلام کے تاریخی واقعات ان کی گفتگو میں ایسے برجستہ اور برمحل آتے چلے جاتے ہیں، جیسے کوئی ماہر توپچی پوری توجہ کے ساتھ دیکھ کر ٹھیک ٹھیک اپنے ہدف پر گولہ داغتا ہے۔ ان کے یہ گولے ان کے مخالفین پر بم بن کر پھٹتے ہیں۔

تمھارا کیا خیال ہے ان رنگوں اور لکیروں سے کسی قائد کی تصویر بن سکتی ہے؟

اس مرتبہ مصر کس آواز پر بیدار ہوگا؟

کس در سے صبح کی روشنی کی پو پھوٹے گی؟

مصری تاریخ کا نیا شان دار ورق کس کے خون سے لکھا جائے گا؟

وہ وقت کب آئے گا جب مصر خامیوں وکمزوریوں سے نجات حاصل کرلے گا؟

لوگ کہتے ہیں اس کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہے اور اس کے بعد اخوان المسلمون کو ——

سوال یہ ہے کہ اخوان المسلمون کون ہیں؟

مبصرین کے خیال میں یہ وہ لوگ ہیں' جو ہر مظاہرے کے پیچھے اور ہر ہڑتال میں سرگرم ہیں۔ یہ وہ تحریک اور طاقت ہے جو اس بیداری کی سرخیل ہے جو آج کل ملی احساس کو زندہ کر رہی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں' جنھوں نے ایک ہی دن میں جلاوطنی کے ایک لاکھ بیج (badge) نہ صرف تقسیم کر دیے بلکہ انھیں معزز مصریوں کے سینوں پر سجا بھی دیا۔

یہ الاخوان کون ہیں؟

'الاخوان' سے وہ تنظیم و جمعیت مراد ہے، جن کا نشانِ امتیاز یہ مربوط تلواریں ہیں جن کے درمیان قرآن ہے جس کے نیچے اعدو (تیاری کرو) لکھا ہے۔

مرشد عام: مشرع شخصیت' چمکتی آنکھیں' فیصلہ کن اور توانا آواز۔ اس کے ایک حکم پر لاکھوں انسان اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کے لیے تیار ہیں اور یہی وہ اصل طاقت ہے۔

میں نے الاستاذ حسن البنا سے دوتلواروں کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا:

'یہ جہاد کی نشانیاں ہیں'

اور یہ قرآن؟

'جہاد کا دستور ہے، زندگی بھر جہاد کا'

میں نے پوچھا: دو تلواروں کے درمیان جو کلمہ لکھا ہے؟

فرمایا: یہ قرآن کی ایک آیت کریمہ کا پہلا کلمہ ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ (الانفال ۸:۶۰) اور تم لوگ، جہاں تک تمھارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو، تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ رکھو۔

ابھی ہم گفتگو مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ان کے ۵ ہزار انصار جلاوطنی کے دن کے حادثے کے بعد ان سے ہدایات لینے پہنچ گئے۔ اب اس شخص کی نمایاں خوبی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لوگوں کو خطاب کس طرح کیا جائے اور ان کے احساسات کو کس طرح شعلہ بار کیا جائے۔ میں سن رہا تھا جب وہ ان سے کہہ رہے تھے: سنو! اے بہترین انسانو، جنھیں اللہ نے انسانیت کی بھلائی کے لیے چن لیا ہے۔ سنو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیو' اے لشکر نجات' آزادی کے پیغامبرو' اے راتوں کے تہجد گزارو اور دن کے شہسوارو۔

میں نے یہ افتتاحیہ کلمات سنے اور پھر میں نے حاضرین کو بجلی کی سی گرج دار آواز میں لبیک کہتے سنا--- ''اللہ اکبر' اللہ اکبر' کامیابی ایمان والوں ہی کے لیے ہے''۔ آدمی فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس شخص کو اپنے عوام کی نفسیات کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت عطا ہوئی ہے۔ وہ عوام کے جذبات کو اُبھارنا اور ان کو رخ دینا جانتے ہیں۔

جو کچھ ہوا، اس پر مرشد اپنے احساسات کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ انھیں پُرامن مظاہروں کا حکم دیتے ہیں' تاہم وہ یہ نہیں سمجھتے کہ صرف پُرامن مظاہروں سے مصر کو اس کے حقوق مل جائیں گے، لیکن ان کی یہ سوچی سمجھی راے ہے کہ فی الحال یہ خون دینے کا وقت نہیں ہے ___ اس لیے اپنی طاقت کو محفوظ رکھا جائے۔

حاضرین میں سے پھر بجلی کی گرج سنائی دیتی ہے: اللہ اکبر ' وللہ الحمد۔ مرشد

تھوڑی دیر سکوت اختیار کر کے پھر فرماتے ہیں: ''اے جوانو! اب اپنے کاموں کی طرف لوٹ جاؤ' حسب معمول میری ہدایات تمھیں پہنچ جائیں گی، اے میرے پیارے اور محترم بھائیو''۔ چند لمحوں میں ۵ ہزار پُرجوش اور پرعزم نوجوان واپس لوٹ جاتے ہیں۔ استاذ حسن البنا ہمارے درمیان اپنی نشست پر اس طرح لوٹ آتے ہیں کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ حالانکہ چند لمحوں میں انھوں نے ۵ ہزار نوجوانوں کے جذبات کو ابھارا ہی نہیں راستہ بھی دکھایا ہے--- جو کہ رات کے عبادت گزار اور دن کے شہسوار ہیں۔

لوٹتے ہی وہ ہم سے گفتگو شروع کر دیتے ہیں: ''میں تحدید کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ یہ دعوت کب اور کیسے پروان چڑھی۔ کچھ افکار انسان کے ساتھ ہی نشوونما پاتے رہتے ہیں۔ جب میں نے دارالعلوم سے گریجویشن کیا اس وقت یہ نمایاں تر ہوئے۔ پھر جب میں اسماعیلیہ میں قیام پذیر تھا اس وقت نشان ہائے منزل مزید واضح ہو گئے۔

میں نے پوچھا: ''اس وقت اخوان سے وابستہ کتنے حلقے ہیں''؟ انھوں نے فرمایا: ''مصر میں ۱۵۰۰ حلقے ہیں، جن سے لاکھوں اخوان وابستہ ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں ہمارے کئی حلقے ہیں جن سے ڈیڑھ لاکھ اخوانی کارکن وابستہ ہیں۔ الاخوان المناصرون (متفقین) ان کے علاوہ ہیں۔ وہ ہماری طرح یقین رکھتے ہیں کہ ہمارا روحانی فلسفہ اسلام کی شان دار تعلیمات سے ماخوذ ہونا چاہیے لیکن وہ فی الحال باقاعدہ ہمارے ساتھ شریکِ عمل نہیں ہوئے''۔

میں نے کہا: ''لیکن گذشتہ چند سالوں میں آپ سیاسی سرگرمیوں میں لگ گئے ہیں''۔ انھوں نے فرمایا: آپ کی مراد قومی سرگرمیوں سے ہے۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ مروجہ سیاسی پارٹیوں اور انجمنوں سے ہمارا میل ملاپ نہ رہے، مگر جب جنگ چھڑ گئی تو وہ خود ہم سے رابطہ کرنے کے لیے کوشاں ہوئیں۔ اس رابطے کے نتیجے میں وہ شعلہ بھڑک اٹھا جسے دیکھ کر سب نگاہیں ہماری طرف دیکھنے لگیں''۔

میں نے پوچھا: ''عنقریب انتخابات ہوئے تو کیا آپ ان میں شریک ہوں گے؟'' انھوں نے فرمایا: 'جی ہاں'۔ پوچھا: ''کیا کامیابی کی کوئی ضمانت ہے؟'' جواب دیا: ''اگر آزادانہ انتخابات ہوں' اور اگر ہم چاہیں تو واضح اکثریت حاصل کر سکتے ہیں۔ فی الواقع میں یہ نہیں چاہتا، کیونکہ ہمارا

قوم کی صفوں میں رہنا حکمرانوں کی صفوں میں شامل ہونے سے بہتر ہے۔ اس لیے فی الحال ہم چند ہی حلقوں میں انتخاب میں حصہ لیں گے"۔

میں نے پوچھا: کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو حکومت دی گئی تو آپ اسے قبول نہیں کریں گے؟ انھوں نے فرمایا: "میں حکومت کو قبول کرلوں گا۔ کیونکہ حکومت عیش و عشرت کا نام نہیں بلکہ یہ تو ایک گراں بار ذمہ داری ہے جو جہاد جیسی قربانی کا متقاضی ہے۔ اگر میں نے حکومت قبول کرلی تو انگریزوں سے کہوں گا کہ وہ فوراً اور مکمل طور پر مصر سے نکل جائیں--- یا--- مصر یوں سے کہوں گا، اے میری قوم کے لوگو! جہاد کرو، صرف جہاد ہی سے آزادی مل سکتی ہے۔ میں نے ایک دن نقراشی پاشا سے کہا تھا کہ وہ صراحت کے ساتھ انگریزوں سے مصر سے نکل جانے کا مطالبہ کریں، کیونکہ انگریز ٹال مٹول کا ماہر ہے ایسے نہیں جائے گا۔ اس لیے وہ تلوار تھام کر میدان جہاد میں قوم کی قیادت کریں"۔

میں نے کہا: "کیا آپ اُس سے تعاون کرتے؟" انھوں نے فرمایا: "میں ہر اس وزیراعظم کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہوں جو جہاد کی دعوت دے"۔

میں نے پوچھا: "کیا آپ کے پاس طاقت ہے؟" انھوں نے فرمایا: "میرے پاس ۱۰ لاکھ ہیں"۔ میں نے کہا: "اسلحہ؟" انھوں نے فرمایا: "ہمارا اسلحہ ایمان ہے۔ اخوان میں سے ہر ایک اس پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی جانیں اور مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے' قربانی دیں گے اور سامراج سے آزادی چھینیں گے--- جہاد کے موقع پر تم ہمیں دیکھو گے کہ ہم گولیوں کے سامنے یہ کہتے ہوئے ڈٹ جائیں گے: اے جنت کی ہواؤں، آؤ ہماری طرف، آؤ ہماری طرف"۔

میں نے پوچھا: "کیا آپ کی جماعت کے پاس مال و دولت ہے؟" انھوں نے فرمایا: "ہماری جماعت سب سے زیادہ غریب ہے اور سب سے زیادہ دولت مند بھی۔ ہمارا باقاعدہ سرمایہ تو اخوان کے چندے اور اعانتیں ہیں' البتہ فی الواقع اخوان سے وابستہ کارکنوں کی ساری دولت ہماری دولت ہے۔ جب ہم نے یہ مرکز خریدنے کا فیصلہ کیا، اس وقت اخوان کے بیت المال میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اخوان نے ایک ہی دن میں ۱۶ ہزار پاؤنڈ ادا کردیے۔ ہم نے یکم فروری کو اعلان

کیا کہ ہمیں ایک اخبار اور پریس کی ضرورت ہے جس کی لاگت تقریباً ڈھائی لاکھ پاؤنڈ ہے، کیونکہ ہم مشرق وسطیٰ میں اسی قسم کا سب سے بڑا ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اخوان نے دو ہفتوں میں ۲لاکھ اور ۲۰ ہزار پاؤنڈ پیش کر دیے"۔

میں نے کہا: "آپ کی کچھ چیزیں مجھے اچھی نہیں لگتی ہیں"۔ انھوں نے کہا: "وہ کیا ہیں؟" میں نے کہا: "دین کی تبلیغ، کیونکہ اس سے مصری قوم کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی"۔ انھوں نے (قرآن کی آیت تلاوت کرتے ہوئے) کہا: "اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔ (الممتحنة ۶۰:۸)

میں نے کہا: "آپ اپنے اراکین سے یہ تقاضا کیوں کرتے ہیں کہ وہ زیادہ بحث مباحثہ نہ کریں؟" انھوں نے کہا: "مناظرہ بازی اور فضول بحث سے کوئی بھلائی حاصل نہیں ہوتی"۔ میں نے کہا: "آپ ان سے یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ زیادہ ہنسی مذاق نہ کیا کریں"۔ انھوں نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ سے ملا ہوا دل پُرسکون اور سنجیدہ ہوتا ہے اور سنجیدگی ہی جہاد کا طرۂ امتیاز ہے"۔ (انور الجندی، حسن البنا، ص ۱۱۷-۱۲۲)

❊❊❊


DOLLAR
vivid and
brilliant
highlights !
forever . . .
DOLLAR
HIGH LIGHTER
90
1-4.5 mm
BROAD
POINT
DOLLAR
HIGH LIGHTER
90
1-4.5 mm
BROAD
POINT
Truly Fluorescent
HIGH LIGHTER
in four brilliant colours


G.F.C.
FANS
کوالٹی جو سب پہ چھا جائے !
جی ایف سی فینز اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے پاکستان کے سب سے زیادہ ایکسپورٹ ہونے
والے پنکھوں میں شمار ہوتا ہے اس لیے جی ایف سی کا ایکسپورٹ نیٹ ورک امریکہ اور یورپ
سمیت تیزی سے دنیا کے نقشے پر چھا رہا ہے۔ جی ایف سی امریکن سٹینڈرڈ سرٹیفکیٹ حاصل
کرنے والی پاکستان کی پہلی اور واحد کمپنی ہے جو کہ جی ایف سی کے نہایت تجربہ کار انجینئرز کا
ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اپنی وسیع رینج اور خوبصورت ڈیزائنز کی وجہ سے جی ایف سی فینز ہمیشہ
سے دنیا بھر کے صارفین کی اولین پسند ہیں۔
International
Quality Certified
PSQCA
SAUDI ARABIAN
STND. Organization
PCSIR
Importers & Exporters
Manufacturers of all kinds of Electric Fans & Appliances
General order suppliers & approved Government Contractors
ENERGY SAVER
General Fan Company (Pvt) Ltd.
G.T. Road, Gujrat-Pakistan. Tel: +92-53-3520301-03
Fax: +92-53-3521427-3515303
Distributor
M.M & Brother's 15 Ferozpur Road, Lahore.
Tel: (042) 7581084, 7566309
UL
CE
یو۔ایل اور سی۔ای سرٹیفیکیٹ
حاصل کرنے والی پہلی پاکستانی پنکھا ساز کمپنی
BLAZE

ناقابلِ فراموش کردار

علی غایاتی ○

کسی نے بالکل درست کہا تھا کہ: ''اخوان المسلمون موجودہ دور میں قرآن مجید کا ایک معجزہ ہے''۔ تو پھر اسے تسلیم کرنے میں کون سا امر مانع ہوگا کہ اخوان المسلمون کے بانی مرشد عام استاذ حسن البنا مرحوم و مغفور ہی اس کرشمے کے خالق ہیں۔ انھوں نے اپنے علم و عمل، ہدایت و راہ نمائی، فعالیت و روحانیت، مضبوط و غیر متزلزل ایمان اور کامل اطاعت سے اس جماعت کو بے پناہ قوت و توانائی پہنچائی، اور اس جماعت کے افراد نے ایسے عظیم الشان و ناقابل فراموش کارنامے سرانجام دیے جن سے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ ہوگئی۔

حسن البنا اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی شخصیت کے کئی روشن اور قابل تقلید پہلو ہیں۔ شہید کی دعوت و فکر کی خوشبو دنیاے اسلام کے کونے کونے بالخصوص مصر میں اسلامی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ شہید کو دنیا بھر کے مسلمانوں کے معاملات سے گہری دل چسپی تھی اور مسلمانوں کے حالات ان کی نگاہ میں تھے، خواہ وہ دنیا کے کسی خطے سے بھی وابستہ ہوں۔

شہادت سے چند سال قبل جب حسن البنا کو یہ معلوم ہوا کہ میں دعوت و اشاعت دین

○ مشہور صحافی اور اعلیٰ پایے کے انقلابی شاعر۔ برطانوی استعمار کے خلاف اپنے اشعار اور مضامین کے ذریعے بیداری کا پیغام عام کیا تو قابلِ گردن زدنی ٹھیرے۔ مصر چھوڑ کر ترکی اور پھر سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں ۲۷ سال کی ملک بدری کے بعد واپس لوٹے اور منبر الشرق اخبار میں دوبارہ لکھنے لگے۔ اگست ۱۹۵۶ء میں وفات پائی۔ ترجمہ: عبدالرحمٰن شاکر

کے لیے امریکا کے سفر کا ارادہ رکھتا ہوں، تو وہ محترم صالح عشماوی کے ہمراہ دفتر منبر الشرق تشریف لائے، اور مجھے بتانے لگے کہ جنوبی امریکا میں مقیم مسلمان اپنے بچوں کی درست اسلامی و عربی تعلیم وتربیت کے لیے بہت زیادہ پریشان و سرگرداں ہیں۔ اگر تعلیم یافتہ مربی اساتذہ کے ذریعے ان بچوں کی تربیت کا اہتمام نہ کیا گیا تو ان بچوں کا مستقبل انتہائی بھیانک اور خطرناک ہوگا۔ انھوں نے میری توجہ اس انتہائی اہمیت کے حامل مسئلے کی طرف دلائی اور اس سلسلے میں مالی تعاون اور افراد کار کے ذریعے عملی امداد کا وعدہ بھی فرمایا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میں امریکا نہ جاسکا، اور میرا قیام مصر ہی میں رہا۔ اس دوران حسن البنا شہید سے پرخلوص محبت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔

ایک دن میں نے انھیں تجویز پیش کی کہ منبرالشرق کو دارالاخوان المسلمون پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کرنا چاہیے، جیسا کہ بعض دیگر اخبارات نے سیاست وتصوف کے میدان میں کارہاے نمایاں سرانجام دینے والوں پر خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کیا ہے۔ استاد محترم نے اس تجویز کا خیرمقدم کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ جب مطلوبہ وسائل اور استعداد فراہم ہوجائے گی تو اس تجویز پر لازماً عمل کیا جائے گا۔ صدافسوس کہ ۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اخوان المسلمون کو غیرقانونی قرار دے دیا گیا، ان کی دعوتی سرگرمیوں پر پابندی لگادی گئی، اور ان کے اخبارات بند کردیے گئے۔ اللہ کی قدرت دیکھیے کہ منبر الشرق مستقل بنیادوں پر جاری رہا تاکہ پرچم حق کو سربلند رکھے۔ وہ ان سخت ترین حالات میں بھی اخوان کا ہمیشہ دفاع کرتا رہا' جب کہ ان کے حق میں لکھنے والے قلم خاموش اور بولنے والی زبانیں گنگ ہوگئی تھیں۔

بعدازاں اخوان کے لیے دعوت کا راستہ ہموار ہونا شروع ہوگیا تو انھوں نے المباحث کا اجرا کیا۔ پھر اسے بھی ترک کردیا اور الدعوۃ جیسے مؤقر اور اہم مجلّے کا آغاز کردیا۔ مجھے اس پر بہت خوشی ہوئی اور اس مجلّے کی اشاعت کا ایک سال پورا ہونے پر میں نے اخوان کو مبارک باد پیش کی۔

آج اخوان کی صورت میں جس مبارک تحریک کو ہم پھلتا پھولتا دیکھ رہے ہیں، یہ پودا حسن البنا نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ آج مصر اور غیر مصر کے بے شمار نوجوانوں میں جو پاکیزہ دینی اور روحانی رجحانات و افکار پروان چڑھے ہیں تو یہ شہید کی دی ہوئی اسلامی تعلیم وتربیت ہی کا نتیجہ ہے۔ شہید کی اس تربیت کے روشن نتائج فلسطین کے میدان جہاد میں اخوان کی شجاعت و بہادری

اور ان کے جذبۂ قربانی و ایثار کی صورت میں ہمارے لیے مینارہ نور اور بہترین مثال ہیں۔ اگر اخوان کے راستے میں اپنوں اور غیروں کی طرف سے خفیہ سازشیں، دسیسہ کاریاں اور رکاوٹیں کھڑی نہ کی جاتیں تو فتح و نصرت خداوندی کی تکمیل اور مجاہدین کی کامیابی کی صورت میں آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔

میں یقین واثق سے کہتا ہوں کہ جس پاکیزہ اور عظیم انقلاب کی بنیاد شہید حسن البنا نے رکھی اور خونِ جگر ہی سے نہیں اپنی شہ رگ کے خون سے اسے سیراب کیا، وہ کبھی زوال کا شکار نہیں ہوسکتا۔ دوام و بقا اس کا مقدر ہے___ مہ و سال کے گزرنے کے ساتھ ساتھ عوام میں اس کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں اور یہ تحریک، اسلام کی نشأت ثانیہ اور نوجوانانِ اسلام کے لیے باعث صد عزت و افتخار ثابت ہوگی۔

***

چند یادیں

عبدالحلیم وشاحی °

● ملوی میں اخوان کی ایک میٹنگ کے اختتام پر امام شہید اس رات ایک اخوانی ساتھی کے گھر قیام پذیر ہوئے۔ انھوں نے مجھ سے اپنی ڈائری منگوائی جس میں وہ روزانہ کی سرگرمیاں اور مختلف اشخاص سے ملاقاتوں کا احوال قلم بند کرتے اور بڑی باریک بینی کے ساتھ ذاتی محاسبہ بھی کرتے تھے۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد انھوں نے مجھے ڈائری واپس کردی، تاکہ میں اسے ان کے بیگ میں رکھ دوں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کیا میں اسے کھول کر پڑھ سکتا ہوں؟ کچھ تردد کے بعد میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ امام شہید تو اسلام اور مسلمانوں کا عظیم سرمایہ ہیں اور میرا ان سے تعلق بھی اتنا گہرا ہے کہ اسے پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے، چنانچہ میں نے ڈائری کھول کر ورق گردانی شروع کردی۔

امام شہید لکھتے ہیں: میرے والد صاحب کے بیان کے مطابق قمری اعتبار سے آج رات میری عمر ۴۰ سال ہوگئی ہے۔ الحمدللہ! میں اب تک دعوت الی اللہ کے کام پر ڈٹا ہوا ہوں، تاہم اب بھی اس کام کے لیے مطلوبہ روحانی معیار میں کمی محسوس کرتا ہوں۔ اس لیے مجھے اوراد و وظائف پر پوری توجہ دینا ہوگی؛ دعوتی کام کی وجہ سے اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ نیز منگل کے ہفتہ وار لیکچر کے لیے بھی پوری تیاری اور کوشش کرنی ہے، اسی میں بہتری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے اور وہ بھی۔

° مرکز اخوان میں علاقائی امور کے انچارج، اور مصر بھر کے دورہ جات میں حسن البنا شہید کے رفیق سفر رہے۔

ترجمہ: محمد کاشف شیخ

اس طرح انھوں نے اپنا شدید احتساب کیا۔ اپنے اعمال کے یومیہ جائزے کا وہ اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ہمیں بھی ہمیشہ محاسبۂ نفس کا درس دیا کرتے تھے۔

● زقازیق میں استاذ حمدی بنھاوی کے گھر پر ایک دفتر عمومی کے اجرا اور اس کی تزئین و آرایش سے فراغت کے بعد جب ہم نے رسالے اور پریس کے نئے منصوبے پر کام شروع کیا تو امام شہید نے مجھ سے کہا:

> میں ایک ایسا رسالہ شائع کرنا چاہتا ہوں جو کئی زبانوں میں چھپے اور دنیا بھر میں تقسیم کیا جائے۔ اسی طرح میری یہ بھی خواہش ہے کہ اخوان پوری دنیا میں پھیل کر اس فکر کو عام کریں۔ اگر میں موت سے قبل اپنی آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوگیا تو امید ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی ضروریات کافی حد تک پوری ہوجائیں گی۔

● امام شہید نے فرمایا: میں اخوان سے بخوبی واقف ہوں اور مجھے ان کی صلاحیتوں کا بھی علم ہے۔ لیکن اگر وہ انتظامی معاملات میں میری مدد کرتے ہوئے مجھے بصراحت بتادیں کہ انفرادی سطح پر وہ کس کس کام کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ زیادہ بہتر اور مفید ثابت ہوگا۔ قرآن کریم میں بھی یہی قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کی گفتگو ان الفاظ میں پیش فرمائی ہے: قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ (یوسف ۱۲: ۵۵) ''ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے۔ میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں''۔

● کسی اخوانی کمپنی سے نکالا گیا ایک ملازم امام شہید کے پاس ملازمت سے برخاستگی کی شکایت لے کر آیا اور امام شہید سے کہا: ''فلاں نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور مجھے ناحق روزگار سے محروم کردیا ہے''۔ امام شہید نے اس کو جواب دیا: ''جس نے تجھے نکالا ہے وہ اپنے کام کا خود ذمہ دار ہے اور جس کمپنی میں تم کام کرتے تھے یہ اس کا اندرونی معاملہ ہے جس میں مداخلت کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر تمھیں کسی سے کوئی شکایت ہے تو انتظامیہ کو لکھو اور یقین رکھو کہ اگر تم حق پر ہو تو تمھارے ساتھ بورڈ ضرور انصاف کرے گا''۔ امام شہید معاملات کو متعلقہ افراد کے حوالے کرتے تھے اور ہر ذمہ دار فرد کو خود اپنی ذمہ داری کی ادایگی کا احساس دلاتے تھے۔

شعبان کے آخری ایام تھے اور ہم ابوتیج میں تھے کہ امام شہید کو استاذ صالح عشماوی کا

خط ملا۔ امام شہید اخوان کے حالات سے آگاہی کے لیے سفر کے دوران ذمہ داران سے مسلسل رابطے میں رہتے تھے اور ان کا مرکزی دفتر سے فون پر رابطہ کبھی منقطع نہ ہوتا تھا۔ خط میں استاد صالح نے ماہ رمضان کی مناسبت سے ایک تحریر کا تقاضا کیا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد امام شہید الگ کمرے میں بیٹھ گئے اور ۱۰ منٹ بعد ایک بہترین تحریر لکھ لائے جسے ہم نے اسی رات بذریعہ ڈاک روانہ کر دیا۔

- امام شہید حیران کن طور پر انتہائی تیزی سے مطالعہ کرتے تھے۔ یہ ان کی وسعت مطالعہ پر دلالت کرتا ہے۔ دن بھر کے اخبارات پڑھنے کے لیے انھیں صرف نصف گھنٹہ درکار ہوتا تھا۔ آپ مجلہ المختار بہت باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ یہ رسالہ مغربی افکار کا علَم بردار تھا۔
- ہم نئے قانون کے مطابق اخوان کی مختلف کمپنیوں کی تشکیل میں مصروف تھے۔ اس کام کے لیے ہمیں جامعہ ابراہیم پاشا کے کامرس کے استاد محمد کامل حارونی کی معاونت کی ضرورت پیش آئی۔ وہ ہمیں اس کی ضروری قانونی عبارات اور تقاضے بتانے لگے۔ امام شہید نے ان کی گفتگو کے بعد کہا کہ ''آپ کا مقصد یہ، یہ اور یہ ہے؟'' تب استاد حارونی نے ان کی طرف دیکھ کر کہا: ''آپ تو مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔ اب میری کیا ضرورت ہے''۔ اس بات پر ہم سب ہنس دیے۔ (مجلۃ الدعوۃ، ۱۳ فروری ۱۹۵۱ء)

***

صداقت اور بلاغت کا پیکر

ڈاکٹر طاہر احمد مکی ٥

میں نے پہلی مرتبہ امام البنا کو بالائی مصر کے ضلع قنا کے شہر اسنا کے ایک دور دراز گاؤں میں دیکھا۔ جس میں زیادہ تر ہمارے قبیلے المطاعنۃ کے لوگ آباد تھے، اس وقت تک میں سیاست، قربانی پر مبنی جدوجہد، استعمار کی خرابیوں، انگریز کے قبضے' اس کی ہیبت اور اسلام پر بحیثیت دین اس کے سفاکانہ حملوں سے آگاہ نہ تھا' اور نہ میں عیسائی مشنریوں کے جال، بیرونی ذرائع ابلاغ کی چیرہ دستیوں اور علاج و تعلیم کے پردے میں ان عالمی ایجنسیوں کی طرف سے پھیلائے جانے والے لٹریچر کے سیلاب ہی سے واقف تھا، جو علم اور صحت کے نام پر الحاد و اباحیت پھیلانے اور مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے پروگرام پر عمل پیرا تھیں۔

اگرچہ میں اس بارے میں کچھ نہ کچھ سنتا بھی رہتا تھا۔ کیونکہ میرا شمار گاؤں کے ان بچوں میں ہوتا تھا جو گاؤں کے پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے اور اسکول کی لازمی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ پڑھنے لکھنے اور قرآن کریم حفظ کرنے کے سوا میرا مشغلہ کچھ نہ تھا' جب کہ میرے اکثر دوست کھیتی باڑی اور دیگر ضروریات زندگی کے حصول میں اپنے گھر والوں کی مدد کرتے تھے۔ میرے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ میں فرصت کے لمحات میں گاؤں کے ان پڑھ لوگوں کو الاہرام اخبار پڑھ کر سناؤں۔ یہ وہ واحد اخبار تھا جو میرے ایک ماموں، گاؤں کے چودھری اور مقامی سرکاری افسر کے مشترکہ تعاون سے آیا کرتا تھا۔ میں نے سنا کہ اخوان المسلمون کے مرشد عام حسن البنا

---

٥ پروفیسر عربی زبان و ادب، اور مدیر مجلہ ادب و نقد، قاہرہ۔ ترجمہ: ڈاکٹر احسان الحق

میرے قبیلے کے خاندانی مہمان خانہ کیمان المطاعنۃ میں بطور مہمان تشریف لا رہے ہیں۔ یہ دیوان خانہ میری رہایش گاہ سے چند کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا۔ چنانچہ میں نے اس عظیم شخصیت کی زیارت کے ارادے سے رخت سفر باندھا جس کا نام اخبارات میں مختلف حوالوں سے چھپتا رہتا تھا۔ خاص طور پر النذیر رسالے میں ان کا لکھا اداریہ میری توجہ کا مرکز ہوتا جو میرے ماموں جب بھی شہر جاتے میرے لیے لے آتے۔ یہ اگست ۱۹۳۸ء کے آخری ایام تھے۔ یہ نووارد مہمان دُور سے اور پھر قریب سے میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ کھلے سفید، سادہ، موٹے اور کھرّے لباس میں ملبوس تھا، سر پر ترکی ٹوپی کے اوپر پگڑی بندھی ہوئی تھی، درمیانی قد وقامت، سرخی مائل سفید رنگ، خوب صورت متشرع داڑھی، دل میں اُترنے والی نگاہ بصیرت ___ جب وہ سادہ دیہاتیوں کے جمگھٹے میں چل پھر رہا تھا تو گویا اس کے گرد نور کا ہالہ بن جاتا جسے دیکھ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوتی۔ وہ سیکڑوں لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنا جانتا تھا۔

○ **ان کے شب و روز**: حسن البنا نے دو دن کیمان المطاعنۃ میں گزارے، جس میں انھوں نے گاؤں کی سرکردہ شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔ یہاں تک کہ وہ ان لوگوں سے بھی ملے جو ہمارے خاندان کے مخالف تھے اور ان سیاسی لوگوں سے بھی جو اخوان المسلمون سے خوش گوار تعلقات نہ رکھتے تھے۔ اسی دورے میں انھوں نے ناراض لوگوں کے درمیان صلح کرائی اور لوگوں کو کلمۂ خیر پر اکٹھا کیا۔ یہ سب انھوں نے صبح کے اوقات میں ہلکا سا ناشتہ کرنے کے بعد انجام دیا‘ جب کہ میزبانوں نے پُرتکلف دیہاتی ناشتے کا بھرپور اہتمام کیا ہوا تھا۔ جب دن آدھا گزر گیا تو انھوں نے ظہر کے وقت مسجد میں لوگوں کی امامت فرمائی۔ اس کے بعد عربی طریقے پر فرشی نشست سجادی گئی، جس پر مدعو حضرات ان کے گرد ظہرانہ تناول کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ کھانا ختم ہوا تو ایک خوب صورت دعاے شکر آپ کے لبوں پر جاری ہوگئی جس کے الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں‘ اور جن کی گونج میرے کانوں میں ایسے سنائی دیتی ہے جیسے کل کی بات ہو۔ ایک سجی سجائی پاک زبان جو جذبہء احسان مندی سے بھرپور تھی: اَکَلَ طَعَامَکُم الأبرار، وَ صَلَّت عَلَیکُم مَلَائِکَۃُ الرَّحمان، وَ ذَکَرَکُم اللّٰہُ فِیمَن عِندَہٗ، ’’نیکوکاروں نے تمھارا کھانا کھایا۔ رحمان کے فرشتوں نے تمھیں دعا دی‘ اور اللہ نے تمھیں یاد فرمایا‘‘۔

ظہرانے کے بعد امام نے کچھ دیر آرام کیا۔ دھوپ کافی تیز تھی اور صعید مصر کے بالائی علاقوں کی گرمی ویسے بھی بہت مشہور ہے، یہاں تک کہ عصر کا وقت ہوگیا۔ آپ نے گاؤں کی مسجد میں امامت فرمائی۔ گاؤں کا نقشہ بھی عجیب تھا۔ کوڑے کے ڈھیروں سے اٹا ہوا، جن پر گرد اڑتی رہتی تھی۔ دھوپ کی تمازت چہار اطراف سے اپنی لپیٹ میں لیے رہتی۔ اس سب کے باوجود نہ تو امام بے چین ہوئے، نہ اکتائے، کسی تکلیف پر اُف تک نہ کی۔

ایک دن نماز کے بعد اپنی تقریر کی ابتدا اس حدیث سے کی:

وَمَا اجتَمَعَ قَومٌ فِی بَیت مِن بُیُوتِ اللّٰہِ، یَتلُونَ کِتَابَہ، وَ یَتَدَارَسُونَ آیَاتِہ، 'إِلَّا حَفَّتہُمُ المَلَائِکَۃُ وَ غَشِیَتھُم الرَّحمَۃ (مسلم) کوئی گروہ ایسا نہیں ہے جو اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوکر اس کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے اور اس کی آیات کو سیکھتا اور سکھاتا ہے اِلا یہ کہ فرشتے اسے گھیر لیتے ہیں۔ اور (اللہ کی) رحمت اسے ڈھانپ لیتی ہے۔

پھر انھوں نے بعض آیات قرآنی کی تفسیر کی اور انھیں لوگوں کے اجتماعی حالات پر منطبق کیا۔ مجھے اب ان کی گفتگو کی تفصیل یاد نہیں ہے۔ البتہ اس کی ایک زندہ تصویر اب بھی میری عقل و دل کو جذبات سے لبریز کردیتی ہے۔ قبیلے کی مختلف سرکردہ شخصیات کے دیوان خانوں کے تھکا دینے والے دورے کے بعد جب رات چھا گئی اور لوگ نیند کی آغوش میں چلے گئے تو وہ تنہا بیٹھ کر گہری خاموشی کے عالم میں اپنے اوراد و وظائف پڑھنے لگے اور اپنے معمول کے مطابق نوافل ادا کرنے لگے۔

اس دورے میں ان کے ہمراہ ایک ساتھی تھے۔ بھرے بھرے جسم، مضبوط ساخت کے مالک، نئے نئے ازہر سے فارغ ہوئے تھے، عمامہ و جبہ میں ملبوس۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لوگ ان کے تصنع و بناوٹ اور ان کی گفتگو میں خود پسندی کی بنا پر ان سے مطمئن نہ ہوئے۔ یوں لگا کہ گویا ایک مصنوعی شخصیت ان کے لیے بوجھ بن رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسے نظرانداز کردیا اور امام البنا کے گرد ہی جمع رہے۔ اگرچہ مہمان نوازی ان کی بھی جاری رہی۔

کیمان المطاعنۃ سے امام اصفون المطاعنۃ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ فراج طایع

خاندان کے مہمان ہوئے۔ اس خاندان کے سربراہ نے کئی سال ازہر میں بغیر کوئی ڈگری لیے گزار دیے، جیسا کہ اس زمانے میں کچھ لوگوں کی روایت تھی۔ پھر وہ اس حلقے سے سینیٹ کے ممبر منتخب ہو گئے اور شیخ محمد امیر کو یقین دہانی کرائی کہ وہ گاؤں میں اخوان کی شاخ قائم کریں گے۔ شیخ امیر نے بھی ازہر میں دو سال گزارے تھے اور ناگزیر وجوہ کی بنا پر اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ انھوں نے اس محرومی کی تلافی یوں کی کہ وہ ہمیشہ گاؤں کے نوجوانوں کو تعلیم حاصل کرنے پر ابھارتے رہے۔ وہ خود انھیں اسکولوں اور قاہرہ کے اداروں اور کالجوں میں داخلہ دلانے کی مشقت برداشت کرتے۔

○ **صعید مصر کا دورہ:** اگلے سال ستمبر ۱۹۳۹ء میں حسن البنا نے بالائی مصر کا دوسرا دورہ کیا۔ اس دفعہ پورا بالائی علاقہ ان کی دعوت کا ہدف تھا۔ وہ لوگوں سے روابط بڑھاتے اور اخوان کی قائم شدہ شاخوں کو مضبوط کرتے اور کوشش کرتے کہ لوگوں کی اقتصادی اور خاندانی مشکلات کو حل کریں، اور انھیں نیکی اور بھلائی کی طرف راغب کریں۔ ان قبائل میں پائی جانے والی بعض منفی عادتوں، انتقام، بغض اور عصبیتوں کے خاتمے کی کوشش کریں۔ اس بار یہاں پر امام کا والہانہ استقبال ہوا اور قبائلی روایت کے مطابق ہوائی فائرنگ سے ان کی عزت افزائی کی گئی۔

اس بار میں نے انھیں زیادہ قریب سے دیکھا۔ میں ایک سال بڑا ہو گیا تھا اور ان سے میرے لگاؤ میں اضافہ ہوتا گیا۔ انھوں نے اپنے پروگرام، عبادات اور لباس میں کوئی تبدیلی نہ کی تھی۔ اس دفعہ شیخ عبدالمعز عبدالستار نامی ایک دوسرا ازہری نوجوان ان کا رفیقِ سفر تھا۔ وہ کلیہ اصول الدین کا طالب علم تھا۔ لوگوں نے اس کے لیے بھی اسی طرح چاہت کا اظہار کیا جس طرح امام البنا کے لیے کیا تھا۔ وہ نہایت پُروقار منکسر المزاج نوجوان تھا۔ ”وہ حیا سے سر جھکاتا اور چہرے اس کے رعب سے جھک جاتے تھے“۔ حسن البنا اور ان کا یہ ساتھی اصفون المطاعنة سے ہمارے پاس آئے تھے۔ اپنی قیام کی مدت پوری کرنے کے بعد وہ ”اِسنا“ روانہ ہو گئے تاکہ وہ بالائی مصر کے باقی شہروں کا دورہ مکمل کر سکیں۔

○ **قنا کے مرکزی شہر میں:** اگلے سال میں نے صوبے کے دارالحکومت قنا کے ایک انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ یہ بجھا بجھا سا شہر تھا جس میں ایک اخبار یا کتاب کے حصول کے لیے بھی جدوجہد کرنا پڑتی۔ اس میں میں نے پہلا سال ایک غافل نوجوان کی حیثیت سے گزارا۔

شہر میں گھومتا پھرتا۔ ہر جمعرات کی شب سینما کے علاوہ کہیں میرا آنا جانا نہ ہوتا۔ چنانچہ اس سال مجھے اس شہر کی عام زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا۔ اگلے سال میں شہر کی مرکزی شاہراہ پر منتقل ہوگیا اور شہر کی سرگرمیوں سے واقف ہونے لگا۔ میں گاہے گاہے جمعیت شبان المسلمین کے دفتر چلا جاتا جس کی سرگرمیاں بعض دینی ایام منانے تک محدود تھیں، مثلاً: ہجری سال کے آغاز، جشن میلاد النبیؐ اور یوم بدر کے موقعوں پر تقریبات یا پھر گاہے بگاہے بعض جسمانی ورزشوں کے پروگرام۔ ان تقریبات کو سامراج کے خلاف دینی شعور بیدار کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا۔ اس طرح یہ مواقع لوگوں میں روح جہاد ابھارنے اور قومی بیداری کا باعث بنتے۔ ان تقریبات میں بسا اوقات بڑے بڑے افسران شریک ہوتے جن میں تقریب کی مناسبت سے مرکزی خطبہ دیا جاتا، نصیحت کا کوئی پہلو سامنے لایا جاتا اور مسلمانوں کو ان کی کھوئی ہوئی عظمت واپس لینے پر ابھارا جاتا۔ علاقے کے شعرا درمیانے درجے کی شاعری پیش کرتے۔ ایسی نظمیں پڑھی جاتیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مناجات ہوتی، عظمت رفتہ کا گریہ ہوتا اور آنے والے کل کی اچھی اُمید ہوتی۔

ان دنوں، جب کہ میں جوانی کی دہلیز پر دستک دے رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ جمعیت شبان المسلمین وقت گزاری اور خطابت کی مشق کے لیے اچھی جگہ ہے۔ اگرچہ اس وقت میرا یہ بھی خیال تھا کہ ان کے پاس واضح سیاسی لائحہ عمل نہیں ہے، اور وطن کی آزادی ہرگز ان کے مجوزہ طریقے سے حاصل نہ ہوسکے گی۔ بہرحال آخر شب نشے میں مدہوش غیر ملکی فوجیوں کی نقل و حرکت ہمارے جذبات بھڑکا دیتی اور ہماری رگوں میں بغاوت اور ٹکراؤ کے جذبات دوڑا دیتی۔

ایک روز اچانک میں اخوان المسلمون کے دفتر چلا گیا جو شہر کے وسط میں ایک عمارت کی زمینی منزل میں قائم تھا۔ دفتر ایک لیکچر ہال پر مشتمل تھا جو نماز کے اوقات میں نماز گاہ اور دفتری اوقات میں دفتر کا کام دیتا۔ تیسرے کمرے کے ساتھ طہارت خانے کا انتظام تھا۔ میں دفتر میں داخل ہوا تو میرے ذہن میں اس عظیم شخصیت کی تصویر تھی جسے میں نے دو سال پہلے اپنے دیوان خانے (گاؤں) میں دیکھا تھا۔

اخوان المسلمون کی سرگرمیاں مختلف لیکچر اور دروس پر مشتمل تھیں۔ خطابت کی مشق بھی کروائی جاتی تھی۔ ایسی سفری مہمات پر بھی بھیجا جاتا جن میں بھلائی کے کاموں میں تعاون کے لیے

تربیت دی جاتی۔ ان سرگرمیوں میں سیکنڈری اسکولوں کے اساتذہ وطلبہ اور چھوٹے ملازمین شریک ہوتے، اور معہد دینی کے بعض طلبہ بھی شریک ہوجاتے۔ البتہ معہد کے اساتذہ الگ تھلگ رہتے اور صرف جمعیت شبان المسلمین میں وعظ وخطابت پر اکتفا کرتے۔

۲۰ مئی ۱۹۴۱ء کو وزیر اعظم حسین سرّی نے حسن البنا کا تبادلہ عباس اول قاہرہ پرائمری اسکول سے پرائمری اسکول قنا میں کردیا اور وہ بھی تعلیمی سال کے آخر میں۔ حسن البنا صرف منصبی ذمہ داری سنبھالنے آئے اور پھر واپس چلے گئے، کیونکہ میں نے اس سال انھیں دوبارہ نہیں دیکھا۔ میں خود بھی اپنے امتحانات میں مصروف ہوگیا۔ دوسرے سال کے آغاز میں وہ تشریف لائے اور میں اپنا پورا وقت ان کے ساتھ گزارنے لگ گیا۔

○ **حسن البنا بحیثیت معلم**: حسن البنا دقت نظری میں اپنی مثال آپ تھے۔ نہایت ذہین اور موقع شناس استاذ تھے اور حالات کو اپنے حق میں استعمال کرنا خوب جانتے تھے۔ جب ہیڈ ماسٹر کو یہ خفیہ احکامات ملے کہ وہ حسن البنا کو خوب تنگ کرے۔ انھوں نے زیادہ سے زیادہ پیریڈ ان کے سپرد کردیے۔ اس زمانے میں اسکول کل وقتی ہوتے تھے، یعنی صبح ساڑھے سات بجے سے ظہر کے بعد چار بجے تک۔ حسن البنا اس طویل دورانیے سے بھی بے زار نہ ہوئے، بلکہ انھوں نے خواہش کی کہ وہ عربی رسم الخط کی کلاس لیں گے۔ دیگر اساتذہ اس مضمون کی تدریس سے بھاگتے تھے۔ ایک تو وہ اسے معمولی مضمون گردانتے تھے۔ دوسرے، طلبہ بھی اس میں دل چسپی نہیں لیتے تھے۔ عموماً اس مضمون کو فطری صلاحیت کا مرہون منت سمجھا جاتا تھا۔ انسپکٹر حضرات بھی اسے خاطر میں نہ لاتے۔ چنانچہ انھوں نے شکریے کے ساتھ یہ مضمون انھیں دے دیا اور اس طرح اسکول انتظامیہ بھی خوش اور حسن البنا کے رفقا اساتذہ بھی خوش۔

حسن البنا کی اس مضمون میں دل چسپی کے دو مقاصد تھے۔ پہلا یہ کہ اس مضمون کے ہر کلاس میں ہفتہ وار دو پیریڈ تھے جس کا مطلب، تھا کہ وہ اسکول کے تمام طلبہ کو پڑھائیں گے جو ۱۵ کلاسوں اور سیکشنوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس طرح ان کا رابطہ تمام طلبہ سے ہوگیا جو اب دور جوانی میں داخل ہونے والے تھے اور وہ ان میں سے ایسے افرادِ کار تیار کرسکتے تھے جن کی مستقبل میں ملک کو ضرورت تھی۔ عملاً انھیں اس مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ پس یہ خوش باش استاد، ہمیشہ

مسکراتا ہوا، پرسکون طبیعت کا مالک، شایستہ و پر وقار، ایک غیر اہم مضمون میں تمام طلبہ کی دل چسپی کا باعث بننے لگا۔ وہ پیریڈ کا کچھ حصہ خوش خطی سکھاتا جسے بچے خوشی خوشی سیکھتے۔ وہ ان سے کھل کر گفتگو کرتا۔ ان کے ذاتی معاملات میں دل چسپی لیتا۔ ان کی محدود دنیا سے انھیں دور نہ کرتا۔ وہ ان سے بغیر سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کے سوال و جواب کرتا: آج صبح کی نماز کس نے پڑھی ہے؟ نماز پڑھنے والوں کو وہ انعام دیتا، ان کی حوصلہ افزائی کرتا۔ کس نے قرآن میں سے کچھ یاد کیا ہے، وہ سنتا اور تصحیح کرتا۔ پھر جب آدھی چھٹی ہوتی تو وہ ان سے اسکول کی مسجد میں ملنے کا وعدہ کرلیتا۔ ایک ماہ کے اندر اندر وہ اسکول کے تمام طلبہ کے محبوب ترین استاد بن چکے تھے۔

یہ مضمون اختیار کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ خوش خطی سکھانے کا پیریڈ اپنے وقت پر ختم ہوجاتا۔ اس کے لیے انھیں پریڈ کے بعد کسی تصحیح کی ضرورت ہوتی اور نہ پریڈ سے پہلے کسی تیاری کی۔ وہ دن کا بقیہ اور رات کا بڑا حصہ دعوت دین اور اسکے مددگاروں (انصار) کی تلاش میں یا عبادت و مطالعے میں صرف کردیتے۔

حسن البنا ہوٹل جیلاوی الجدید میں ٹھیرتے۔ یہ ان دنوں قنا کے اعلیٰ ہوٹلوں میں سے ایک تھا۔ اس کی عمارت آج تک قائم ہے اگرچہ مرور ایام سے اس کی حالت خستہ ہوچکی ہے۔ حسن البنا کا پروگرام معمول کے مطابق یہ ہوتا کہ چار بجے ہوٹل آجاتے، کپڑے تبدیل کرتے، کچھ دیر آرام کرتے۔ پھر اخوان کے دفتر آتے اور نماز مغرب کی جماعت کرواتے۔ خشوع و خضوع سے بھرپور نماز، نہ اتنی لمبی کہ لوگ تھک جائیں اور نہ اتنی مختصر کہ صرف فرض کا بوجھ اتارنا مقصود نظر آئے۔ اس کے بعد جماعت کے دیگر معاملات نمٹاتے، اور ملاقاتیوں سے ملاقاتوں میں مصروف ہوجاتے۔ کہیں وقت دیا ہوتا تو وہاں چلے جاتے۔ کبھی کبھار دیگر اسلامی اور مسیحی تنظیموں کے ذمہ داروں سے گفتگو رہتی۔ پھر نماز عشا کے لیے تشریف لے جاتے۔ بعد میں امام غزالی کی احیاء علوم الدین سے درس دیتے۔ اس کتاب کی وہ بہت تعریف کرتے بلکہ انھوں نے ہی سب سے پہلے ہماری توجہ اس کی طرف مبذول کروائی۔ شب جمعہ نماز عشا کے بعد عام لیکچر ہوتا جس میں شہر کے کونے کونے سے لوگ شریک ہوتے، چاہے ان کا اخوان سے تعلق ہو یا نہ ہو۔ اس لیکچر میں عوام کو درپیش مسائل پر گفتگو رہتی اور دینی حوالے سے ان کا حل پیش کیا جاتا۔

○ **فطری جمال اور لوگوں سے محبت کرنے والا:** حسن البنا کی چند ماہ کی رفاقت سے مجھ پر ان کے بارے میں کئی چیزیں واضح ہوئیں۔

ان کا کیا حافظہ تھا! میں جب بھی ان سے ملا انھوں نے مجھ سے میرے اہل و عیال کی فرداً فرداً نام لے کر خیریت دریافت کی۔ یہاں تک ان لوگوں کے بارے میں بھی پوچھا جن سے ان کی ملاقات صرف چند منٹ کے لیے ہوئی تھی۔

وہ فصیح عربی پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ فصیح و بلیغ، صاف، آسان اور واضح عربی میں گفتگو کرتے تھے۔ وہ اگر کسی شخص کے کردار پر خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو گفتگو کرتے تو صرف اتنا ہی ذکر کرتے جتنا کھوٹ اور باطل اور دین سے انحراف اس کے اندر دیکھتے۔ مرض کی تشخیص کرتے، علاج تجویز کرتے اور وہ تدابیر بتاتے جو کارگر ہوتیں۔ لوگوں کا انتخاب کرتے اور انھیں اکٹھا رکھنے کی سعی کرتے اور وہ ہمیشہ فرمایا کرتے: جن امور پر ہم متفق ہیں ان کے لیے ہم مل جل کر کام کریں گے' اور جن باتوں میں ہمیں ایک دوسرے سے اختلاف ہے ان کے بارے میں ایک دوسرے سے درگزر کا معاملہ کریں گے۔ میں نے انھیں ہر طرح کے لوگوں کے لیے فراخ دل پایا۔ جو ان سے عمر اور مناصب میں بڑے تھے یا جو ان سے عمر اور مرتبے میں کم تھے' سب کو اہمیت دیتے اور مشکلات پر قابو پانے میں ان کی مدد کرتے۔ اس مقصد کے لیے قاہرہ میں اخوان المسلمون کے مرکزی سیکرٹریٹ میں تعلقات عامہ کا ڈائریکٹوریٹ قائم ہوا۔ جس کا کام ملکی اور عالمی سطح پر اخوان کی مدد کرنا' ان کی روزمرہ مشکلات کا حل ڈھونڈنا تھا۔ شیخ البنا کی انتہائی خواہش ہوتی کہ اخوان ہمیشہ باہمی محبت و تعاون کی بنیاد پر جمع ہوں۔ وہ جہاں بھی جاتے اس بات کا اہتمام کرتے کہ وہ جہاں سے آرہے ہیں وہاں کے اخوان کا سلام اپنے تمام حاضرین کو پہنچائیں۔

حسن البنا کے دامن دل کو فطرت کا حسن والہانہ طور پر کھینچتا۔ نیل کا منظر، طلوع و غروب آفتاب کے لمحات اور پہاڑوں کا رعب و جلال انھیں بہت بھلا لگتا کیونکہ وہ اس میں خدا کی قدرت دیکھتے۔ ہمیں بارہا قنا کے جنگلوں میں ان کے ساتھ تفریح کے مواقع ملے۔ یہ جنگل شہر کے کنارے صحرا کے ایک حصے میں لگائے گئے تھے' وہاں ہم نماز مغرب پڑھتے۔ ہماری نگاہوں کو کوئی دیوار نہ روکتی اور نہ کھلے آسمان کو دیکھنے میں کوئی چیز حائل ہوتی۔ چند ہی ماہ گزرے تھے کہ انگریزی

استعمار اور اس کے اشاروں پر چلنے والی مصری حکومت نے محسوس کرلیا کہ حسن البنا بالائی مصر (صعید) میں قاہرہ سے زیادہ خطرناک ثابت ہورہے ہیں۔ وہاں انھیں ایک نیا اور وسیع میدان میسر ہے۔ ایسے مخلص لوگوں سے ان کی ملاقاتیں ہوتی ہیں جنھیں تہذیبی یلغار نے خراب نہیں کیا اور خوشامد نے ان کے دل و دماغ تک راہ نہیں پائی۔ چنانچہ انھیں واپس قاہرہ بھیج دیا گیا۔

حسن البنا نے قنا سے کوچ کرنے سے پہلے رخصت کے ان لمحات میں بھی ایک عظیم کارنامہ انجام دے دیا۔ انھوں نے لوگوں کی ان سے محبت اور تعلق کو مقصدیت میں ڈھالتے ہوئے کہا: میں چاہتا ہوں کہ اخوان کا یہ دفتر کسی کرایے کی عمارت کا فلیٹ نہ ہو بلکہ خود آپ کی ملکیت ہو۔ چنانچہ ہر طبقے کی طرف سے چندے کا ڈھیر لگ گیا۔ اس مرکز کی تعمیر شہر کے بہترین مقام پر ہوئی۔ اس میں ایک بڑا لیکچر ہال، ڈسپنسری، لائبریری، مسجد اور ایک مہمان خانہ قائم ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے علاقے کے عوام و خواص کے لیے مرکز نگاہ کی حیثیت اختیار کرگیا۔

○ **بعض اہم شخصیات:** میری یادداشت میں اب بھی اس دور کی بعض صورتیں نقش ہیں اگرچہ کچھ نام میں بھول گیا ہوں۔ مجھے شیخ محمد عبدالظاہر جو نکاح خواں اور لائبریری انچارج تھے اچھی طرح یاد ہیں۔ ایک متحرک شخصیت جنھیں اخوان المسلمون کے خلاف کارروائی میں اپنی زندگی قید میں گزارنا تھی۔ فنکار سعد شاذلی جو فطری مصور تھے، معطر اخلاق کے مالک جنھوں نے عقوبت سہتے ہوئے جان دی۔ ایک اور صاحب جو عدلیہ کے ممتاز مشیر (ایڈوائزر) تھے۔ ہمارے گھر آتے تو نماز کی امامت کرتے اور قرآن کی بعض آیتوں کی تفسیر کرتے۔ اچانک انکشاف ہوا کہ انھوں نے قرآن حفظ کرلیا ہے۔ محمد القرط مذبح خانہ کے نگران تھے۔ وہ بھی مغرب اور عشا کی نماز پڑھاتے تو ایسے خشوع اور مٹھاس سے قرآن پڑھتے کہ چٹان بھی پگھل جائے۔ طٰہٰ عبدالسلام تھے جنھیں کوئی مشکل سے مشکل کام بھی سونپا جاتا، تو اسے کرنے کے لیے فوراً تیار ہوجاتے۔ حسین اسدی جو قنا کے صنعتی علاقے میں مدرس تھے، ان کی بہت اہم ذمہ داریاں تھیں جن کا ذکر بعد میں کروں گا۔ یہیں احمد سنہوری بھی تھے جو ہمیشہ اپنے اصولوں پر ڈٹے رہے۔ اور ابراہیم دھمش جو تعلیم اور اخوان کے ساتھ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے۔

○ **قاہرہ میں:** جیسے ہی شیخ البنا قاہرہ پہنچے حسین سری پاشا حکومت کے ارادے ظاہر

ہوگئے۔ ان کی مطبوعات پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن اخوان نے بغیر کسی خوف یا دباؤ میں آئے اپنے اعصاب قابو میں رکھے۔ انھی دنوں غالباً ۱۹۴۱ء ماہ دسمبر کے اواخر کا ذکر ہے کہ قنا آنے والی ریل گاڑی میں جو شام سات بجے پہنچتی تھی، مجاہد و متقی رہنما صالح عشماوی مرحوم قنا تشریف لائے۔ وہ حکومت انگریز سے چھپ چھپا کر شہر کے کنارے واقع ایک بنگلے میں اخوانیوں سے ملے۔ یہاں انھوں نے عشا کی نماز ادا کی اور اہم معاملات میں مشاورت کی۔ اس موقعے پر انھوں نے اخوانی قیادت کے اہم فیصلے اور پالیسی ہم تک پہنچائی: ''ہم حکومت کو اشتعال نہیں دلانا چاہتے لیکن اگر ہمیں مجبور کر دیا گیا تو ہم پوری پامردی سے حکومتی جبر کا سامنا کریں گے بلکہ اسے گھیرنے کی پوزیشن میں ہوں گے''۔ فجر ہوتے ہی وہ دوبارہ قنا اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی پکڑی اور واپس روانہ ہوگئے۔ متعلقہ لوگوں کے علاوہ کسی کو ان کی آمد و رفت کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

ان کی روانگی کے بعد ہم نے مکمل منصوبہ بندی کی کہ ہم کیسے اہم مراکز پر انگریز کی مزاحمت کریں گے۔ بجلی و ٹیلی فون کی تنصیبات کے مراکز کو ہدف بناتے ہوئے کیسے چند منٹوں میں پورے شہر کی بجلی منقطع کر دیں گے۔ اس مہم کو کون اور کیسے سرانجام دے گا؟ چنانچہ مختلف اداروں میں کام کرنے والے ہمارے کارکن مختلف ضروری معلومات اور نقشے لے آئے۔ حسین رشدی نے بجلی منقطع کرنے کی تربیت اپنے ذمے لی کہ ہم کیسے بغیر تکلیف اٹھائے اہم مقامات کی بجلی معطل کر دیں۔ برطانوی افواج کے پڑاؤ اور اسلحے کے ذخائر کہاں کہاں ہیں، فوجی مداخلت کی صورت میں ہم کیسے ان کا مقابلہ کریں گے؟ مجھے نہیں معلوم ان دنوں قاہرہ میں کیا کیا ہو رہا تھا، لیکن چند ہی دنوں میں حسن البنا کو رہا کر دیا گیا، اخوان المسلمون سے پابندی اٹھا لی گئی۔ اور انھوں نے اپنی سرگرمیاں مزید زور و شور سے شروع کر دیں۔ اب انھیں غیر معمولی عوامی حمایت بھی حاصل تھی۔

قنا میں اخوان کی وسعت پذیر سرگرمیوں کے باوجود ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں پڑھائی کی حالت اچھی نہ تھی۔ اساتذہ کا معیار بہت پست تھا۔ تربیتی معیار بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ کسی کا کوئی قابل ذکر تخصص بھی نہ تھا۔ ہر استاد ہر مضمون پڑھا دیتا تھا۔ شہر کی ثقافتی زندگی کا حال بھی پتلا تھا۔ انھی دنوں معہد میں نئے ڈپٹی ڈائرکٹر کامل عجلان آئے جو صحافی اور ادیب تھے۔ انھوں نے ہمارے جامد افکار میں اپنے نئے اسلوب فکر و فہم سے تہلکہ برپا کر دیا۔ مجھے انھوں نے گھٹن کی

اس فضا سے نکل جانے کے لیے ابھارا اور میں نے قاہرہ سے کوچ کرنے کا ارادہ کرلیا، اور یہ فیصلہ کیا کہ انٹرمیڈیٹ قاہرہ سے مکمل کروں گا۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو میں قاہرہ پہنچا۔ تب قاہرہ میں طرح طرح کے مظاہرے عروج پر تھے۔ وفد پارٹی کی حکومت تخت مصر سے نہایت تلخ چپقلش کے بعد مستعفی ہوگئی تھی۔ شاہ فاروق نے احمد ماہر پاشا کو نیا وزیراعظم نامزد کیا تھا۔ پارلیمنٹ تحلیل کردی، اور پھر سے ایک ایسی سیاست کی ابتدا کردی گئی، جس کا مرکز شاہ فاروق کی ذات تھی۔

قاہرہ کے شور نے مجھے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا۔ طلبہ کے مظاہرے رکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اور طرح طرح کے ثقافتی اجتماعات، سوسائٹیوں، یونینوں اور یونی ورسٹیوں کی سرگرمیاں چین نہ لینے دیتی تھیں۔ ان میں سے بعض پروگراموں میں ہم ٹکٹ خرید کر شریک ہوتے تھے۔ اس لیے مجھے اخوان المسلمون کے مرکز سے دوبارہ رابطہ کرنے میں کچھ وقت لگا۔ یہ مرکز حلمیہ الجدیدہ کے ایک اہم میدان میں واقع تھا۔ یہ قاہرہ کے عین مرکز میں واقع تھا، تب یہ علاقے کی سربرآوردہ شخصیات کا ٹھکانا ہوا کرتا تھا۔

اس میدان میں اخوان کی دو عمارتیں تھیں۔ ایک پرانی طرز کی دومنزلہ عمارت جس میں اخوان کا پرانا مرکز اور ان کے اخبار کا دفتر تھا۔ دوسری ایک کشادہ و آرام دہ عمارت تھی جو اخوان نے حال ہی میں خریدی تھی۔ عمارت خریدنے اور ایک روزنامہ نکالنے کے لیے پورے مصر کی سطح پر اہلِ مصر نے تعاون کیا تھا۔ ملک کے تمام ہی طبقات، مال دار و فقرا، تعلیم یافتہ مزدوروں، مردوں، عورتوں اور بچوں تک نے اپنی بچتیں، اور زیورات تک اس مد میں دے دیے تھے۔ قاہرہ میں اس محل نما عمارت کے خوب صورت 'العربی ہال' میں میں نے پہلی مرتبہ حسن البنا کو قاہرہ میں دیکھا۔ ان کے گرد لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ مسئلہ فلسطین کے سلسلے میں منعقدہ اجتماعات میں سے ایک اجتماع کے بعد وہ عوام کو سلام کررہے تھے۔ انھی کے درمیان، میں نے امین الحسینی مفتی فلسطین اور بریگیڈیر صالح حرب صدر جمعیت شبان المسلمین کو دیکھا۔ وہاں دیگر بہت سی شخصیات کو میں نہیں جانتا تھا۔

میں نے مجمع چھٹ جانے کا انتظار کیا۔ پھر ان کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے فوراً پہچان گئے اور میرا پرجوش استقبال کیا۔ پھر عادت کے مطابق میرے اہل و عیال کے بارے میں فرداً فرداً دریافت

کیا۔ میری رہایش اور پڑھائی کے بارے میں پوچھا۔ پھر گاہے گاہے ملتے رہنے کے لیے کہا۔ میں اب اکثر مرکز آنے جانے لگا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ استاذ مرشد۔ یہ شیخ البنا کا لقب تھا، ہر منگل کو عشا کے بعد درس دیتے ہیں، اور یہ حالات کے مطابق دو گھنٹے اور کبھی تین گھنٹے تک طویل ہو جاتا۔ قاہرہ کے کونے کونے، اور آس پاس کے شہروں اور قصبوں سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ مرکز کا صحن اور سامنے والا میدان بھر جاتے، سامنے کی شاہراہوں پر بھی تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ لوگ اپنی کرسیاں ہمراہ لاتے یا قدموں پر ہی کھڑے رہتے تاکہ وہ اس الہامی شخصیت کو سنیں جس کی بلاغت بے مثل تھی، جو عوام کے دلوں تک پہنچنا جانتا تھا، صداقت جس کے عمل کی بنیاد تھی۔ ان کی گفتگو جامع ہوتی۔ دین، سیاست، معیشت، سماجیات، غرض یہ کہ ہر وہ موضوع جس کا تعلق زندگی سے ہوتا، ان کی تقریر اس سے سجی ہوتی۔ تقریر کے آخر میں عام سامعین کی باری ہوتی کہ وہ جو وضاحت طلب کرنا چاہیں اسے لکھ کر بھیج دیں۔ پھر نصف کلومیٹر کے فاصلے تک پھیلے ہوئے عوام کے اس اجتماع کی طرف سے آمدہ سوالوں کے جوابات لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے دے دیے جاتے، خواہ سوال کتنا ہی حساس کیوں نہ ہوتا۔

○ **ہمہ پہلو شخصیت**: امام حسن البنا کو اللہ تعالیٰ نے جامع کلمات عطا کیے تھے۔ وہ بلاغت کے اس اصول کا سب سے زیادہ پاس کرنے والے تھے کہ: ''ہر بات کا اپنا ایک موقع محل ہوتا ہے''۔ ان کے پاس ہر سطح کے لوگوں کے لیے مختلف انداز بیان ہوتا اور ہر نئے چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے مختلف گر ہوتے۔ وہ فصیح و جمیل عربی زبان پر ذخیرۂ الفاظ اور قواعد کے ذریعے مکمل گرفت رکھتے۔ پورے قرآن کے حافظ تھے۔ حدیث پر بھی گہری نظر تھی۔ دونوں کے اسرار کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اور نہایت مہارت سے علم کے ان دونوں سرچشموں کو کام میں لاتے۔ ساتھ ہی ساتھ معاصر ثقافت و معلومات کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ اس لیے جب وہ مختلف ملکی مسائل، عالمی نزاعات، سیاست، مذہب اور معاشرتی مسائل پر نہایت جرأت، بے خوفی اور مکمل اعتماد سے گفتگو کرتے تو سننے والوں کو مبہوت کر دیتے۔

ایک روز سوال کیا گیا کہ وزیراعظم اسماعیل صدقی پاشا نے اخوان کو فنڈ فراہم کیے ہیں تاکہ وہ ان کو اپنی سیاست کے ڈھب پر لا سکے؟ انھوں نے فرمایا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اصولاً جو

الزام لگاتا ہے اسی کو الزام ثابت بھی کرنا چاہیے۔ کیونکہ ثبوت کی فراہمی مدعی پر ہے۔ لیکن اگر الزام ثابت کرنے کے بجائے جھگڑے پر اتر آئے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور اس سے یہ کہو کہ بفرض محال اگر تمھارا الزام سچا ہے تو صدقی (وزیراعظم) نے اپنی جیب سے کچھ نہیں دیا۔ دنیا کو یہ جان لینا چاہیے کہ تحریک اخوان کسی بھی صورت اپنی دعوت یا طریق کار سے ایک انچ بھی نہیں ہٹ سکتی، خواہ کوئی اس کے بدلے اسے زمین بھر سونا ہی کیوں نہ پیش کرے۔

شیخ البنا کا ایک ہفتہ وار خطاب 'جمعرات کی بات' سے مشہور تھا۔ یہ یونی ورسٹی کے سطح کے طلبہ کے لیے ہوتا تھا۔ اس کا رنگ وعظ و بیان کے بجائے بحث و مباحثہ کا ہوتا جس میں ہر دفعہ کسی ایک موضوع پر گفتگو اور بحث و تمحیص ہوتی تھی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا کیونکہ یہ پروگرام شروع ہونے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد انھیں منصۂ حیات سے غائب کر دیا گیا۔

ایک دن میرے ایک رشتہ دار شیخ محمد الامیر، قاہرہ آئے۔ شیخ البنا سے گہرا تعارف رکھتے تھے۔ چنانچہ ہم ان کی زیارت کے لیے مرکز عام گئے۔ شیخ کی مصروفیات کے پیش نظر انھوں نے ہمیں اگلے دن صبح نو بجے گھر آنے کا کہا۔ مقررہ وقت پر ہم ان کے پاس پہنچے اس وقت وہ حلمیہ میں مرکز عام سے قریب سنجر الخازن روڈ کے قریب قدیم قاہرہ کے گھروں میں سے ایک گھر کی پہلی منزل میں رہایش پذیر تھے۔ انھوں نے سیڑھیوں کے ساتھ متصل کمرۂ استقبال میں ہمارا استقبال کیا۔ میں نے ایک گہرے سکوت کے عالم میں اس شخص کے گھر کا جائزہ لینا شروع کیا کہ جب وہ بولتا تھا تو ہزاروں انسانوں کے جذبات جھنجھوڑ دیتا تھا، جس کے اردگرد عرب مجاہدین جمع رہتے تھے، جس کے ساتھ ہم وطنوں کی بے شمار آرزوئیں وابستہ تھیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کا گھر نہایت سادہ سا تھا۔ در و دیوار تو لائبریری نے گھیر رکھے تھے۔ تیسری طرف ایک سادہ سی ڈیسک تھی جس کے سامنے بانس کی دو کرسیاں تھیں جن پر ہم بیٹھ گئے' جب کہ وہ خود اپنی ڈیسک پر بیٹھ گئے۔ ہم سب کے لیے چائے آگئی۔ وہ دونوں بالائی مصر (صعید) اور اس کے قصبوں میں اخوان کی تنظیم کے موضوع پر اور وہاں سے قاہرہ آنے والے نوجوانوں کی تعلیم کے بارے میں محو گفتگو ہو گئے۔

اس زمانے میں اخوان محض ایک دینی یا سیاسی گروہ نہ تھا' بلکہ ایسی غالب قوت تھی جو سڑک، یونی ورسٹی اور فیکٹری پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی حرکت ایک محکم نظام کے مطابق ہوتی تھی

اور اس کے معاملات کو شعبوں اور اداروں کے ذریعے منظم کیا گیا تھا۔ وہ مصر میں پہلی ایسی جامع تنظیم تھی جو ایک مضبوط طریق کار کی روشنی میں عالم عرب و عالم اسلام کے معاملات پر نظر رکھتی تھی۔ عالم اسلامی سے رابطے اور وہاں جاری مختلف تحریکات آزادی و اصلاح سے یک جہتی کے لیے ایک علیحدہ شعبہ قائم تھا۔ ادارے اس کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور جدوجہد کو مہمیز دینے کا ممکنہ حد تک اہتمام کرتے۔

○ **فکر و عمل کی ہم آہنگی**: انھی دنوں حسن البنا نے بحیثیت عربی ٹیچر کے اپنی ملازمت سے استعفا دے دیا تاکہ وہ اپنا کُل وقت دعوت کے میدان میں دے سکیں۔ اپنی ذاتی سادہ سی زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے انھوں نے مجلّہ المسلمون نکالا جس میں وہ خود اور چند دیگر علما و محققین لکھا کرتے تھے، اور اس کی محدود آمدن سے گزر بسر کرتے تھے۔

شیخ البنا میری رائے میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کا عمل ان کے فکر سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھا۔ ان کے عمل اور دعوت میں کوئی تضاد نہ تھا۔ میرا ان پر یقین اور محبت ایک الہامی قائد کی حیثیت سے تھی۔ ان کی شخصیت کی یہ جھلک میں مجلّہ نذیر اور مجلّہ دعوۃ کے مدیر مرحوم صالح عشماوی میں دیکھا کرتا تھا اگرچہ انھیں شیخ البنا جیسی بلاغت، بے ساختگی اور حکمت نہ ملی تھی۔ لیکن وہ بھی 'فنافی الدعوت'، زمین پر چلتا پھرتا مجسمۂ اخلاص تھے۔

○ **کھلی برطانوی مداخلت**: جنگ فلسطین اول کے موقع پر ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو باقاعدہ فوجوں کے داخلے سے پہلے جہاد فلسطین میں اخوان کا کردار بے حد مرکزی اور بنیادی تھا۔ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو باقاعدہ افواج کی آمد سے پہلے وہی میدان کارزار سنبھالے ہوئے تھے۔ جنگ کے بعد بھی مصری سیاست میں اخوان ہی اصل قوت تھے۔ کوئی اسے نظرانداز نہ کرسکتا تھا۔ مصر سے انگریز کو نکالنے کے لیے عوام کو حرکت میں لانے اور قیادت کی فراہمی میں اخوان نے نہایت اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ اسی سال نومبر میں انگلینڈ، فرانس اور امریکا کے اعلیٰ سفارت کاروں نے 'فاید' نامی ایک بستی میں اپنا خفیہ اجلاس بلایا۔ 'فاید' بھی نہر سویز کے دونوں کناروں پر واقع تمام علاقوں کی طرح برطانوی افواج کے قبضے میں تھا۔ ان سفارت کاروں نے وزیراعظم نقراشی پاشا سے اخوان المسلمون پر پابندی لگوائیں۔ مشرق وسطی میں برطانوی فوجوں کے سیاسی امور کے نگران

جورج اوپرایان، نے مصر اور بحر متوسط میں برطانوی فوجوں کے تحت کام کرنے والی انٹیلی جنس ایجنسی کو ایک خط بھیجا جس میں اس میٹنگ کی کارروائی اور فیصلے سے مطلع کیا گیا، اور بتایا گیا کہ قاہرہ میں برطانوی سفارت خانہ اخوان المسلمون کی تحلیل کے لیے ضروری اقدامات کرے گا۔

دو ہفتے کے اندر اندر اس اجتماع کے نتائج سامنے آگئے۔ ۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو نقراشی پاشا نے افواج کے کمانڈر کی حیثیت سے اخوان المسلمون پر پابندی لگانے اور اس کی تمام املاک، فنڈ اور ادارے قبضے میں لینے کا حکم دے دیا۔ اس نے اخوان کے اخبارات پر پابندی اور اس کے ہزاروں کارکنوں کی گرفتاری کے احکامات جاری کردیے۔

حسن البنا نے کوشش کی کہ بحران کے حل کے لیے وہ وزیراعظم سے بات کریں، کیونکہ وہ حکومت سے ٹکراؤ نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ اخوان المسلمون کی قوت اور جہاد فلسطین میں عملی جنگی تجربات کے بعد وہ اس قابل تھے کہ حکومت سے ٹکرا جائیں اور فتح حاصل کریں۔ مگر شیخ البنا اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ ایک لاکھ سے زیادہ برطانوی فوجی قنا کے صوبے میں مناسب موقع کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں اور نئے سرے سے مصر پر قبضہ کے لیے تیار ہیں، اور یوں وہ نومولود تحریک احیا کو اس کے جنم کے ساتھ ہی دفن کردینا چاہتے ہیں۔ حسن البنا نہیں چاہتے تھے کہ یہ المیہ دوبارہ رونما ہو۔

نقراشی بہرصورت حکمران رہنا چاہتے تھے اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب شاہ فاروق اور انگریز ان سے خوش ہوں۔ چنانچہ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اصلاح احوال کی کسی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اخوان پر پابندی کے فیصلہ کے ۲۰ دن بعد ۲۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ایک طالب علم نے نقراشی پاشا پر گولی چلادی جو اس کی موت کا باعث ہوئی۔ یہ طالب علم پولیس کی وردی میں ملبوس تھا۔

○ **۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کا حادثہ:** نقراشی کے بعد ایک نہایت کمزور، بودے، ہر قیمت پر زندہ رہنے کے حریص شخص ابراہیم عبدالہادی کو وزیراعظم بنایا گیا۔ یہ اس سے پہلے قصر شاہی کے سیکرٹریٹ کا سربراہ تھا۔ اس نے مصر کو بغیر کسی تحقیق اور ثبوت کے فوجی عدالتی کارروائیوں اور پے در پے گرفتاریوں کی نذر کردیا۔ اس کے دور اقتدار میں مصر نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ سیاسی

گرفتارشدگان کو اندوہ ناک اذیتیں ملتے دیکھا۔

دوسری طرف کچھ ادارے یہ چاہتے تھے کہ اخوان المسلمون کے مرشد عام سے نجات حاصل ہوجائے۔ ان میں سرفہرست خود شاہ فاروق تھا، جو اس بات کو نہیں بھلا سکا تھا کہ جنگ فلسطین میں مصر کی دو بنیادی قوتوں نے حصہ لیا تھا۔ ایک تو مصری افواج جو اپنے سپریم کمانڈ، یعنی شاہ فاروق سے احکام لیتی تھیں، اور دوسرے اخوان المسلمون کے دستے جو حسن البنا سے احکام وصول کرتے تھے۔ حسن البنا کے مجاہدین اپنی تربیت قوتِ ایمانی اور بہترین اسلحے کی وجہ سے ممتاز تھے۔ قربانی اور فداکاری کے جذبے کے لحاظ سے بھی نہایت فعال اور نمایاں تھے۔ انھوں نے کسی ایک معرکے میں بھی شکست نہیں کھائی تھی۔ چنانچہ وہ (شاہ فاروق) ان سے خوف محسوس کرنے لگا۔ خود انگریز اور صہیونی بھی ان نوجوانوں کے جذبۂ قتال کو دیکھ چکے تھے۔ سو یہ ہدف پر متفق ہوگئے اور ابراہیم عبدالہادی کی حکومت کو اکسایا کہ وہ حسن البنا کو ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء بوقت شام آٹھ بجے قتل کردیں۔ حملے کے بعد حسن البنا خود ٹیکسی سے اترے۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھے۔ انھوں نے جمعیت شبان المسلمین کے فون پر بے ہوش ہونے سے پہلے دو ہندسے ڈائل کیے، لیکن پورا نمبر ڈائل کرنے سے پہلے ہی بے ہوش ہوگئے۔ انھیں ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے کا دعویٰ کرتے ہوئے قریبی ہسپتال اور وہاں سے قصرِ عینی لے جایا گیا اور وہاں انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

○ **اللہ کی رحمتیں ہوں ان پر**: اگلی صبح میں اپنے گھر کی کھڑکی میں کھڑا تھا جو سیدہ عائشہ میدان میں واقع تھا۔ یہیں سے ایک راستہ امام شافعی قبرستان کی طرف جاتا تھا۔ میں نے ایک 'میت گاڑی' دیکھی، جسے مسلح پولیس کی ایک بھاری نفری گھیرے میں لیے ہوئے تھی اور پیچھے بکتر بند گاڑیاں چل رہی تھیں۔ آگے پیچھے فوجیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ کسی کو جنازے میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے کوئی شک نہ رہا کہ اس میں شہید کا جسد خاکی جارہا ہے۔ میں رویا نہیں، کیونکہ آنسو میری آنکھوں میں خشک ہوگئے تھے اور غم کی چادر مجھ پر تن چکی تھی، وطن عزیز کے مستقبل کے بارے میں لاحق غم کی چادر۔ میں نے دل کی گہرائی سے شہید کی روح پر فاتحہ پڑھی۔

❋❋❋

کچھ یادیں اور تاثرات

محمد عبدالحمید ○

عصر حاضر میں مسلمانوں کی نوجوان نسل کو امام البنا اور ان کی فکر و تحریک کے بارے میں پوری آگاہی کے ساتھ غور و خوض کرنا چاہیے، اس کے مختلف پہلوؤں پر پورے خلوص' سنجیدگی اور باریک بینی کے ساتھ نظر دوڑانی چاہیے۔ اس سے ان پر یہ حقیقت کھل کر واضح ہو جائے گی کہ کس طرح انسانوں کو راہ راست پر لاکر منظم کیا جاسکتا ہے، اور کس طرح انھیں دعوت کے کام پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ انھی کاوشوں کے نتیجے میں اب عالمِ اسلام آزادی اور عروج کے حصول کی جانب تیز رفتار پیش قدمی کر رہا ہے، بالکل اس شیر کی طرح جسے بیڑیوں میں جکڑ دیا گیا ہو' یا جیسے کسی شاہین کے پر کاٹ دیے گئے ہوں لیکن پھر بھی وہ پہاڑوں کی بلندیوں میں اپنے بسیرے کی تلاش میں پھڑپھڑا رہا ہو۔

عالم اسلام کے ہر فرد پر واجب ہے کہ وہ ہر قسم کے لالچ' خوف' بزدلی اور مایوسی سے پاک، بیداریِ اُمت کے قائد کی یاد تازہ کریں، اس کی فکر کے اسلوب اور طریقۂ تربیت سے آگاہی حاصل کریں۔ امام شہیدؒ کو اس امت کا اصل مرض بخوبی معلوم تھا اور پھر وہ اس مرض کی دوا اور حقیقی علاج

○ اخوان المسلمون کے حلقوں میں ابوالجامعیین کے نام سے معروف تھے، چونکہ وہ یونی ورسٹی میں پڑھنے والے پہلے طالب علم تھے جو باقاعدہ جماعت الاخوان المسلمین میں شامل ہوئے۔ آپ اخوان کے 'شعبہ امور طلبہ' کے ذمہ دار رہے۔ آپ کا تعلق امام حسن البنا کے ہاتھوں تربیت پانے والی اخوان کی اوّلین نسل سے تھا، عملی زندگی میں جامعہ اُم القریٰ مکہ میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ـــــ ترجمہ: محمد کاشف شیخ

سے بھی پوری طرح آشنا تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہ ہونا ہی اصل مرض ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت ہی اس امت کا حقیقی علاج بھی ہے۔ انھیں اس بات کا پورا پورا ادراک حاصل تھا کہ نفس انسانی میں دو اطراف سے کمزوری در آتی ہے، جس کے بعد وہ جہاد فی سبیل اللہ ترک کر بیٹھتا ہے۔ وہ دو چیزیں حرص اور خوف ہیں۔ اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کے تنہا رازق ہونے اور اسی کی طرف سے موت کا یقین ہو جائے تو وہ کبھی حق سے جی چرائے گا اور نہ پسپائی ہی اختیار کرے گا۔

انھوں نے کیسی خوب صورتی سے اس مفہوم کو اپنے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''اے میرے بھائیو! تمھیں اس دنیا میں صرف دو باتوں کا لالچ ہوتا ہے: ایک اپنے رزق کا اور دوسرے لمبی عمر کا۔ دونوں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے قابو میں نہیں ہیں۔ اس لیے ان چیزوں کے لالچ میں آکر کبھی حق کا راستہ مت چھوڑو''۔

اصلاح نفس میں معرفت خداوندی اور اس کی قدر و قیمت سے متعلق ان کا ایک شان دار قول ان کی بلند فکری پر دال ہے: ''معرفت خداوندی تبدیلی کا ایک مؤثر ذریعہ ہے جو فرد اور اجتماعیت دونوں کو بدل کر رکھ دیتا ہے''۔ ان کے نزدیک اصلاح معاشرہ، نفس کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں اور اصلاح نفس معرفت خداوندی کے ذریعے ہوتی ہے۔ گویا معرفت خداوندی ایک ایسی اساس اور کنجی ہے جس پر فرد اور اجتماعیت دونوں کے نظم کا دار و مدار ہے۔ ہم سب کے حکیم و خبیر رب نے فرمایا ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ○ (الشمس ۹۱: ۷-۱۰)''اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا''۔

امام شہیدؒ میں ایسی روحانی خصوصیات جمع ہوگئی تھیں، جو ان کے علاوہ کسی دوسری دینی یا سیاسی شخصیت یا ان کے معاصر قائدین میں نہیں ملتیں، مثلاً: فطری عظمت، روحانی بلندی، پاکیزگی نفس، روشن ضمیری، سخن دل نوازی، توانا جسم۔ آپ ایسی سحرانگیز قوتوں کے مالک تھے کہ آپ کے ساتھ کوئی ایک مرتبہ بیٹھ جاتا تو اس کا ظاہر و باطن اسلام کے رنگ میں رنگے بغیر نہ رہتا۔ ان کی روحانی شخصیت ہر شخص کو روشنی اور سربلندی کی جانب کھینچ لاتی تھی۔

داعیانہ کردار ایسا تھا کہ ہر کسی کو نیکی اور عبادت کی طرف متوجہ کرتے رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شہیدؒ میں اسی بندۂ مومن کی فطرت جھلکتی ہے جس کی تعریف کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اذا رؤی ذکر اللہ ، کہ اسے دیکھ کر اللہ یاد آجاتا ہے۔ ایمان کی کیفیت جو دین کے ایک سپاہی، عام بندۂ مومن میں بڑی آسانی سے جھلکتی ہو، وہ مسلمانوں کے اس قائد میں کس قدر نمایاں طور پر دکھائی دے گی، جو نہ صرف دوسروں سے منفرد ہو بلکہ لوگوں کو بیدار کرنے والا وقت کا جلیل القدر امام بھی ہو۔

امام شہیدؒ کے اثرات ایک کھلی کتاب کی مانند ہیں، جو ان کی روحانیت کی روشن دلیل ہیں۔ وہ ایسی بے مثال شخصیت ہیں جیسے وہ ان الہامی روحوں اور پاک باز ہستیوں کی کرنوں سے مل کر بقعۂ نور بن گئے ہوں، جو اپنے چہار اطراف میں روشنی اور تروتازگی بکھیرتے ہیں۔ حسن البنا شہید آپ کے روح و قلب کو منور اور معطر کرنے والی باتیں بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں، جنھیں دیکھ کر آپ دل کی اتھاہ گہراہیوں سے بے اختیار پکار اٹھتے ہیں: مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف ۱۲:۳۱) ''کہ یہ تو کوئی مقرب فرشتہ ہے، یہ انسان تو نہیں لگتا''۔

وہ اپنی ذات میں ایک ایسا سیل رواں تھے جو کسی اور کا اثر قبول کیے بغیر دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہو، جو مسلسل پیش قدمی کرتا ہو، کبھی پیچھے نہ ہٹتا ہو، اس کی تیز روشنی میں ہر چمک دار چیز بھی مدھم پڑ جاتی ہو۔ وہ مثل آتش فشاں تھے جس کے آگے کوئی بند اور رکاوٹ نہ ٹھیر سکے۔ دلوں پر نرمی، آسانی اور مہربانی کے ساتھ مسلسل اثر انداز ہوتے جیسے کوئی پرسکون نالہ جو پہاڑوں اور وادیوں کے درمیان بہتا چلا جائے جس سے پورا علاقہ سرسبز و شاداب اور بارونق ہو جائے۔

ایسی عظیم شخصیات قدرت کا عطیہ ہوتی ہیں، بلند و بالا آفاقی نظریات کی حامل، جو نہ گھٹیا خصلتوں کو اپناتی ہیں، نہ خوں خوار پرندوں اور لومڑیوں کی سی عیاری سے کام لیتی ہیں۔ یہ آفاقی خوبیاں نہ علم کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہیں اور نہ تگ و دو کر کے اختیار کی جاسکتی ہیں۔ یہ تو خداداد صلاحیتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ان خوبیوں سے نوازتا ہے۔

امام شہیدؒ بھی ان پاکیزہ نفوس میں سے ایک تھے، جو ہر طرف روشنی بکھیرنے والے مستقل مزاجی سے کام کرنے والے اور ہر گام خوشبو مہکانے والے تھے۔ امام شہیدؒ کی نمایاں خصوصیات

میں سے ان کا تحریکی مزاج اور ان کی وہ قوت عمل ہے جو ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔

آپ حیران کن حد تک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ آپ تن تنہا مادی طاقتوں اور دنیا کے خودساختہ قوانین کے آگے کسی وقت بھی نہیں جھکتے تھے اور ہر دم بیدار، انتہائی سرگرم اور روشن فکر کے حامل تھے۔ ان کے فکر و عمل اور راہ نمائی و تربیت کے حلقات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا، جس کے لیے وہ اپنے پرایوں سب میں یکساں مقبول، انتہائی مخلص اور عوامی قائد کے طور پر ابھرے تھے۔ انھی کے درمیان اٹھتے بیٹھتے تھے۔ وہ شروع دن ہی سے مصر کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے گروہوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ انھیں مختلف طبقات کو درپیش معاشی اور سماجی تکالیف اور مشکلات کا بھی شدت سے احساس تھا۔

امام شہیدؒ نے عام روش سے ہٹ کر بالکل علیحدہ راہ اختیار کی۔ ان کی نگاہ، بلند و بالا عزائم اور مقاصد پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر اقدام ممتاز ہوا کرتا تھا۔ آپ کی کاوشیں کسی ایک فرد تک محدود نہ ہوتیں، بلکہ پوری امت کا احاطہ کرتیں۔ ان کو یہ بات معلوم تھی کہ ان کی زندگی جاری دعوت کے کام سے بہت کم ہے۔ اسی لیے انھوں نے دعوت دین کے لیے ہر قسم کے وسائل و ذرائع کو ممکن بنانا چاہا اور اس کی حفاظت کا پورا بندوبست کیا۔ اس کے لیے ممکنہ حد تک افراد اور وسائل کی فراہمی پر توجہ دی۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ معاشرے کی مشکلات پر قابو پانے کے لیے ان کا محدود وقت بالکل ناکافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر جگہ اس بات کو بطور علامت (سلوگن) عام کر دیا: ''فرائض، اوقات سے بہت زیادہ ہیں''۔

دائمی تحرک اور فوری عمل درآمد آپ کا شعار بن چکا تھا۔ آپ دعوت کی ضروریات اور تقاضے پورا کرنے میں دیوانہ وار لگے رہتے، جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ وہ کسی قسم کی خامی یا کوتاہی سے بچتے ہوئے نتائج کے حصول پر پوری توجہ مرتکز رکھتے تھے۔ وہ تیزی میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیتے تھے۔ ان کی سرگرمیاں بڑی مستحکم تھیں۔ ان کی متوازن اور پاکیزہ شخصیت اس روشن چراغ کی مانند تھی جس کے تھوڑے سے تیل کا آخری قطرہ خشک ہونے کے بعد بھی اس کی لو نہیں بجھتی، جس کی پاکیزہ قوت کا آخری قطرہ بھی بہا دیا جائے تب بھی وہ کلمۂ شہادت کا ورد کرتا رہے۔ ان کی ہمت، استطاعت سے کئی گنا بڑھ کر تھی اور یہ استطاعت ہر قسم کی تھکاوٹ اور تنگیِ وقت سے

بالاتر تھی۔ یہی وجہ ہے ان کی استطاعت عام انسانی استعداد سے بازی لے گئی تھی۔ ان کے شان دار کارنامے اولیا کی کرامات سے کسی طرح کم نہیں، جن میں ان کی پُرحکمت کاوشوں کا پورا دخل ہے۔

اخیر عمر میں ان کے ایک ساتھی نے جب دیکھا کہ نہ تو آپ رات میں ٹھیک سے سوتے ہیں اور نہ دن میں آرام لیتے ہیں' تھوڑی دیر کے علاوہ رات بھر یوں ہی جاگ کر کاٹ دیتے ہیں تو انھوں نے مشورہ دیا: ''جناب مرشد! آپ کو کچھ دیر نیند یا آرام کر کے اپنے جسم پر رحم کرنا چاہیے''۔ اس کے جواب میں امام شہیدؒ نے کہا: ''میرے پیارے! کل میں قبر میں لمبی نیند سوؤں گا اور خوب آرام کرسکوں گا''۔

تائید ایزدی سے وہ ایسی عزیمت کے مالک تھے، جس کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ان میں ایک پورے مضبوط گروہ سے بڑھ کر ہمت و جرات تھی۔ دعوت دین کے کاموں میں یوں لگے رہتے گویا وہ تنہا ہی اس کے مکلف ہوں۔ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے کہ انھیں کیا ہوگیا ہے کہ انھوں نے اتنا بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے؟

آپ نے لوگوں کے ساتھ اتنا گہرا تعلق بنالیا جیسے پھول اور خوشبو کا باہمی تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ آپ کی سخت مصروفیات' مشکلات کو جانتے ہوئے بھی خط لکھ کر اپنی نومولود بچی کا نام تک دریافت کرتے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے یہ شخص گناہ گار تھا اور اب دنیا کی تکالیف اور مشکلات کو برداشت کر کے اپنے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ تو اس سے پہلے بھی اچھی روش پر ہی قائم تھا۔ وہ ان تکالیف و مشکلات کو برداشت کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند درجات کے طلب گار تھے۔

امام شہید ۱۹۰۶ء میں امام محمد عبدہٗ کی وفات کے سال پیدا ہوئے اور انھوں نے ۱۹۲۸ء میں سعد زغلول کی وفات کے بعد اسی سال اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ انھوں نے امام عبدہٗ کی دعوت میں عسکریت کا اضافہ کردیا اور سعد زغلول کی دعوت پر اسلامی افکار غالب کردیے۔ اس لحاظ سے موجودہ اسلامی تحریک کو نبی کریمؐ کے عہد میں پہلی اسلامی تحریک کے اتباع میں دوسرا اڈیشن شمار کیا جاسکتا ہے۔

***



قاضی گروپ آف کمپنیز کی تاریخ گزشتہ کئی برس پر محیط ہے۔ ادارے نے 20/25 سال قبل پراپرٹی اور رئیل اسٹیٹ کے شعبہ میں قاضی انٹرپرائزز کے نام سے کاروبار کا آغاز کیا۔ الحمدللہ جس ادارہ کی بنیاد تقویٰ، توکل، ایمانداری اور جذبہ خدمت پر رکھی گئی اس کو اللہ تعالیٰ نے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دی۔ رب رحیم کے احسان خصوصی اور کارکنوں کی انتھک محنت سے ادارہ نے ترقی کی منازل طے کیں۔ ادارہ کے کارکنوں کی شبانہ روز محنت کے نتیجے میں اس ادارے نے گروپ آف کمپنیز کی صورت اختیار کرلی۔

الحمدللہ قاضی انٹرپرائزز کو اب تک کئی منصوبے مکمل کرنے کا اعزاز حاصل ہے، جہاں ممبران یا تو رہائش پذیر ہیں یا اپنے مکان/فلیٹ فروخت کر کے کئی گنا منافع کما چکے ہیں۔

مکمل اور آباد منصوبے

[illegible] ٹاؤن سہالہ	[illegible] ٹاؤن سہالہ	گلستان راشد سہالہ
[illegible] ٹاؤن سہالہ	[illegible] سہالہ	[illegible]

زیر تعمیر منصوبے (بکنگ جاری)

[illegible]	[illegible] ٹاؤن [illegible]	اسلام آباد [illegible] ٹاؤن [illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں:
قاضی انٹرپرائزز
www.qazi.com.pk
B بلاک، [illegible] روڈ، راولپنڈی
U.A.N:111-700-400 فیکس: 051-5862230
Email: shaukat@isb.comsats.net.pk

368



قرطبہ کریک ویلی گوادر کی شاندار کامیابی کے بعد احباب ڈویلپرز اب پیش کرتے ہیں
گوادر میں دوسرا منصوبہ قرطبہ کریک ایگرو فارمز گوادر (ایکڑ سکیم)
اک خواب جس کو تعبیر ملی
قرطبہ کریک
ایکڑ سکیم گوادر
Gwadar
FARM HOUSES
OF 1&2 ACRES
200 SQ YDS
تحصیل گوادر مین کوسٹل ہائی وے اور جیوانی روڈ سے متصل موضع (ذبارڈن)
ہم فائلوں کا کاروبار نہیں کرتے
پہلے آیئے پہلے پایئے!
(4000 Sq / yd)
قیمت -/950,000 فی ایکڑ
بکنگ -/150,000 روپے فی ایکڑ
بقایا رقم 4 سال کی 16 آسان سہ ماہی اقساط میں
30 جون 2007
-/100,000
142-2011115-001
تحریک اسلامی سے وابستہ افراد کا قابل اعتماد ادارہ
احباب ڈویلپرز
Marketing Office: Weal House, Faiz Road, Muslim Town Lahore.
Ph: +92-42-5846830, 5846831 Fax: +92-42-5847708
Saudia Office: +966-553868843
Raheel Ahmed: 0300-8422787 - 0300-4007661
Website: qurtabacreekvalley.com Email: info@qurtabacreekvalley.com

داعی، امام اور قائد

ڈاکٹر غازی صلاح الدین ○

اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ کیا امام حسن البنا کی زندگی کسی غیر مسلم کے لیے بھی قابلِ تقلید ہوسکتی ہے، تو بلا جھجک میرا جواب ہوگا: 'ہاں'۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس سوال کو غیر حقیقت پسندانہ قرار دیں، لیکن دراصل یہ اس مشترک انسانی رشتے کی قیمت کو نمایاں تر کرنے کی ایک کوشش ہے، جو امام شہید حاصل کرنا چاہتے تھے اور یہی ان کی کامیابی ہے۔

امام البنا شہید ہر لحاظ سے ایک کامیاب شخص تھے۔ اسی لیے ان کے دشمنوں کو قتل کے سوا ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امام شہید کی سیرت مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے لیے ایک پُرکشش اور قابلِ تقلید نمونہ تھی۔

بہت سے بڑے لوگوں کی مانند میدان دعوت میں ان کی عملی زندگی بھی نہایت مختصر تھی، تقریباً ۲۰ برس۔ ابھی عمر کے ۴۲ ویں برس میں تھے کہ مہلت زندگی ختم ہوگئی۔ اس کے باوجود جب وہ اپنی زندگی کا مشن مکمل کر کے خالق حقیقی سے ملے تو ان کے افکار اور دعوت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ آپ کی دعوت کا پھیلاؤ آج بھی مسلسل جاری ہے اور واقعات عالم کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر رہا ہے۔

امام نے کامیابی کے اس سفر میں جن صفات سے مدد لی ان میں سے ایک ہر دل عزیزی تھی۔ وہ اپنے افکار و اقوال میں عام فہم اسلوب اور دل نشین اختیار کرتے تھے۔ ایسے کلمات جو سننے

○ مشیر صدر جمہوریہ سوڈان۔ ترجمہ: حافظ محمد عبداللہ

والے کے دل میں براہ راست اتر جائیں، جن میں نہ تو کوئی تصنع ہوتا اور نہ تکلف۔ وہ اپنے خطاب کا رخ عامۃ المسلمین اور مسلمانوں کے سواد اعظم کی طرف رکھتے، کبھی اسے مقتدر اور باوسائل طبقے تک محدود نہ رکھتے۔ اگرچہ یہ طبقۂ خواص بھی دعوت کا بلا استثنا مخاطب تھا، لیکن امام اپنی قائدانہ فراست سے بھانپ گئے تھے کہ خیر اور برکت، سواد اعظم کو مخاطب کرنے میں ہے۔ آپ نے عوام سے ربط و تعلق بڑھایا اور عوام کے دل آپ کی ذات سے وابستہ ہو کر رہ گئے۔

امام اپنے مقاصد اور اہداف کی تکمیل کے لیے مسلسل محنت کرتے، جو ایک بے مثل قائد کی صفت ہوا کرتی ہے۔ انھوں نے جب دعوت کا آغاز کیا تو بظاہر دعوت کے پھیلاؤ اور مقبولیت کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سارے اشارے منفی ہی تھے۔ اگر کسی عام آدمی کو وہ مشکل حالات پیش آتے جن کا سامنا امام کو تھا، تو شاید وہ اپنی قسمت کو کوستے ہوئے اپنے خواب اور امیدیں دل میں لیے اس سارے کام کو لپیٹ چکا ہوتا۔

امام شہید ایک ایسے منبع سے سیراب ہوئے تھے جس کی وسعت لامحدود ہے۔ آپ اس منبع کی اساس کو پاچکے تھے اور آپ کا ایمان تھا کہ اسی مرکز ایمان و حرارت سے آنے والی مدد لامحدود ہے۔ ہر طرح کی مشکلات کے علی الرغم آپ اپنے سامعین تک پیغام پہنچانے اور اسے ان کے دلوں میں اتارنے میں کامیاب ہوگئے۔ آپ مستقل مزاج بھی تھے اور مدبر بھی، اسی لیے بخوبی جانتے تھے کہ اپنے اوقات کو کیسے منظم کرنا ہے اور ترجیحات کو کیسے ترتیب دینا ہے۔ اس راز کو پانا بھی کامیاب ذہن اور کامیاب لوگوں کے امتیازات میں سے ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ شہید نہایت کم سوتے (قلیل النوم) تھے، اور اپنا زیادہ تر وقت فرائض کی ادائیگی، بڑے اور اہم دعوتی امور کی تکمیل میں صرف کیا کرتے۔ اگرچہ جماعتی ذمہ داریاں اور پھر اہل خانہ اور عزیز واقارب کا بھی خیال رکھتے تھے، تاہم بیش تر وقت دعوت کے لیے وقف تھا۔

عظیم قائدین کی مانند ان کے پاس بھی اپنی ذات کے لیے علیحدہ سے کوئی ایسا وقت نہیں تھا کہ جسے دعوتی امور اور لوگوں کا ہجوم مکدر نہ کردیتا ہو۔ ان کے ہاں نہ تو چھٹی کا تصور تھا اور نہ راحت و آرام ہی کا، بلکہ ان کی زندگی مسلسل کام اور پیہم جدوجہد سے عبارت رہی۔

وہ پورے مصر کا دورہ کرتے اور جگہ جگہ خطاب کرتے رہے۔ اپنے منہج اور اپنے افکار کو

قلم بند بھی کیا اور اپنے ساتھ چلنے والوں کی بڑھتی وپھیلتی تعداد کو منظم بھی کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنی دعوت کو مصر سے باہر عالم اسلام بالخصوص عرب ممالک میں پھیلانا شروع کیا۔ ان کی دعوت کا اصل جوہر یہ تھا کہ دین ایک مکمل نظام حیات ہے۔ زندگی کا کوئی رخ اور میدان ایسا نہیں ہے، جس کے بارے میں اس میں ہدایات نہ ملتی ہوں۔

جب یہود اور مسلمانوں کے درمیان جنگ چھڑی، اور انگریزوں نے مملکت اسرائیل کے قیام کا فیصلہ کیا تو آپ نے داد شجاعت دینے کے لیے اخوان المسلمون کے رضا کار مجاہد دستے فلسطین روانہ کیے، اور اس طرح گذشتہ صدیوں کی ذلت وپستی کے باعث بھولے ہوئے فریضۂ جہاد کے احیا کا کارنامہ سرانجام دیا۔ تاریخ مصر کے ان عشروں پر نظر رکھنے والا ہر مصنف فرد بخوبی جان سکتا ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں اور اوپر تلے بننے والی متعدد حکومتیں مسائل اور معاملات کو روایتی طریقے سے دیکھ رہی تھیں۔ کسی کے پاس بھی اپنے طریقے کی سچائی اور منشور کی درستی کا امام جیسا یقین اور اعتماد نہیں تھا۔

اپنی اس صفت کے لحاظ سے امام اپنے ہم عصر قائدین میں فائق تر بلکہ بے مثال تھے۔ امام حسن البنا شہید کے زمانے میں مصر میں بڑے معروف خطبا موجود تھے جو کلام کریں تو لوگ خاموشی سے سنیں اور اشارہ کریں تو لوگ متوجہ ہو جائیں۔ امام حسن البنا کی خطابت میں ان کی سی سحر آفرینی تو نہ تھی، لیکن آپ کے کہے ہوئے کلمات ان کے کلمات سے زیادہ سچے اور زیادہ اثر آفرین ثابت ہوا کرتے تھے۔ عام خطبا میں سے شاید ہی کوئی مقرر مجمع عام سے اتنا قریب تر ہوتا ہو اور کوئی مجمع کسی مقرر سے شاید ہی اس قدر متاثر ہوتا ہو جتنا امام سے ہوتا۔ ان کے اور عام خطبا کے درمیان فرق یہ تھا کہ آپ کے گفتار کی گواہی آپ کا کردار دے رہا ہوتا تھا۔

پھر اس میں تعجب ہی کیا تھا کہ حکومت ان سے تنگ پڑ گئی اور ہر ناپاک ہتھکنڈا آزمانے پر تل گئی۔ انھیں قاہرہ بدر کر دیا گیا۔ یوں سامراجی حکمرانوں نے تو چاہا تھا کہ اس سے امام کی آواز دب جائے گی اور آپ کا اثر کمزور پڑ جائے گا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ ان کی دعوت میں مزید وسعت آگئی اور ان کی صدا کا اثر ونفوذ بڑھتا چلا گیا۔

آپ نے زندگی بھر کبھی مغربی علوم نہیں پڑھے، نہ معاصر یورپی ثقافتی ادب کی طلب کبھی

آپ کے دل میں پیدا ہوئی۔ آپ کی رسمی تعلیم و تربیت دارالعلوم قاہرہ میں علوم شرعیہ تک محدود تھی۔ لیکن اپنی فطری ذکاوت اور تاریخ کے گہرے ادراک نے انھیں مغربی تہذیب اور منہ زور جدیدیت کے چیلنج کا گہرا فہم عطا کر دیا تھا۔

امام حسن البنا نے مادی تہذیب کے چیلنج کے جواب میں ایک مکمل منصوبۂ عمل پیش کیا۔ آپ کی سادہ سی فکر کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین سے رہنمائی حاصل کریں اور شریعت کو اپنے تمام معاملات میں حاکم بنائیں۔ جسے شریعت مباح قرار دے، اسے لے لیں۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ تہذیب جدید سرتاپا شر ہے اور انسانی دانش کا تمام ورثہ سراسر جھوٹ ہے، نہیں بلکہ مطالبہ صرف یہ رہا کہ اسلام ہی مسلمانوں کے معاملات میں بالادست ہو اور ان کی پسند و ناپسند کا مرکز بھی عملاً وہی ہو۔ وہ مسلمانوں کو ان کا وہ عقیدہ یاد دلاتے تھے جسے طویل دورِ انحطاط نے ان کے ذہنوں سے محو کر رکھا تھا اور مغرب کی ثقافتی یلغار جسے دور کہیں دفن کر چکی تھی: یہ کہ بندے کی زندگی کا ہر لمحہ عبادت ہے۔ دین کو زندگی کے کسی بھی حصے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ امام ہمیشہ فرمایا کرتے تھے: ''اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی، یہ کتاب (ہدایت) بھی ہے اور تلوار بھی۔''

امام البنا کے ان الفاظ نے مسلمانوں کے دل میں موجود اس آتش فشاں کو بھڑکا دیا تھا، جسے وقتی طور پر دنیا کی محبت اور پست و ذلیل فطرت نے دبا رکھا تھا۔ یہ وہ مسکت جواب تھا جو شیخ نے تہذیب جدید کے چیلنج کا دیا۔ یہ تہذیب پوری دنیا کو بالعموم اپنا تابع فرمان بنانے کے لیے صدیوں تک لڑائی لڑتی رہی، اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنے نوآبادیاتی حملوں، اور پے در پے ثقافتی یلغار کے ذریعے سے اپنے مفادات کے سامنے جھکانے کی کوششیں کرتی رہی۔

امام شہید نے اپنے علاقے کے عام باشندوں کی طرح ایک صوفیانہ فضا سے معمور گھرانے میں پرورش پائی۔ ذکر و اذکار کی آوازوں نے آپ کی سوچ و فکر کو سنوارا، اور راتوں کی عبادت نے آپ کے کردار کو صیقل کیا تھا۔ آپ مزاجاً نرم خو اور فطرتاً متدین تھے۔ دیکھنے والے کو آپ کی آنکھوں میں حیا اور چہرے پر نورِ ایمان کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ہمیں امام شہید کی زیارت کا موقع نہیں ملا، لیکن جب ان کی تصویر دیکھتے ہیں تو جذبات سے عاری عام تصاویر کے برعکس حسن و جمال اور زندگی کے ہر رنگ سے بھرپور نظر آتی ہے۔

مدرسۂ حیات نے انھیں سکھایا تھا کہ امت کے اندر رائج الوقت دین داری کے سارے اسلوب ان کے اس سوال کا شافی جواب دینے سے قاصر ہیں کہ احیاے ملت اسلامیہ کیسے ممکن ہے۔ جس صوفیانہ پس منظر نے آپ کے مزاج اور آپ کی فکر و اسلوب کو تشکیل دیا تھا، اس نے آپ کے سامنے دین کا اصل راستہ واضح کر دیا اور آپ نے زندگی کے دیگر پہلوؤں کو چھوڑ کر دین کو چند ورد و اذکار اور قلبی اعمال تک محدود کرنا گوارا نہ کیا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ میرا عقیدہ شرک اور کجی سے پاک ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے اپنی دعوت کو مجرد نظریات اور کلامی مسائل تک محدود نہ رکھا تھا کہ جن کا زندگی کے نئے پیش آمدہ مسائل سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ آپ کی ذات میں بادشاہ وقت نے اپنی نام نہاد حکمرانی کے جواز کو عظیم خطرہ محسوس ہوا۔ پھر خطرے کا یہ شعور ایوان حکومت اور اس کے کار پردازوں سے نکل کر مصر اور مصر کی دیگر سیاسی قوتوں تک سرایت کر گیا جو امام کی بقا میں اپنا زوال دیکھتی تھیں، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ حسن البنا کا پروگرام خالصتاً اصلاحی نوعیت کا تھا۔ آپ نے کبھی کسی کے استیصال کا نعرہ بلند نہیں کیا، بلکہ عملاً قائم شدہ نظام کی اصلاح کی طرف ہی بلایا۔ لیکن آپ کی دعوت کی قوت و تاثیر کو دیکھ کر دوسرے آپ کے استیصال پر تل گئے۔ آپ کی زندگی کے خلاف سازش کی گئی اور بالآخر شہادت آپ کا مقدر ٹھیری۔

دشمن آپ کی ذات کے ساتھ وابستہ فضل کو نہیں پا سکے۔ یقیناً امام حسن البنا جیسے آدمی کے لیے بہترین خاتمہ شہادت ہی ہوسکتا تھا۔ اول تو اس لیے کہ شہادت آپ کی اور آپ کے دیگر ساتھیوں کی قلبی تمنا تھی۔ یہی تو تھے جنھوں نے فلسطین میں کار جہاد کی تجدید کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ شہادت سے بڑھ کر اور اس سے قوی تر کوئی اور گواہی ہو نہیں سکتی جسے آدمی اپنے صدق و اخلاص پر دے سکے۔ آج امام البنا کی شہادت کو تقریباً ۶۰ برس ہوگئے ہیں لیکن امام کے افکار و نظریات عامۃ المسلمین، تعلیم یافتہ لوگوں اور ہر درجے کے قائدین کے افکار و نظریات میں ڈھل چکے ہیں۔

***

میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا کہ امام ایک بار مصر کے شہر طنطا میں ۴۰ ہزار سے زائد سامعین سے مخاطب تھے۔اس بڑے جلسۂ عام میں بعض صوفی گروہ بھی شریک تھے۔ان میں سے کچھ لوگوں کو امام کی انقلابی تحریکی گفتگو اپنے پرسکون طریق عبادت سے متصادم لگ رہی تھی۔اچانک امام نے سب کو متوجہ کرتے ہوئے کہا: ''میرے بھائیو! کیا آپ کو بھی میری طرح ان لوگوں پر حیرت نہیں ہوتی جو شیخ ابوالحسن شاذلی کی اس دعا کا وظیفہ کرتے نہیں تھکتے: اللھم ارزقنا الموتة المطھرة، پروردگار ہمیں پاکیزہ موت عطا فرما۔لیکن کیا انھوں نے کبھی سوچا کہ پاکیزہ موت سے مراد کیا ہے؟ میرے بھائیو! وہ پاکیزہ موت جسے اللہ بھی پسند کرتا ہے، یہ ہے''۔یہ کہہ کر انھوں نے اپنا ہاتھ گردن کے سامنے پھیرتے ہوئے، اللہ کی خاطر گردنیں کٹوانے کا اشارہ کیا۔خدا کی قسم یوں لگا جیسے اس جملے نے پورے مجمعے میں کوئی تیز کرنٹ دوڑا دیا ہے، سب کو یوں لگا جیسے انھوں نے اپنی آنکھوں سے اپنی گردنیں کٹتی دیکھ لی ہیں، تقریباً سب کی آنکھیں نم ہوگئیں، نعرے آسمان کو چھونے لگے۔ڈاکٹر سعید رمضان

اے ہمارے اللہ!

مغفرت فرما، رحم فرما، درجات بلند کر اور اپنے قرب سے نواز

ہمارے والد (منظور علی مراد) اور والدہ (امت الحی) کو

ہمارے بھائی فضل احمد سعید، خرم مراد کو

اور بہنوں بڑی آپا (زبیدہ خاتون) آپا (نفیسہ خاتون)، بی بی (نویدہ خاتون) اور گوہر کو

اور اسلم بھائی، محمود بھائی اور ہمایوں کو،

بے شک تو کُل کے کُل گناہوں کو ایک ساتھ معاف فرمانے والا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًاط (الزّمر ۳۹:۵۳)

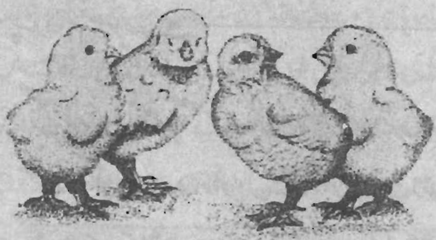
سعید اختر، حسن قاسم، مسلم سجاد، اسامہ اسماعیل،

عطیہ یزدان، شیما سعدیہ

قارئین ترجمان القرآن سے التماس ہے کہ آمین کہہ کر ہماری اس دعا میں شریک ہوں کہ اللہ تعالیٰ خرم مراد اُن کے والدین، بھائیوں، بہنوں اور بہنوئیوں کو اپنے جوارِ رحمت میں رکھے۔اور آنے والوں کو بھی ان کا ساتھ نصیب کر۔

بین الاقوامی معیار قومی اعتماد

ایس بی چکس



کم لاگت - کثیر پیداوار

صادق پولٹری (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ارسلان پولٹری (پرائیویٹ) لمیٹڈ

صادق فیڈز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ایس بی فارما

کراچی، پینوراما سنٹر صدر	5677505 111-505050
حیدرآباد، لطیف آباد	PP 868783
سکھر، ورکشاپ روڈ	614369 614368
کوئٹہ، زرغون پولٹری کاسی پلازہ	448245
ملتان، شمس آباد، ہمایوں روڈ	4581815 111-505050
رحیم یار خان، نزد خان پور اڈا	81394
کمالیہ، ذیشان کالونی، مین روڈ	412349
فیصل آباد، مدینہ ٹاؤن	8728795 111-505050
لاہور، 51/1 شادمان مارکیٹ	7591859 111-505050
شیخوپورہ، 25- ورک پلازہ	0321-9410499 0333-4250844
سیالکوٹ، ریلوے روڈ	111-505050, 4592397
سرائے عالمگیر، عثمان روڈ، اختر پلازہ	4653341
سرگودھا، اسو پلٹری بلت آباد	3221217 3224375
چکوال، تلہ گنگ روڈ	3540310
تلہ گنگ، مین بازار	3413543
حسن ابدال، جی ٹی روڈ، واہ کینٹ	0300 5577890
مانسہرہ، 1- بٹ پل شنکیاری روڈ	300367
مردان، نہر چوک، پار ہوتی	0937 770270
پشاور، 2 شامی روڈ	5271765 111-505050
کوٹلی، مین بازار	058660 - 42084 058660 - 60811

SB CHICKS

48-C, Satellite Town, Chandni Chowk, Rawalpindi
Ph: 051-4457551-60 (10 Lines) UAN: 051-111 505050 Fax: 051-4451191, 4851290
E-mail:mail@sadiqbrothers.com Website:www.sadiqbrothers.com

نوجوانانِ اسلام بوسنیا اور اخوان

عمر بہمن ○

دونوں عالم گیر جنگوں کے درمیانی عرصہ (۱۹۱۸ء-۱۹۳۹ء) میں بوسنیا ہرزی گووینا کے نوجوان حصولِ تعلیم کے لیے دنیا کے بڑے تعلیمی مراکز میں جایا کرتے تھے۔ واپسی پر ان معاشروں کے حقیقی نظریات بھی اپنے ساتھ لایا کرتے تھے۔ بوسنیائی مسلم طلبہ کا ایک ایسا ہی گروہ اس زمانے میں مصر کے دارالحکومت قاہرہ گیا جب اخوان المسلمون اپنی مقبولیت کے عروج پر تھی۔ مذکورہ طلبہ کی بوسنیا واپسی کے بعد ان کے سامنے پہلا کام بوسنیائی مسلمانوں میں اخوان کے دعوتی پروگرام کو متعارف کرانا اور پھیلانا تھا۔ اس کے فوراً بعد ان کے پیشِ نظر ایک ایسی تنظیم کو تشکیل دینا تھا جو اخوان کے طریقِ کار کے عین مطابق ہو۔ ابتدا میں اس سوچ کو عملی مشکل دینے کے لیے طے پایا کہ اخوان کے نظریات بوسنیا میں دو تنظیموں 'الہدایہ' اور اس کے اسی نام کے حامل اخبار (دسمبر' جنوری ۱۹۳۶ء فروری ۱۹۴۵ء) نیز نوجوانانِ اسلام کے ذریعے پھیلائے جائیں گے۔

ان طلبہ میں چند نمایاں نام یہ تھے: محمد ہاندچ (۱۹۰۶ء-۱۹۴۴ء)، عالیہ اگانووچ (۱۹۰۲ء-۱۹۶۱ء)، قاسم دوبراچا (۱۹۱۰ء-۱۹۷۹ء)، ابراہیم تریبیناچ (۱۹۱۲ء-۱۹۸۲ء)، اور حسین دوظو (۱۹۱۲ء-۱۹۸۲ء)۔

○ نوجوانانِ اسلام تنظیم کے سربراہ، بوسنیا کے سابق صدر مرحوم علی عزت بیگووچ کے قریبی ساتھی۔ جوانی میں ہی اسلامی تحریک سے وابستہ ہوئے اور ۳۰ سال کی سزا پائی۔ بوسنیائی زبان سے انگریزی ترجمہ بوسنیا کے ایک سفارت کار نے کیا اور انگریزی سے اُردو ترجمہ: محمد الیاس انصاری نے۔

خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا طلبہ میں سے چند نے حسن البنا سے ملاقات کی تھی۔ جن بوسنیائی طلبہ نے ان سے ملاقات کی، غالب گمان ہے کہ ان میں محمد ہاندچ اور عالیہ آگانووچ شامل تھے جو اس عرصے میں قاہرہ میں نمایاں اسلامی اسکالر مثلاً یوسف یودیا وغیرہ کے لیکچرز میں شرکت کیا کرتے تھے۔ قاہرہ میں ان (بوسنیائی) طلبہ نے دو تنظیمیں، Young Muslims اور 'الہدایہ' قائم کیں۔ پھر بعد میں ان کی مخلصانہ کاوشوں کے نتیجے میں یہی دونوں تنظیمیں بوسنیا میں بھی قائم ہوگئیں۔

جب تنظیم 'الہدایہ' معرضِ وجود میں آئی تو اس زمانے میں اخوان المسلمون کی سرگرمیوں کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا تھا۔ جس کے بارے میں حسن البنّاؒ کا کہنا تھا کہ اس مرحلے میں ابلاغ (communication) پیش کاری (presentation) اور نظریات کے فروغ کے ساتھ ساتھ انھی نظریات کو لوگوں کے تمام طبقات تک پہنچایا جائے۔ 'الہدایہ' کا تاسیسی اجلاس ۸ مارچ ۱۹۳۶ء کو بوسنیا کے دارالحکومت سرائیوو میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے محمد ہاندچ نے الہدایہ کی سرگرمیوں اور طریق کار کی وضاحت کی۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کے احیا کے لیے چار بڑے طریقے بیان کیے جو دعوتی کام کے لیے نہایت اہم ہیں۔ انھوں نے خطبہ ہاے جمعہ کے لیے تحریری مضامین اور ذاتی کردار کی اہمیت کو بھی بیان کیا۔

سماجی اہداف کے بارے میں تصور تب تک ممکن نہیں، جب تک علما کی راہ نمائی سے بھرپور استفادہ نہ کیا جائے اور اسلامی تعلیمات کی عام اشاعت نہ کی جائے۔ تاہم نوجوانوں کو 'الہدایہ' کی سرگرمیوں میں شامل کرنے کے لیے اس کی ضرورت کا احساس روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

نوجوانوں کے لیے قائم ان تنظیموں کی کارکردگی کی رفتار اس دوران میں بہت سست تھی۔ اس سست روی کی وجہ محمد ہاندچ کے بقول طریق کار پر عدم اتفاق تھی۔ نوجوانوں کا ایک گروہ نوجوانانِ اسلام کے نام ہی سے کام کرنے میں گہری دل چسپی رکھتا تھا۔ یہ تنظیم مارچ ۱۹۴۱ء کے اواخر میں قائم کی گئی تھی۔ ان نوجوانوں کی راے یہ تھی کہ 'الہدایہ' ایسی تنظیم ہے جو خالصتاً مذہبی علما پر مشتمل ہے۔ تاہم 'الہدایہ' نے ان نوجوانوں کو اپنے پروگراموں اور سرگرمیوں میں شامل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی۔ اس کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ 'نوجوانانِ اسلام' نے فیصلہ کیا

کہ وہ 'الہدایہ' کا ایک لازمی جزو ہیں اور اسی کے ایک شعبے کے طور پر کام کریں گے۔ 'نوجوانانِ اسلام' کی آئینی کمیٹی کا اجلاس ۵ مئی ۱۹۴۳ کو ہوا جن میں جناب قاسم دوبراچا کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ ۲۷ اپریل ۱۹۴۳ء کو 'نوجوانان اسلام' کے اصول وضوابط منظور کیے گئے، جنھیں چند روز بعد 'الہدایہ' کے ترجمان اخبار میں شائع کیا گیا۔

ان ضوابط کے آرٹیکل نمبر۲ میں کہا گیا تھا کہ ''اس شعبے (نوجوانانِ اسلام) کا مقصد مسلمان مسلمان نوجوانوں میں اسلامی روح بیدار کرنا' اس کے مطابق ان کی تربیت کرنا اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کے سماجی واخلاقی معیار کو بلند کرنا ہے''۔

آرٹیکل نمبر۹ میں بیان کیا گیا کہ ارکان پر لازم ہے کہ وہ اسلامی قوانین کے اصولوں سے بخوبی واقف ہوں، ایک اچھے مسلمان کا رویہ اپنائیں۔ اسلامی تعلیمات کے فروغ اور مسلمانوں کے مفادات کے دفاع کے لیے نوجوانانِ اسلام کے ارکان کو دوسروں کے لیے ایک مثال ہونا چاہیے۔

مختلف روایتی مذہبی اداروں کی طرف سے اسلام کی جامد تشریح سے اور سخت گیر روّیہ ترک کرکے اسے ایک زیادہ قابل عمل انداز میں تبدیل کردیا گیا۔ نوجوانوں کے جوش وجذبے اور توانائیوں کو انفرادی سطح پر مذہبی اور اخلاقی رویوں میں روحانی اعتبار سے بدلا گیا۔

تاہم یہ طے کیا گیا کہ اپنے آیندہ کے کام اور سرگرمی کے لحاظ سے 'نوجوانانِ اسلام'، 'الہدایہ' سے جدا اور آزادانہ سرگرمِ عمل رہے گی۔ ''ہم ارکانِ نوجوانانِ اسلام ہمیشہ سے مذہبی اداروں میں کسی بھی قسم کی پیشہ وارانہ مذہبی مداخلت کے مخالف رہے ہیں اور یہ رجحان بہت مضبوط رہا ہے''۔ یہ تھے عالی جاہ عزت بیگووچ (سابق صدرِ بوسنیا وہرسیگووینا) کے الفاظ جو اُن ارکان میں سے ایک تھے، جنھوں نے 'الہدایہ' میں شمولیت سے انکار کیا۔ ''ہمیں شروع ہی سے اس بات کا یقین رہا ہے کہ پیشہ ور مذہبی حضرات نہ تو اسلامی تعلیمات کے احیا میں دل چسپی لیتے ہیں اور نہ ان میں اس کی اہلیت ہے، لہٰذا ہماری نظر اس سمت میں نہیں ہونی چاہیے جہاں کسی قسم کی امید ہی نہ ہو''۔

ان وجوہ کی بنا پر تنظیم کی دیگر سرگرمیوں کے حوالے سے کچھ اور پروگرام سامنے آئے اور فیصلہ کیا گیا کہ ان سرگرمیوں کا دائرۂ کار مسلم فلاحی تنظیم 'مرحمت' تک پھیلایا جائے۔ 'نوجوانانِ اسلام'

اسلامی تعلیمات کو خطابات اور دوسری مذہبی و تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے سے آگے بڑھائیں، سرگرمیوں کا ہدف نوجوان نسل ہو جو جنگ عظیم کے باعث اسکولوں میں تعلیم جاری رکھنے سے محروم رہ گئی تھی۔

جوں جوں جنگ کے خاتمے کا وقت قریب آرہا تھا، اسد کراھِو وچ تنظیم کو اپنی غیرقانونی سرگرمیوں کے لیے تیار کرنے لگے۔ انھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ اشتراکی حکومت کے زیرسایہ قانونی سرگرمیاں ممکن نہیں ہوسکیں گی۔ وہ تنظیم میں کلیدی شخصیت تھے۔ ان کے ہمراہ حسن ببر اور خالد قائیتاز جیسے مستقل ارکان تھے، جب کہ دیگر ارکان اپنی تعلیم میں مصروف تھے۔ انھوں نے اس دوران سب سے اہم گروہ قائم کیا، جس میں انتہائی قابلِ اعتماد افراد شامل تھے۔ اس گروہ کا مقصد حسن البنّاؒ کے انداز اور نظریات کا فروغ تھا۔ ان کا نظریاتی مقصد یہ تھا کہ تنظیم کا ہر رکن جہاں وہ خود رہتا ہے اور کام کرتا ہے، اپنے الفاظ اور عمل سے اپنے حلقۂ اثر کو متاثر کرے۔ ایسے ارکان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے پیشے میں طاق ہوں اور اپنے شعبے میں مثال بننے کے لیے کوشاں ہوں۔ اس طرح عملاً ان نظریات کی قدر و قیمت کو بڑھانا تھا۔

۱۹۴۵ء میں جب خونیں اشتراکی آمریت برسرِاقتدار آگئی تو اس تنظیم کو جو پہلا دھچکا لگا وہ یہ تھا کہ اشتراکی حکمرانوں کے وحشیانہ تشدد کے نتیجے میں اس کے ۱۳ ارکان نے جامِ شہادت نوش کیا، ان عظیم مجاہدوں کے نام درج ذیل ہیں: مصطفیٰ باسولاچچ، حسن ببر، عمر کوواچ، عمر ستوپاک، نصرت فضلی بیگووچ، خالد قائیتاز، فکرط پولچو، ثاقب نشاتچ، عاصم چام چچ، آصف سرداروچ، نورالدین گاکچ، عثمان کروپالیا اور اسد کاراچچ۔

بدقسمتی سے اشتراکی حکمرانوں کی جانب سے ظلم و ستم، پکڑ دھکڑ اور وحشیانہ تشدد کا سلسلہ یہاں تھما نہیں۔ آٹھ سو سے زائد ارکان کو طویل مدت (پانچ تا بیس سال) قید و بند کی سزائیں دی گئیں، جب کہ ساڑھے چار ہزار ارکان کو ایک سے چھے برس تک کی قید بامشقت کی سزائیں دی گئیں۔

۴۰ سالہ اشتراکی دورِ حکومت میں 'نوجوانانِ اسلام' کے خلاف مسلسل تفتیش و تحقیق کا یہ سلسلہ جاری رہا اور جھوٹے مقدمات چلتے رہے۔ ان مقدمات میں سے زیادہ تباہ کن مقدمات

۱۹۴۹ء، ۱۹۵۱ء اور ۱۹۸۳ء میں چلائے گئے۔ ایسے دو مقدمات میں راقم السطور [عمر بهمن] کو ۳۰ سال قید کی سزا سنائی گئی، جو اس سلسلے کی سب سے لمبی سزا تھی۔ تاہم اشترا کی حکمرانوں کی جانب سے 'نوجوانانِ اسلام' کو مٹا ڈالنے کی تمام کوششیں اور اس کی سرگرمیوں کو روکنے کے تمام حربے ناکام ثابت ہوئے۔ ان ناکامیوں کی واضح ترین مثال بوسنیا پر کی جانے والی اب تک کی وہ آخری جارحیت ہے جو اشترا کی سربیا نے بوسنیا کے اعلانِ آزادی کو روکنے کے لیے مارچ ۱۹۹۲ء میں کی تھی' جس کا بھیانک سلسلہ نومبر ۱۹۹۵ء تک جاری رہا' نوجوانانِ اسلام نے ۱۹۹۰ء میں بوسنیا میں پہلی مسلم سیاسی جماعت Party of Democratic Action (SDA) کی بنیاد رکھی۔ اس سیاسی جماعت اور اس کے صدر عالی جاہ عزت بیگووچ نے سربیا کی جارحیت کے خلاف مزاحمت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

آج نوجوانانِ اسلام کی سرگرمیاں مختلف شعبہ ہاے حیات میں جاری و ساری ہیں۔ نئی نسل تک اپنے نظریات پہنچائے جا رہے ہیں۔ سابقہ جنگی قیدیوں کی دیکھ بھال، غریبوں کی مدد، مہاجرین کی دیکھ بھال، مذہبی سرگرمیوں کا انعقاد اور سرگرمیوں کی اشاعت اور مساجد کی تعمیر وغیرہ ان سرگرمیوں میں شامل ہیں۔ اس جذبے کی آب یاری کے لیے جس معاصر شخصیت کا سب سے زیادہ موثر نام ہے، وہ حسن البنا شہید ہیں۔

***

شکریہ مشتہرین: یہ 'اشاعت خاص' ۴۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور بازار کی شرح سے اس کی قیمت ۲۵۰ روپے سے ۳۰۰ روپے مناسب ہے' لیکن ہم یہ ۹۰ روپے (اور سالانہ خریداروں کو دو ماہ کے برابر' یعنی ۴۰ روپے) میں دے رہے ہیں۔ یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ اپنا پیغام پہنچانے کے خواہش منداور مشتہرین نے ہمارے ساتھ کھلے دل سے تعاون کیا ہے۔ ہم قارئین کی طرف سے ان کے شکر گزار ہیں۔ قیمت کم ہونے کی وجہ سے استفادہ کرنے والوں میں جو اضافہ ہوگا' اس کے اجر میں ہمارے یہ کرم فرما برابر کے شریک ہیں۔
عموماً ہر ماہ قارئین کو ۱۱۲ میں سے ۱۰۰ صفحات کا لوازمہ براے مطالعہ دیا جاتا ہے۔ اس 'اشاعت خاص' میں تین شماروں کے ۳۰۰ سے ۴۵ صفحات زائد لوازمہ دیا جا رہا ہے۔ نیز اشتہارات میں سے بڑی تعداد معروف معنوں میں اشتہارات نہیں ہیں' بلکہ دعوت و تذکیر ہیں۔ ادارہ

امام شہید رحمۃ اللہ علیہ کی دس ہدایات

- ❖ جب اذان کی آواز کان میں پڑے تو نماز کے لیے اُٹھ کھڑے ہو۔
- ❖ تم قرآن کی تلاوت کرو یا مطالعہ، یا دوسروں سے سنو،
اپنے وقت کا کوئی حصہ بھی بے فائدہ کام میں صرف نہ کرو۔
- ❖ گفتگو ہمیشہ صاف ستھری زبان میں کرو۔ یہ شعائرِ اسلام میں سے ہے۔
- ❖ معاملات میں زیادہ بحث و تکرار سے کام نہ لو۔
- ❖ زیادہ نہ ہنسو کہ اس سے دلوں میں سختی آتی ہے۔
- ❖ بلند آواز میں گفتگو نہ کرو۔ اس میں تکبر بھی ہے اور دوسروں کے لیے اذیت بھی۔
- ❖ مسخرہ پن اختیار نہ کرو۔ مجاہد سنجیدہ ہوتے ہیں۔
- ❖ غیبت اور الزام تراشی سے بچو۔ تمھاری زبان سے خیر کے سوا کوئی کلمہ نہ نکلے۔
- ❖ جس رفیق سے بھی تمھاری ملاقات ہو، اس سے اپنا تعارف کراؤ، خواہ اس نے یہ چاہا ہو، اظہار کیا ہو یا نہ کیا ہو، کیونکہ ہماری دعوت محبت اور تعارف پر استوار ہے۔
- ❖ کام زیادہ ہیں اور وقت کم، لہٰذا تم اپنے دوسرے رفقا کی اس میں مدد کرو کہ وہ اپنے وقت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرسکیں۔

اگر تمھارے ذمے کوئی خاص مہم ہو تو اسے کم سے کم وقت میں پایہ تکمیل تک پہنچاؤ۔

کارکنان جماعت اسلامی گوجرہ

غضّ بصر نہ کرنے کے نقصان

نظر بازی، اجنبی و نامحرم کو دیکھنا، دیکھتے ہی رہنا، لذت لینا، آج کل عام ہے۔ مشغلہ ہے، گناہ کا تصور نہیں۔ اس کے چند نقصانات:

❖ اللہ کا نافرمان: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور ۲۴: ۳۰)

❖ امانت میں خیانت: يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (المؤمن ۴۰: ۱۹)

❖ اللہ سے دوری: بدنظری سے اللہ سے ایسی دوری ہو جاتی ہے کہ ادراک ہو جائے تو انسان کبھی بدنظری نہ کرے۔

❖ بینائی کو نقصان: غضِ بصر آنکھوں کا شکر ہے، بدنظری کفرانِ نعمت ہے لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراہیم ۱۴: ۷)

❖ ناشکری: اپنی بیوی بری معلوم ہوتی ہے۔ حسین ہے، تو حسین تر کیوں نہیں؟

❖ انجائنا: انجان کو دل دینے سے انجائنا بھی ہو جاتا ہے (ہر کسی پر فتویٰ نہ لگایئے)

❖ شرمگاہ کی حفاظت نہیں رہتی: اللہ تعالیٰ نے فوراً بعد یحفظوا فروجھم فرمایا۔ نگاہ محفوظ نہیں تو بالآخر شرم گاہ بھی محفوظ نہیں۔

❖ ملعون: لَعِنَ اللّٰهُ النَّاظِرَ وَالمنظور اليه (مشکوٰۃ باب النکاح)

❖ احمق اور بدعقل: نہ ملنا، نہ ملانا، مفت میں اپنے دل کو تڑپانا۔ انتہائی حماقت کا گناہ (مولانا تھانویؒ)

❖ دل کمزور ہوتا ہے: حواسِ خمسہ لذت لینے کی کوشش کرتے ہیں، بصر، سمع، شامہ، لمس، ذائقہ سب اعضاء و جوارح حرکت میں آجاتے ہیں۔ اور اللہ باخبر ہے نظر، حواس اور جوارح کی حرکات سے۔

❖ مشت زنی کا عادی: حدیث پاک میں لعنت آئی ہے۔ صحت خراب ہو جاتی ہے۔

غضِ بصر کی کوشش کریں، کوشش کرتے رہیں، ہمت نہ ہاریں، اللہ سے مدد مانگیں، مانگتے رہیں ماحول ناساز گار ہے، اللہ تعالیٰ رعایت دے گا لیکن نیت اور کوشش میں کمی نہ ہو

عطیہ اشتہار: خیر خواہ

ایک ھی حقیقت کے دو عنوان

حسن البناؒ...... سید مودودیؒ

سید مودودیؒ...... حسن البناؒ

الاخوان المسلمون...... جماعت اسلامی

جماعت اسلامی...... الاخوان المسلمون

۲۰ ویں صدی کی دو شخصیات' (ان کی ولادت کے صد سال ۲۰۰۳ اور ۲۰۰۶ میں پورے ہوئے)' دراصل تحریکات اپنے اپنے علاقوں میں حالات کے تقاضوں سے لیکن یقیناً اللہ تعالیٰ کے منصوبے کے تحت برپا ہوئیں۔ آج دنیا کے جس حصے میں بھی حق و باطل کی کش مکش برپا ہے' اس کا سرا انھی تک پہنچتا ہے۔

عالمی سطح پر قیادت کی تبدیلی کا اسٹیج تیار ہے۔ کش مکش تیز ہو رہی ہے۔ ۲۱ ویں صدی میں یہ انقلاب واقع ہونا ہے۔ آج اگر سب مسلمان ایک عزم کے ساتھ ایمان کے تقاضوں پر لبیک کہہ کر میدان میں اتریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ انسانیت کی قیادت کا تاج ان کے ہی سر پر رکھے گا۔ اس کے پھل اس زمین کے باسی آنے والی صدیوں میں کھاتے رہیں گے۔

اے ہمارے رب! دنیا کے جس حصے میں جو بھی تیرے دین کی سربلندی کی جدوجہد کر رہا ہے، اسے اپنی نصرت خاص سے سرفراز فرما! اُمت مسلمہ کو وہ عروج عطا فرما جو اس کا حق ہے، اس کا قیادت کا کھویا منصب اسے واپس ملے جس سے وہ اپنی نادانی سے محروم ہے۔ انسانیت کو موجودہ اضطراب و کرب، ظلم و جبر اور قتل و غارت سے نجات دلا اور اسے اسلام کے چشمہ صافی سے سیراب کر۔ آمین

جماعت اسلامی' پاکستان

شخصیت، مشن اور جہدِ مسلسل

زہیر الشاویش ○

۱۳ ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ بمطابق ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء ہفتے کے دن امام حسن البنا ۴۳ سال کی عمر میں شہید ہوئے۔ اس وقت میں استاد محمود عبدہ کی قیادت میں چند مصری مجاہدین کے ہمراہ القدس کے قریب واقع شہر 'صور باھر' میں قید تھا۔ ہمیں جیل میں ان کی شہادت کی دردناک خبر ملی۔ وسط سال تک میں ان کے ساتھ ہی رہا، پھر انھیں کہیں دوسری جیلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ میرے ساتھ میرے چار بھائی اور بھی تھے، جن میں سے ضیف اللہ مراد اور کامل خشاحت شہید ہو گئے، جب کہ ابراہیم حداقی کا ہاتھ کٹ گیا اور ادیب الخیاط کی ایک آنکھ پھوٹ گئی تھی۔

میں ترجمان القرآن کی اس خصوصی اشاعت کے لیے ان باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا جو ہمارے دوستوں اور احباب نے لکھی ہیں بلکہ میں یہاں ان لمحات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو میں نے شہید امام اور ان کے بعض اقارب و احباب کے ساتھ گزارے ہیں۔ ان میں ان کے والد بزرگوار اور میرے استاذ مکرم الشیخ احمد عبدالرحمٰن ساعاتی، امام کے بھائی، ان کے شاگرد، ان کے داماد، ان کے نواسے، ان کے بیٹے احمد سیف الاسلام، اور بہت سے وہ لوگ جو بڑے اخلاص کے ساتھ امام کے ہم قدم رہے۔

استاذ البنا سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۱ء میں، مصر کے حلمیہ الزیتون کے مقام پر ہوئی۔

○ امام البنا کے ساتھی، اخوان المسلمون شام کے ایک بزرگ رہنما، متعدد کتب کے مصنف اور اسلامی کتب کے معروف ناشر۔ اس وقت لبنان میں مقیم ہیں۔ ترجمہ: فصیح اللہ عبدالباقی

حلمیہ مصر میں المطریہ کے قریب واقع ہے۔ یہ وہ حلمیہ نہیں ہے جو بعد میں اخوان کا مرکز بنا تھا۔ میں اپنے والد اور اپنے بھائی کے ساتھ تجارت کی غرض سے وہاں گیا تھا اور کبھی کبھار ازہر کے عمومی شعبے میں بھی جایا کرتا تھا۔ ایک روز اخوان کے بعض کارکنان نے مجھے اپنے ایک پروگرام میں شرکت کی دعوت دی۔ درسِ قرآن کے بعد میں حسن البنا کے نزدیک گیا۔ اس وقت میں نے عربی لباس پہن رکھا تھا۔ ہمارے ایک پڑوسی نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ شام کے باشندے ہیں تو انھوں نے پیار بھرے لہجے میں مجھے کہا: ابوشام شیخ العرب ، اھلاو سھلاً [شام کے شیخِ عرب، خوش آمدید]۔

میں ۱۹۴۵ء کے وسط تک اخوان کے ساتھ برابر رابطے میں رہا۔ اس کے بعد باقاعدہ طور پر شام میں 'شبابِ محمدؐ' نامی تنظیم سے منسلک ہوا، جسے ۱۹۴۶ء میں اخوان المسلمون میں ضم کر دیا گیا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو دوبارہ امام البنا سے اس وقت ملنے کا اتفاق ہوا جب وہ سرزمین فلسطین تک مجاہد دستوں کو پہنچانے کے سلسلے میں دمشق تشریف لائے تھے۔ اس موقعے پر انھوں نے صدر مملکت شکری القوتلی، فلسطینی دفاع کونسل کے افراد اور اخوان کے دوسرے مجاہدین سے بھی ملاقاتیں کیں۔ اس دوران مجھے بھی ان کے ساتھ رہنے کی سعادت ملی۔ ایک موقع پر میرے اور ان کے درمیان ایک گرماگرم بحث چھڑ گئی، جب وہ ایک رضاکار مجاہد کو مصر واپس جانے کی طرف راغب کر رہے تھے۔ یاد رہے کہ میں نے اس روز اس بھائی کو کہیں چھپا رکھا تھا۔ آخرکار یہ بحث اس طرح اختتام پذیر ہوئی کہ وہ اپنے موقف سے دست بردار ہوگئے۔ اس روز ان کی فراخ دلی اور وسعتِ قلبی کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

۱۹۵۲ء میں جب مجھے اپنے دو اساتذہ مصطفیٰ السباعی اور عصام العطار کے ہمراہ شام سے جلاوطنی کا حکم ملا تو میں مصر چلا گیا اور ۱۹۵۴ء کے وسط تک مصر میں رہا۔ اس کے بعد ہر مقام، اور ہر موقع پر اخوان المسلمون کے ساتھ ہی رہا۔ ہر شخص کے ساتھ خواہ میرا موافق ہو یا مخالف رابطہ رکھنا میری فطرت کا حصہ بن گیا۔

امام البنا کا سب سے بڑا اور عظیم کارنامہ اخوان المسلمون کی تاسیس ہے۔ یہ جماعت مصر اور دوسرے عرب ممالک میں ایک بہت بڑی قوت کے ساتھ موجود ہے۔ معاشرے میں اثر و نفوذ کے

اعتبار سے سب سے زیادہ توانا اور مؤثر ہے۔ اسی طرح برعظیم پاک و ہند میں استاذ ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی ایسی ہی ایک مؤثر اور عظیم جماعت کی بنیاد رکھی ہے۔

اگرچہ معاشرے میں اخوان کے حامی بڑی تعداد میں موجود ہیں لیکن مخالفت کرنے والوں اور الزامات کی بوچھاڑ کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ مدح و ذم کا اثر لیے بغیر اپنی منزل کی طرف گام زن رہے۔ ان تمام نشیب و فراز میں وہ ایک عظیم شخصیت کی حیثیت سے اُبھرے۔ انھوں نے کئی میدانوں میں بڑی اہم خدمات انجام دیں۔

○ **تصنیف و تالیف**: تصنیف و تالیف کے میدان میں انھوں نے ۳۰ کتابیں لکھیں۔ یہ مختصر کتابچے وسیع معلومات اور وقیع پیغامات کے مرقع ہیں اور ان میں ایسی مفید اور نادر باتیں جمع کی گئی ہیں، جو دعوت کے مختلف پہلوؤں میں اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے دسیوں مضامین اور مقالات لکھے ہیں، اور سیکڑوں خطبے ارشاد فرمائے ہیں، جن کی بنیاد پر حسن البنا امام اور مرشد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

○ **میدانِ صحافت**: آپ نے صحافتی میدان میں اخوان کا ایک مستقل ادارہ قائم کیا اور اس طرح وہ اخوان کے اور اخوان سے تعلق رکھنے والے احباب کے زیراہتمام نکلنے والے تمام پرچوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ مجلّہ الشہاب کے افتتاحیہ میں انھوں نے لکھا: ''مجلّہ الشہاب ہم ان قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو انسانیت کی حس رکھتے ہیں اور اسلام کو اپنا نظامِ زندگی تسلیم کرتے ہیں۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے یہ مجلّہ زندگی کے ہرشعبے کے لیے قرآن پاک سے ہدایت کا سامان اور دین و شریعت سے روشنی فراہم کرتا رہے گا۔ مجلّہ المنار نے درحقیقت اسلامی فکر پر مبنی ایک مکتب کو جنم دیا۔ اس مجلّے نے دین اسلام کے حقائق اور مقاصد کا ہر میدان میں بڑی جرأت کے ساتھ دفاع کیا اور ملحدین اور دیگر گمراہوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند کھڑا رہا۔ بالکل اسی طرح الجزائر سے شیخ عبدالحمید بن بادیس کی زیرادارت مجلّہ الشہاب نے بھی اپنے دور میں عظیم جہاد کیا۔ ہمیں امید ہے کہ اب مصر کا الشہاب ان دونوں مجلّات کے مقاصد کو فروغ دے گا۔ قرآن کی دعوت کو اپنا فریضہ سمجھ کر تمام نظاموں پر اسلامی نظام کی برتری کے لیے کوشاں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری آرزوؤں کو پورا

کردے اور ہمارے معاملات کو درست فرمادے۔

امام البنا کے نزدیک تمام مسلمانوں کا خواہ وہ سلفی ہوں یا صوفی یا فقہی مسالک سے منسلک ہوں، سنی ہوں یا شیعہ یا اِباضی، ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ انھوں نے اصولوں اور متفق علیہ معاملات کو اتحاد کے لیے بنیاد بنایا اور فروعی مسائل میں ہر ایک کو اختلاف راے کے ساتھ دوسروں کو برداشت کرنے کی تعلیم دی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو امام حسن البنا کے پیروکاروں میں مختلف فرقوں اور مختلف مکاتب فکر کے لوگ ایک ساتھ چلتے نظر آئیں گے۔ ایک دفعہ انھوں نے جامعۃ الانصار کے مجلّے کے ساتھ تعاون کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ابھی ان کے ساتھ تھوڑا ہی سفر طے کیا تھا کہ ان کو معلوم ہوا کہ وہ اس امت میں خوارج کے طریق کار پر کاربند ہیں تو اس پر فوراً ہی ان کے ساتھ تعاون ختم کردیا۔

ہمارے استاد محبّ الدین الخطیب نے جو الفتح اور الزہراء نامی مجلّات کے بانی مدیر تھے اور بعد میں روزنامہ الاخوان المسلمون کے مدیر بنے، مجھے ذاتی طور پر بتایا کہ: ''حسن البنا کی یہ عادت تھی کہ وہ کبھی بھی کسی کام کے لیے حکم نہیں صادر کرتے تھے، بلکہ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے معاونین اور ساتھیوں کے سامنے تجاویز رکھ دیا کرتے تھے۔ نتیجتاً انھی کی پیش کردہ معقول تجاویز ہی نافذ ہوکر رہتیں، مگر کسی جبر کے ساتھ نہیں، بلکہ رغبت اور خوش دلی کے ساتھ''۔

محبّ الدین الخطیب کی قدآور علمی شخصیت کا اندازہ آپ اس سے کریں کہ جس ازہر نے لاکھوں کی تعداد میں علما تیار کیے، اس ادارے نے اپنے مجلّے الازہر کی سرپرستی اور ادارت کے لیے بھی محبّ الدین الخطیب دمشقی کا نام چنا جس کا ازہر سے کوئی تعلّق نہیں تھا۔ یہ اس عظیم علمی شخصیت کا کمال اور فیضان تھا کہ بعد کے ادوار میں اسی ازہر یونی ورسٹی میں بکثرت اخوان کے کارکن پیدا ہوئے۔

○ **معاشرت اور باہمی تعلقات**: امام حسن البنا اپنی تمام تر ذمہ داریوں اور مصروفیات کے باوجود اپنے ساتھیوں کی خوشی اور غمی میں باقاعدگی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ قاہرہ کے دور دراز علاقوں تک میں شادی بیاہ اور جنازوں میں حاضر ہوتے اور مریضوں کی عیادت کے لیے پہنچ جاتے۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے شرکت ممکن نہ ہوتی تو کسی نمایندے کو بھیجا کرتے تھے۔ اگر یہ بھی ناممکن ہوتا تو خط اور تار کے ذریعے تعزیت وتہنیت کرتے تھے۔

مجاہد حاجی محمد امین الحسینی کے ہاتھ میں عالم اسلام کے بڑے بڑے قائدین کی اجتماعی تصویر تھی جس میں حسن البنا ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے یہ تصویر دکھاتے ہوئے کہا کہ: اس اجتماع میں حسن البنا سب سے پہلے حاضر ہوئے، لیکن بعد میں ہر نئے آنے والے مہمان کی عزت اور اکرام کی خاطر اپنی نشست چھوڑ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ مجلس کے بالکل آخر میں جا پہنچے حالانکہ اللہ کی قسم، بہت سارے عوامل اور خصوصیات کی بنیاد پر وہی اس لائق تھے کہ صدر مجلس ہوں۔

ایک دفعہ انھوں نے ایک نوجوان طالب علم امین السکری کو جو تعلیم کے سلسلے میں برطانیہ جا رہا تھا، ایک خط لکھا، جس میں انھوں نے برطانیہ کے حالات کے ساتھ مختلف علوم کے بارے میں معلومات اور انگریزوں کے اخلاقیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس خط میں انھوں نے اس نوجوان کو دینی اقدار اور اسلامی شعار پر سختی سے پابندی کرنے کی تاکید کی اور یہ نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ کو سمیع و بصیر سمجھ کر ہمیشہ اس کو اپنے اوپر نگران سمجھو۔

○ **فقہ و اجتہاد:** امام البنا نے بہت سارے مسائل اور معاملات میں اجتہاد سے کام لیا اور بہت ساری ایسی راہوں سے گزرے جن کو انھوں نے خود ہی کھولا۔ ان سے پہلے ان مسائل تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی تھی، مثلاً: سامراج کے خلاف عملی جہاد اور اس کے لیے مسلسل تیاری، عرب اور اسلامی ممالک کے لیے ایک اصلاحی اور تعمیری پروگرام کو متعارف کرانا، پوری دنیا میں اسلامی دعوت اور اسلامی فکر کو پھیلانا وغیرہ۔

○ **خصوصی حفاظتی نظام کا قیام:** اخوان المسلمون نے تحریک کے دفاع کے لیے ایک خاص حفاظتی نظام تشکیل دیا۔ اس نظام خاص کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ اس انتہائی منظم، مربوط اور مستحکم نظام کی نگرانی امام خود کریں گے، یا کسی اعلیٰ تربیت یافتہ اور قابلِ اعتماد شخص کو اس ذمہ داری پر مامور کیا جائے گا۔ یہ نظام درحقیقت مشکلات سے نمٹنے کے لیے بنایا گیا تھا، لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب وہ نظام خود حسن البنا اور اخوان المسلمون کے لیے مصیبت اور مشکلات کا باعث بن گیا۔ جس کے بارے میں حسن البنا نے خود اپنی شہادت سے پہلے کہا تھا: ''یہ لوگ (نظام خاص کے افراد) اخوان کی صف میں نہیں رہے''۔

حسن البنا کی شہادت کے بعد بھی یہ نظام، تنظیم سے الگ ہوکر چلتا رہا، مگر اس کی مختلف کارروائیاں اخوان کے لیے مشکلات کا باعث بنتی رہیں، حالانکہ اخوان کا بحیثیت نظم اور تنظیم اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر جیسے ہی اخوان کی قیادت مومنانہ بصیرت کی حامل شخصیت، استاد حسن الہضیبی رحمہ اللہ کو سونپی گئی، انھوں نے فی الفور اس نظام کے خاتمے کا اعلان کردیا۔ ردعمل کے طور پر بعض افراد نے استاذ الہضیبی کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا، اور ان کو جماعت کی قیادت سے ہٹانے کی سعی شروع کردی، جس کے نتیجے میں جماعت کے اندر ایک بڑا فتنہ برپا ہوا۔ اسی زمانے میں استاد حسن الہضیبی گرفتار ہوگئے، اور جماعت کے بلند پایہ قائدین کو تختۂ دار پر لٹکادیا گیا۔ اس نظام سے منسلک بہت سے دوسرے لوگ بھی تھے جو اس فتنے سے نہ بچ سکے۔ حقائق گڈمڈ ہوگئے، نظام درہم برہم ہوا اور آزمایش کا یہ سلسلہ برابر چلتا رہا، یہاں تک کہ جماعت پر سے پابندی اٹھالی گئی۔ حسن الہضیبی نے دوبارہ جماعت کی قیادت سنبھالی اور اس باغی نظام کو ختم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ بالآخر یہ لوگ اخوان کی صفوں سے نکل گئے۔ اس طرح الہضیبیؒ کی فراست اور بصیرت کے نتیجے میں یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

یہاں ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امام البنا نے جن لوگوں کی تربیت کی تھی وہ بہترین شخصیات ثابت ہوئیں، لیکن جن کی تربیت ادھوری رہ گئی اور انھوں نے تنظیم اور سربراہِ تنظیم کے فیصلوں کی پابندی نہ کی، وہ مفید ہونے کے بجاے نقصان دہ عناصر کی حیثیت اختیار کرگئے۔ داخلی طور پر جماعت کے اندر جتنے بھی اندوہ ناک واقعات رونما ہوئے تقریباً ان سب کا موجب اسی نظام کے افراد تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے۔

○ **سرزمین شام پر اثرات:** شام میں بہت سی انجمنیں متحرک تھیں۔ تقریباً ہر صوبے میں ایک اصلاحی انجمن ہوا کرتی تھی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ یہ سب کی سب (شباب سیدنا محمدؐ) کے عنوان سے اکٹھی ہوئیں۔ ۱۹۴۶ء میں ان سب نے اخوان کے پروگرام اور طریق کار سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے لیے 'جماعت الاخوان المسلمون' کا نام چنا۔ اردن میں کافی دیر تک جماعت کے مرکز کا نام شعبہ الاخوان، یعنی مقامی جماعت کے عنوان سے تھا۔ لبنان میں شیخ احمد یوسف حمود مرحوم ومغفور کی زیرسرپرستی جماعت کا مرکز قائم ہوا تھا، اس وقت وہ اکیلے ہی وہاں پر

اخوان المسلمون کے رکن تھے۔ انھوں نے جماعت 'عبادالرحمٰن' کے نام سے اپنے کاموں کو سماجی بہبود کے دائرے تک محدود رکھا، اور بعد میں یہی تنظیم جماعت اسلامی لبنان میں تبدیل ہوگئی جو اب تک اسی نام سے کام کر رہی ہے۔ اسی طرح عراق، کویت، امارات اور دوسرے عرب ممالک میں اخوان کی تحریک نے مختلف ناموں سے کام کا آغاز کیا۔

اس سلسلے میں آخری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شام کے ایک معروف عالم دین الشیخ محمد علی ظبیان کیلانی دمشقی نے عقیدہ جمعیة الاخوان المسلمون (جماعت اخوان المسلمون کا عقیدہ) کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون تحریر کیا ہے۔ اس مضمون کا صحیح سن اشاعت تو معلوم نہیں لیکن مضمون نگار نے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ یہ مضمون اخوان کے تاسیس کے دو سال بعد لکھا گیا، یعنی اندازاً ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت نہ ریڈیو تھا اور نہ ٹیلی ویژن، لیکن اس کے باوجود انھیں شام میں جماعت اخوان اور اس کے عقائد کی تفصیلی معلومات پہنچ گئی تھیں۔ انھوں نے ان بہت سے کاموں کا ذکر کیا جو اخوان نے سرانجام دیے ہیں، اور اپنی بات ختم کرتے ہوئے لکھا:

> میری نظر میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا سب سے بڑا سبب اپنے دین سے دوری ہے۔ ان کی اصلاح اور بہتری کی صورت یہ ہے کہ وہ صدقِ دل سے اسلامی تعلیمات واحکام کی طرف پلٹ آئیں۔ اس ہدف تک رسائی بالکل ممکن ہے، بشرطیکہ مسلمان اس کے لیے کمربستہ ہوجائیں۔ میں اخوان کے اصول ومبادی پر قائم اور ثابت رہنے کا وعدہ کرتا ہوں اور اس کے ہر کارکن کے لیے میرے دل میں جگہ ہے، اور میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اس راہ میں اپنی آخری سانس تک ایک تابع دار سپاہی کی طرح زندگی بسر کروں گا...... میرے مسلمان بھائی، یہ تیرے اخوان المسلمون کے بھائیوں کا عقیدہ ہے اس کو مضبوطی سے تھام لو اور اگر تم اپنے اور تمام مسلمانوں کے لیے خیر اور بھلائی کا ارادہ رکھتے ہو، تو ہر روز مسلسل اس کی طرف لوگوں کو دعوت دو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اس عقیدے کی خدمت کی توفیق بخشے اور اس کے مطابق زندگی گزارتے ہوئے اسی راہ میں موت بھی عطا فرمائے۔ وہی ہمارے لیے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

جماعت کی تاسیس کے تھوڑے ہی عرصے بعد استاد علی طنطاوی نے کہا تھا: حقیقی معنوں اور منظم شکل میں دعوت دین کا آغاز جواں سال حسن البنا نے کیا ہے۔ میں نے اس وقت ان کو پہچان لیا تھا جب وہ میرے خالو محب الدین الخطیب کے پاس سلفیہ پریس میں آیا کرتے تھے۔ ابتدائی زمانے ہی سے وقار، سکون اور سنجیدگی ان کی طبیعت پر غالب تھی۔ بہترین اور عمدہ اخلاق کے مالک تھے۔ بڑی باایمان شخصیت تھے۔ زبان میں بلا کی تاثیر اور فصاحت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوسروں کو قائل کرنے، پیچیدہ اور لاینحل مسائل کو سلجھانے کی عجب صلاحیت سے نوازا تھا۔ وہ مختلف فیہ امور میں اتفاق پیدا کرنے کی بے پناہ استعداد رکھتے تھے۔

○ **میدانِ سیاست:** امام حسن البنا نے سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس حوالے سے اتنا زیادہ کام کیا، جس کا بیان ممکن نہیں۔ البتہ اس سلسلے میں ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لینے کے بارے میں ان کی راے یہ تھی کہ: ''اخوان کے نمایندے دوسری پارٹیوں کے تحت بھی انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں'' بلکہ وہ اس کو بہتر سمجھتے تھے تاکہ: ''اس طریقے سے ان تمام سیاسی پارٹیوں میں بھی اسلامی آداب و تعلیمات کو رواج دیا جاسکے''۔

اس کا تجربہ بھی کیا گیا تھا اور اس کے بڑے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ بدقسمتی سے اس وقت سے آج تک اخوان کو آزادی کے ساتھ مصر اور دوسرے عرب ممالک کے انتخابات میں حصہ لینے نہیں دیا گیا۔ اس کے باوجود مصر اور ان تمام عرب ممالک میں جن میں آزادی اور حریت کی کچھ بھی رمق باقی ہے، اخوان کو شان دار کامیابیاں نصیب ہوئیں۔

○ **تعلیم و تربیت:** شعوری زندگی کی بالکل ابتدا میں ہی وہ اپنے گاؤں محمودیہ کی مسجد میں تربیتی درس دیا کرتے تھے۔ طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے اور کبھی کبھار اجتماعی تربیتی دوروں کا انتظام بھی کرتے تھے۔ اسی دوران انھوں نے معاشرے کو منکرات سے پاک کرنے کی غرض سے 'منع محرمات انجمن' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ ان کی پوری زندگی ایک جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ اپنی فراست کی بنا پر حوادث اور واقعات کا پہلے ہی ادراک کرلیا کرتے تھے۔ جب دارالعلوم سے فارغ ہوکر اسماعیلیہ میں معلم مقرر ہوئے، اس وقت انھوں نے اسکول ہی میں مزدوروں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ وہ قہوہ خانوں اور اپنے دیگر کاموں سے واپس آکر درس میں شامل ہوتے تھے۔

وہیں پر بچوں کی تعلیم کے لیے حرا انسٹی ٹیوٹ اور بچیوں کے لیے مدرسہ امہات المومنین اور نوجوان لڑکیوں کے لیے دارالتربیۃ الاسلامیہ کا قیام عمل میں لائے، جن کو بعد میں اخوان المسلمون کی تنظیم میں شامل کیا گیا۔ واضح رہے کہ ان سب تعلیمی اداروں میں انھوں نے تمام طلبہ و طالبات کی مفت تعلیم کا انتظام کیا تھا۔ بعد کے ادوار میں جماعت نے مصر ہی میں نہیں بلکہ تمام عرب اور غیر عرب ممالک میں ہزاروں کی تعداد میں مختلف سطح کے تعلیمی ادارے قائم کیے۔

○ **بعض الزامات اور ان کی حقیقت**: عام طور پر لوگ حسن البنا کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں۔ بعض حضرات کچھ ایسی باتیں بھی کر جاتے ہیں جن سے حسن البنا کی ایذا رسانی تو ممکن نہیں، اس لیے کہ وہ تو اپنے رب کے پاس چلے گئے ہیں، البتہ یہ باتیں تحریک اسلامی کے کام میں رکاوٹ ضرور کھڑی کر دیتی ہیں۔ ذیل میں اس قسم کی دو تین باتوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

● حسن البنا کے بارے میں کہا گیا کہ: ''وہ شاہ فاروق کی حکومت کے حامی تھے''۔ یہ ایک صریح جھوٹ اور حقیقت سے بالکل عاری بات تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس حوالے سے محدود سطح پر اخوان نے حکومت کے ساتھ باہم اشتراک کیا، وہ اسکاؤٹنگ اور رضا کار خدمت گزاروں کا شعبہ ہے، اور وہ بھی سال بھر میں ایک مرتبہ ایک روز کے لیے جب دوسرے قافلوں کے ساتھ اسکاؤٹ کے قافلوں کو بھی قصر عابدین کے سامنے سے گزرنا ہوتا تھا۔ اس سالانہ سرکاری تقریب میں اخوان کے اسکاؤٹنگ گروپ کی شرکت ایک مجبوری تھی۔ اگر وہ اس میں شرکت کرنے سے انکار کرتے تو ان سے اس ادارے کا اجازت نامہ سلب کر لیا جاتا اور پھر قانونی طور پر ان کو اس میدان میں کام کرنے کی اجازت نہ ہوتی۔ یہ دراصل اس عسکری اور جہادی تربیت کا ایک راستہ تھا جو اخوان نے برطانوی سامراج کو مصر اور فلسطین اور فرانسیسی سامراج کو مراکش اور سعودی عرب سے نکالنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ اگر وہ اس علامتی عمل سے وابستہ نہ ہوتے تو یہ سلسلہ رک جاتا۔

● ایک اور الزام جسے روزنامہ شرق الاوسط ، الحیاۃ ، الوطن العربی اور بعض دیگر خبر رساں ایجنسیوں نے ایک زمانے میں بڑے پیمانے پر نشر کیا، یہ تھا کہ حسن البنا اور ایران کے مجتبیٰ نواب صفوی فدائیان اسلام کے رہنما کے درمیان گہرے تعلقات اور باہمی تعاون قائم تھا۔

یہ خبر بھی ایک من گھڑت اور جھوٹی خبر ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ۱۹۵۳ء کے اواخر میں، دمشق میں، میرے گھر پر ہی نواب صفوی کا اخوان کے ساتھ پہلا رابطہ ہوا اور پھر ۱۹۵۴ء میں بیت المقدس اور قاہرہ میں یہ سلسلہ آگے بڑھا، یعنی وہ امام حسن البنا کی شہادت کے کئی سال بعد اخوان سے متعارف ہوئے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان دونوں رہنماؤں کے درمیان تعاون کا کوئی معاہدہ طے پا گیا ہو۔ ہاں، یہ بات درست ہے کہ امام البنا نے شیعہ سنی اختلافات کو کم کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں، مَیں نے اور محمد تقی قمی نے ایک ساتھ کام کیا۔

○ **جہاد اور جہد مسلسل:** اس میدان میں تو وہ ازہر کے اساتذہ اور شیوخ اور دوسری پارٹیوں اور اداروں کے زعما و قائدین میں بالکل ایک نمایاں اور امتیازی مقام رکھتے تھے۔ اس میدان میں صرف ان کے شاگردوں اور اخوان کے کارکنان نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ ۴۰ کے عشرے کے آغاز ہی سے جہاد کے اہداف کے حصول کی خاطر انھوں نے مصری فوج کے اندر حلقہ قائم کرلیا اور استاد صاغ محمود لبیب کو ان فوجی دستوں کی سرپرستی اور تربیت کے لیے مقرر کیا۔ بعد میں اس شعبے میں عبدالمنعم عبدالرؤف، جمال عبدالناصر، عبداللطیف بغدادی، صلاح سالم، حسین الشافعی، حسن ابراہیم، ابوالمکارم عبدالحئی، معروف حضری وغیرہ نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ عبدالمنعم عبدالرؤف وہی شخص تھا جس نے عزیز مصری کا طیارہ ہائی جیک کر کے لیبیا پہنچا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جرمن بہرحال انگریز استعمار سے بہتر ہے۔ اس کارروائی میں انور سادات بھی اس کے ساتھ شامل تھا۔ اگرچہ یہ دونوں گرفتار بھی ہوئے، لیکن جلد ہی وہ اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے دوبارہ مصری فوج میں واپس لوٹ آئے۔

۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب آیا تو جمال عبدالناصر فوجیوں کے اس گروہ میں شامل تھا جس نے حکومت پر قبضہ کیا، جب کہ کرنل محمد نجیب، عبدالمنعم عبدالرؤف اور ان کے ساتھ ایک اچھا خاصا گروپ پس پردہ دھکیل دیا گیا۔ ان میں سے بعض افسران جیلوں میں بند کردیے گئے۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ عبدالمنعم بہت اچھا اور پاک دل شخص تھا، لیکن اس میں کچھ ایسی کمزوریاں تھیں جس کے باعث وہ قائد نہ بن سکا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

کرنل محمد نجیب، جمال عبدالناصر اور اس وقت حکومت کے دیگر اہل کار انقلاب کے ابتدائی ایام میں فخر سے کہا کرتے تھے: ''ہم امام حسن البنا کے اصول و مبادی اور طریق کار پر کاربند ہیں''۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے ۱۲ فروری ۱۹۵۴ء کو امام حسن البنا کی قبر پر حاضری دی تھی اور اس وقت ایک بہت بڑے جلسے میں بھی شرکت کی تھی۔ محمد نجیب اور جمال عبدالناصر دونوں نے اس بڑے مجمع سے خطاب کر کے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ اسلامی نظام کے حامی اور امام حسن البنا کے پیروکار ہیں۔

○ **امام کی شہادت**: جب اخوان اور حکومت کے درمیان حالات بگڑ گئے تو نقراشی نے فلسطین میں مجاہدین کی پکڑ دھکڑ شروع کر کے انھیں پہلے عسکری مراکز اور پھر مصری جیلوں میں بند کر دیا۔ مصر میں اخوان کے ہزاروں کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں اور انھیں ابی زعبل اور دیگر صحرائی جیلوں میں پابند سلاسل کر دیا گیا۔ اخوان کے تمام اسکول، مدارس، دیگر تعلیمی اداروں، دفاتر، مراکز، کمپنیوں اور املاک کو حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

ایک مرتبہ حکومتی کارندے اخوان کے دفتر سے کارکنان کو گرفتار کر رہے تھے تو امام حسن البنا نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرتے ہوئے پولیس کی گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کی لیکن پولیس نے ان کو منع کر دیا، اور باقی سب لوگوں کو پکڑ کر لے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی حفاظت پر مامور افراد کو بھی نہ چھوڑا۔ دراصل حکومت ان کے قتل کے لیے پہلے ہی سے منصوبہ بنا چکی تھی۔

سازش کے مطابق مصطفیٰ مرعی بین الاقوامی مسائل کمیشن کے سربراہ کی وساطت سے انھیں 'الشبان المسلمین' کے دفتر لایا گیا کہ: ''حکومت اور اخوان کے درمیان جاری کشیدگی کے لیے آپ سے ایک وزیر ملاقات کرنا چاہتا ہے تاکہ باہمی مفاہمت سے کوئی حل تلاش کیا جاسکے''۔ امام حسن البنا وعدے کے مطابق وہاں پہنچے لیکن کافی انتظار کے باوجود کوئی وزیر نہ آیا، جس پر آپ اپنے بہنوئی استاذ عبدالکریم منصور کے ہمراہ دفتر سے باہر نکلنے لگے کہ بجلی منقطع کر دی گئی۔ آپ ٹیکسی میں بیٹھے ہی تھے کہ اندھا دھند فائرنگ کر کے آپ کو زخمی کر دیا گیا۔ تاہم کاری زخموں کے باوجود آپ 'الشبان المسلمین' کے دفتر واپس لوٹ آئے۔ وہاں سے آپ کو 'القصر العینی' ہسپتال پہنچا دیا گیا، لیکن آدھی رات تک آپ کو طبی امداد سے محروم رکھا گیا۔ آپ کے جسم سے مسلسل خون

بہہ رہا تھا یہاں تک کہ اسی ہسپتال میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے، انا للّٰہ وانا الیہ رٰجعون۔

شاہ فاروق کے عہد میں اس قتل کی کوئی تحقیق نہیں کی گئی۔ تمام وزارتوں میں اس فائل کو سیل کر دیا گیا۔ یہ فائل برابر بند پڑی رہی۔ یہاں تک کہ فوجی انقلاب کا زمانہ آیا تو نئے سرے سے تحقیقات شروع ہوئیں، جس کے نتیجے میں ۱۹۵۴ء کو امن عامہ کے ڈائرکٹر جنرل محمود عبدالمجید کو ۱۵سال اور مخبر احمد حسین جاد کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ بدقسمتی سے اسی سال جب اخوان اور جمال عبدالناصر کے درمیان حالات مزید بگڑ گئے، تو ان دونوں مجرموں کو رہا کر دیا گیا۔

یہ تھا امام البنا، ان کا عظیم مشن اور جہاد اور جہدِ مسلسل کا مختصر سا تذکرہ جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے وہ فی الواقع امام اور مرشد تھے ـــــ یہ بات درست ہے کہ وہ معصوم نہیں تھے، اور بنی آدم سے خطا کا صدور ایک فطری امر ہے۔ عصمت تو صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے جو براہِ راست اپنے پروردگار کا پیغام پہنچانے پر مامور تھے۔ جماعت اسلامی پاکستان کا استاذ البنا کی یادوں کا تذکرہ کرنا ہمیں یاد دلاتا ہے کہ درحقیقت ہر عظیم ہستی کی خیر اور بھلائیوں کا تذکرہ ایک اعلیٰ قدر ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ امام البنا کو جنت میں اعلیٰ وارفع مقام دے اور ان کو اجرِ عظیم سے نوازے۔

٭٭٭

لاکھوں افراد کا مرشد

احسان عبدالقدوس ○

کسی بھی ٹیکسی پر سوار ہو جائیں اور ڈرائیور سے بس اتنا کہیں: 'اخوان المسلمون جناب!' وہ مڑ کر یہ تک نہیں پوچھے گا کہ اخوان المسلمون سے آپ کی کیا مراد ہے، نہ یہ دریافت کرے گا کہ یہ کہاں واقع ہے۔ بلکہ وہ کوئی اور سوال کیے بغیر آپ کو سیدھا اخوان کے مرکز لے جائے گا۔ رخصت کرتے وقت وہ ڈرائیوروں کے عمومی رویے کے برعکس ایک دل آویز مسکراہٹ سے آپ کو نوازتے ہوئے کرایہ تک لینے سے انکار کر دے گا۔ ہاں! روانگی سے قبل عزت مآب استاذ حسن البنا مرشد عام اخوان المسلمون کے نام سلام پہنچانے کا آپ کو ضرور پابند کرے گا۔ مرکز پہنچ کر آپ الماریوں کے بیچ میں بنے راستوں پر چلتے جائیں تو آپ کا سامنا اخوان کے ذمہ داران سے ہوگا۔

یہ اخوان ہیں کون؟ نوجوان--- آپ ان کے چہروں کو تقویٰ اور ایمان کے نور سے جگمگاتا پائیں گے۔ ان کی آنکھوں میں جہاد اور عزیمت کی شجاعت اور ہونٹوں پر محبت واخوت سے لبریز مسکراہٹ نظر آتی ہے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں تسبیح جس پہ ہر دم اللہ کا ذکر جاری ہے۔

لیکن اس کے باوجود وہ ماڈرن قسم کے نوجوان ہیں۔ ان میں روایتی علما اور ان کے پیروکاروں والا جمود ہے، نہ ان کی باتیں خالی خولی تعویذ گنڈوں کے گرد گھومتی ہیں، بلکہ وہ نہایت حقیقت پسند نوجوان ہیں۔ ہاں وہ اس نظام حیات کو بدلنے کے لیے صرف آخرت کی نہیں بلکہ اس دنیاوی زندگی کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ ان کے دل آسمانوں میں ہیں مگر قدم زمین پر۔ اسی کے

○ مصر کے بلند پایہ صحافی۔ مترجم: حافظ محمد عبداللہ

سہارے وہ اپنے ساتھیوں میں چلتے پھرتے، ان کے کام آتے، ان کی مشکلات حل کرتے اور ان کی ہر خوشی اور غم میں شریک رہتے ہیں۔ ان میں آپ کو، محفل کو زعفران زار بنانے والے خوش مزاج لوگ بھی ملیں گے اور معیشت و قانون، انجینیرنگ اور میڈیکل کے اسرار و رموز سے واقف ماہرین بھی، وہ سب اکٹھے ہیں--- استاذ حسن البنا دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ایک قرآنی آیت اور اس کے بعد ایک دو اشعار پر بات کا اختتام۔ پھر کسی بات سے بات نکال کر ایک بھرپور قہقہہ، جس میں سب حاضرین بھی شریک ہو جائیں اور زندگی مسکرا اٹھے۔

اس آدمی میں کوئی چیز بھی تو غیر معمولی نہیں ہے۔ اگر آپ اسے سرِراہ ملیں تو شاید ہی قابلِ التفات ٹھیرائیں، سوائے ان کے نحیف و نزار جسم، کالی سیاہ داڑھی کے، جوان کے انگریزی لباس اور حد درجہ جاذب نظر سرخ ٹوپی پر عجب بہار دیتی ہے۔ آپ کا ذہن یہ سوال اٹھائے بنا نہیں رہ سکتا کہ اس شخص نے اپنے اردگرد کیسے، آخر کیسے اتنے اخوان کو اکٹھا کرلیا ہے؟ ایسی بے مثال تنظیم کو منظم کرنے میں کیونکر کامیابی حاصل کرلی ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد آپ جان جائیں گے کہ اس آدمی کا اصل جوہر اس کی گفتگو کے انداز میں چھپا ہوا ہے۔ اس کا دھیما اور باوقار انداز، افکار و خیالات کا تسلسل اور گفتگو کا باہم منطقی ربط ہم قدم ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر چیز یہ ہے کہ یہ آدمی آپ کے دل میں پیدا ہونے والے اعتراضات تک بھانپ جاتا ہے۔ ایسے انداز میں اپنے جوابات سے ایک کے بعد ایک شک کا کانٹا نکالتا چلا جاتا ہے کہ بحث و مباحثے کا موقع ہی نہ آئے۔

بے حد ذہین، پہلی ہی نظر میں آپ کی شخصیت اور نفسیات کا تجزیہ کرلینے کا ماہر۔ شاید میرے داخل ہوتے ہی اس نے بھانپ لیا تھا کہ میں سیکڑوں الزامات و اعتراضات لیے ہوئے ہوں اور چاہتا ہوں کہ ان سے بحث کروں۔ ان کی فطانت کا اندازہ کیجیے کہ گفت و شنید مکمل ہونے پر' میری روانگی سے قبل ہی مجھے جماعت کے مالیاتی حساب کی رپورٹ تھما دی۔ اس رپورٹ میں آپ کو حیران کن نکات ملتے ہیں۔

''یہ ایک بھائی ہیں چاہتے ہیں کہ اخوان کے مقامی دفتر کی خریداری میں حصہ ڈالیں، لیکن اس وقت ان کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس لیے، انھوں نے اپنی زمین بیچ ڈالی ہے اور

اس میں سے ۴۰۰ مربع میٹر زمین اخوان کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس کنٹریکٹ اور وقف شدہ پیسوں کی کاربن کاپی رپورٹ کے ساتھ منسلک ہے"۔

"یہ ایک خاتون ہیں، ان کے پاس بھی دینے کو کچھ نہیں۔ انھوں نے اپنا واحد منقولہ سرمایہ سونے کی بالیاں اخوان کے حوالے کر دی ہیں"۔ ان بالیوں کی تصویر بھی رپورٹ کے ساتھ منسلک ہے۔ "یہ صاحب ممبئ (انڈیا) سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے ممبئ کمیونٹی میں کمیٹی فنڈ کی داغ بیل ڈالی ہے تاکہ اخوان المسلمون کے لیے مرکز کے قیام میں مدد دی جاسکے"۔

یہ صاحب اپنی بیوی پر برہم ہیں چاہتے ہیں کہ اپنے مال میں سے اخوان کے لیے ایک مصری پاؤنڈ وقف کر دیں، لیکن بیوی چاہتی ہیں کہ ایک نہیں تین پاؤنڈ دینے ہیں۔ اب دونوں اپنا جھگڑا لیے استاذ حسن البنا کے پاس آگئے ہیں۔ جھگڑا نبٹانے کی خاطر امام نے فیصلہ دیا ہے کہ آپ سے صرف دو فی صد اعانت لی جائے گی"۔

"یہ صاحب عراق سے ہیں، انھوں نے اپنی اعانت جناب عبدالرحمٰن عزام پاشا کے ہاتھ ارسال کی ہے"---"ایک اور معاون اپنا سارے کا سارا مال اخوان کی خدمت میں پیش کرنے کا عہد کر رہے ہیں کہ جماعت میرے مال میں سے جو چاہتی ہے، لے لے"۔ معاونین میں کئی ارکان پارلیمنٹ کا نام بھی شامل ہے۔ کئی بڑی بڑی شخصیات اور ذہین وفطین جوان جن کے بارے میں کسی کا سان گمان بھی نہ تھا کہ استاذ حسن البنا پر اعتماد کرنے والوں میں یہ نام بھی شامل ہو سکتے ہیں۔

ملاقات کے دوران استاذ حسن البنا نے اخوان المسلمون کے فکر وفلسفے کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتایا، کہ یہ فکر کہاں سے پھوٹی اور کہاں تک پہنچی۔ وہ کہہ رہے تھے: "اسلام کے نام لیوا اسلام کی پوری اور مکمل تفہیم وتطبیق سے قاصر تھے۔ اسلام معروف معنوں میں ایک مذہب نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل سیاسی واقتصادی اور سماجی نظام ہے۔ مصر اپنے اردگرد ناقص اخلاق کے حاملین پاتا تھا۔ اس میں سیاسی اقتصادی اور سماجی اصلاح کی کمی تھی"۔

"اخوان المسلمون کی فکر دوسری پارٹیوں کی مانند کسی ایک میدان میں اصلاحات تک محدود نہیں۔ ہم کسی عمومی سیاسی جماعت کی طرح نرے سیاسی ہیں نہ کمیونسٹوں کی طرح صرف اقتصادیات تک محدود بلکہ ہم بفضل خدا ہر اس مشکل کو دور کرنا چاہتے ہیں جن سے مصر بلکہ پورا

مشرق دوچار ہے۔ جس کے لیے اسلام اور اس کے قانونِ اساسی، قرآن کریم کے سوا کوئی دوسرا جامع اور مکمل نظام دکھائی نہیں دیتا کہ اس کے دامن رحمت میں پناہ لی جاسکے۔

امام البنا نے آغازِ کار میں اپنی مساعی کو مسلمانوں کو خرافات سے پاک اسلام کے صحیح فہم سے روشناس کروانے تک محدود رکھا، اسلام کی آفاقی محبت و اخوت کو لوگوں کے درمیان پروان چڑھایا۔ پھر اسلام کے سماجی، اقتصادی نظام کے نفاذ کی کوششیں شروع کیں۔ ان کا پختہ یقین ہے کہ: ''مصر دینی حوالے سے نہایت حساس ملک ہے۔ یہاں کوئی بھی صالح تحریک اور پاکیزہ قدم صرف اسی صورت میں کامیاب ہوسکتا ہے جب اسے دین کی بنیاد حاصل ہو۔ مصری اسی بنیاد پر اپنے وطن سے محبت بھی کرتے ہیں۔ مصری دین ہی کے نام پر منظم ہوتے ہیں اور بڑی سے بڑی جدوجہد کے لیے آمادہ پیکار رہتے ہیں۔ دین سے منحرف ہر دعوت یہاں ہمیشہ ناکامی سے دوچار ہوئی ہے''۔

میں نے امام سے کہا: ''لیکن آج تو دین ہر جگہ اور زندگی کے ہر میدان میں نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ بھلا ہم شپنگ اور فضائی قوانین کی جگہ قرآنی قوانین کیسے لاگو کرسکتے ہیں''۔ امام نے اپنی ترکی ٹوپی ماتھے سے پیچھے سرکائی اور کہا: ''قرآن ابد تک کے لیے ہے۔ اسے ابد تک ہر زمانے پر نافذ ہونا ہے۔ جاہلیت کی انتہا سے لے کر وقوع قیامت تک۔ اگر آپ قرآن کی سطروں میں جھانکیں تو آپ کو وہ قوانین بھی ملیں گے جنھیں آج کی سپر پاور تلاش کر رہی ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ہمیں جس قانون کی ضرورت بھی پڑتی ہے وہ اپنی تمام تفاصیل اور جزئیات کے ساتھ قرآن میں من وعن موجود ہے۔ ہاں ہم قوانین وضع کرتے ہوئے ان بنیادی اصولوں اور حدود کا رکو ضرور مدنظر رکھیں جو اسلام نے ہمیں بتائی ہیں''۔

میں نے کہا: ''کیا آپ کو یقین ہے کہ ہمارے درمیان بسنے والے غیرمسلم اور ان کے پشت پناہ ممالک قرآنی قوانین کی تطبیق پر راضی ہوجائیں گے، جیسے چور کا ہاتھ کاٹنا وغیرہ؟'' یہاں استاذ نے اپنے سامنے پڑے میز پر ہاتھ مارا اور مجلس میں موجود ان کے نائب، ایک ڈاکٹر اور وکیل بھی اس گرما گرم بحث میں شریک ہوگئے۔ امام نے کہا: ''فرض کیجیے انگریز مسلمان ہوتے اور اپنے ہاں اسلامی قوانین کا نفاذ کر رہے ہوتے تو بالیقین ان میں سے کوئی ایک انگریز بھی یہ سوال کرنے والا موجود نہ ہوتا کہ چور کا ہاتھ کاٹنے پر دیگر اقوام راضی ہوں گی یا نہیں؟ یہ صرف ہماری کمزوری اور

کم ہمتی ہے جو ایسے سوالات کرنے پر مجبور کرتی ہے اور شریعت اسلامیہ کے بدلے، ادھار پر لیے ہوئے یورپی قوانین کے نفاذ پر اکساتی ہے۔ اب تو نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ عالمی عدالت انصاف کی حالیہ کانفرنس میں اسے قابل ترمیم شریعت قرار دیا گیا ہے۔ جزیرۃ العرب میں ایک امریکی فوجی پر چوری کا مقدمہ چلا اور اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا سنائی گئی۔ فوجی کمانڈر نے جب اس پر احتجاج کیا تو شاہ عبدالعزیز بن سعود نے کہلوا بھیجا کہ یا تو عدالت کا فیصلہ نافذ ہوگا یا پھر میں امریکی اموال کی حفاظت کی ضمانت دینے کو تیار نہیں ہوں۔ اس پر امریکا کو جھکنا پڑا اور عدالتی فیصلے کا نفاذ عمل میں آیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاہ عبدالعزیز کو امریکی صدر نے باقاعدہ شکریے کا خط لکھا کہ جناب کو امریکی اموال کی حفاظت کا اس قدر شدید خیال ہے۔ پھر یہ بھی پیش نظر رہے کہ حدود یعنی سزا کا نفاذ قاضی کی اپنی صواب دید پر ہے۔ اس سلسلے میں آپؐ کا قول ہے: ادرؤا الحدود بالشبہات۔ قاضی کو پورا اختیار حاصل ہے وہ شدید سے شدید تر اور نرم سے نرم تر سزا دے سکتا ہے"۔

میں نے کہا: "آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کی دعوت قدامت پرستی کی دعوت نہیں ہے؟ ایسی دعوت تو ہمیں گروہی اختلافات کا شکار کر دے گی۔ انگریز انھی اختلافات کو تو ہمارے داخلی معاملات میں مداخلت کے لیے استعمال کرتا آیا ہے اور آج بھی ہندستان میں یہی کچھ کر رہا ہے"۔

امام نے بڑے محکم لہجے میں کہا: "اسلام نے اہل کتاب کے ساتھ بھلائی کی تلقین کی ہے۔ ہم صحیح دینی بنیادوں پر قائم ہونے والی ہر تحریک کی تائید کرتے ہیں۔ سارے مذاہب اپنے اصولوں اور اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کے باب میں متفق ہیں۔ مصر میں بسنے والے دوسرے ادیان کے پیروکاروں سے ہمارے بہترین تعلقات قائم ہیں"۔

میں نے پوچھا! "کیا آپ کی تگ ودو وزارت عظمیٰ کے منصب تک رسائی کے لیے ہے؟"

جواب تھا! ہم ہر ایسی حکومت کی تائید کرتے ہیں جو صحیح دین کے نفاذ کا پروگرام رکھتی ہو۔ ایسی وزارت خواہ ہماری ہو یا کسی اور کی، ہم ہر حال میں اس کی تائید کرتے رہیں گے۔ مصر کا موجودہ دستور میرے قول کی تائید کر رہا ہے۔ دستور میں باقاعدہ درج ہے کہ دین اسلام ہمارا سرکاری مذہب ہے۔ یعنی ہمارے تمام ادارے، قوانین اور ہمارے سرکاری اقدامات سبھی کچھ دینِ اسلام کے اصولوں کے تابع ہونے چاہییں"۔

***

کتاب نما

چند موصولہ کتب:

۱۔تفسیر ابن عباسؓ، مولف: ابوطاہر محمد بن یعقوب الفیروزآبادی متوفی ۸۱۷ھ،مع کتاب لِباب النُقولِ فِی اسباب النُزول ازعلامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، ترجمہ قرآن از فتح محمد جالندھری، ترجمہ تفسیر ومقدمہ پروفیسر محمد سعید احمد عاطف۔ مجلاتی سائز،پہلی جلد صفحات ۵۳۵ ہدیہ ۳۹۰' دوسری جلد صفحات ۴۶۴ ہدیہ ۳۴۰، تیسری جلد صفحات ۵۰۴، ہدیہ ۳۷۰روپے۔ناشر: مکی دارالکتب، ۴۲ میکلیگن روڈ' چوک اے جی آفس' لاہور فون:042-7239138

۲۔ زبدۃ البیان فی تفسیر القرآن المعروف تفسیر المدنی الصغیر'

ترجمہ وتفسیر مولانا محمد اسحاق خان، صفحات ۸۵۲ مجلاتی سائز۔ ہدیہ درج نہیں۔

ناشر دارالعلوم الاسلامیہ، پلندری ضلع سدھنوتی۔ آزاد کشمیر

۳۔ مثالی عورت قرآن وسنت کے آئینے میں ،ڈاکٹر محمد علی الہاشمی۔ترجمہ: محمود عالمؒ، تدوین: یوسف ریاض۔صفحات: ۵۲۸۔ قیمت درج نہیں۔ناشر: الدارالعالمیہ للکتاب الاسلامی۔

۴۔ غم نہ کریں ،ڈاکٹر عائض القرنی،ترجمہ: غطریف شہباز ندوی، تدوین: محمود عالمؒ نظر ثانی، یوسف ریاض۔ناشر: الدار العالمیہ للکتاب الاسلامی، پوسٹ بکس ۵۵۱۹۵ ریاض ۱۱۵۳۴۔ ای میل:iiph@iiph.com.sa،فون:۴۶۵۰۸۱۸۔ لاتحزن عربی میں ۱۰ لاکھ شائع ہو چکی ہے۔

۵۔ اسلامی تمدن کے ۱۴ اساسی اصول و ضوابط،

ڈاکٹر ایچ بی خان، ناشر: الحمد اکادمی، 18/1-J-2 ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

صفحات (بڑی تقطیع): ۴۲۴ قیمت: ۳۵۰ روپے۔

اے ہمارے پروردگار!

[زمین وآسمان اور رات دن]
یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے
تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے

پس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے
درحقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈال دیا، پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا
مالک، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور
کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔
ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی،
پس اے ہمارے آقا جو قصور
ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما۔
جو برائیاں ہم میں ہیں انھیں دور کردے،
اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔

خداوندا

جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کیے ہیں، ان کو ہمارے ساتھ پورا کر،
اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال۔
بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔

آل عمران: ۱۹۱۔۱۹۴

اپنے ادارے کے لیے، اپنے گھر کے لیے، اپنی لائبریری کے لیے

سال میں ایک دفعہ صرف ۲۷۸۰ روپے ادا کر کے آپ ۱۲ مہینے یہ ۱۲ رسائل حاصل کر سکتے ہیں، جن میں سے دو ہر ہفتے آئیں گے۔

کیا تم نے غور کیا

یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو، اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اُس کے بنانے والے ہم ہیں؟ ہم نے تمھارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے، اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمھیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو، پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟

کبھی تم نے سوچا

یہ بیج جو تم بوتے ہو، ان سے کھیتیاں تم اُگاتے ہو یا اُن کے اُگانے کو والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اِن کھیتوں کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو اُلٹی چٹی پڑ گئی، بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔

کبھی تم نے خیال کیا

یہ آگ جو تم سلگاتے ہو، اِس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے، یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اُس کو یاددہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لیے سامانِ زیست بنایا ہے۔ [الواقعہ: ۵۶: ۵۸۔۷۲]

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

قرطبہ سٹی

امن اور علم کی بستی اکیسویں صدی کا محورِ تعلیم و تحقیق



محلِ وقوع و آب و ہوا:

قرطبہ سٹی کے لئے جگہ کا انتخاب چکری انٹرچینج، موٹروے (M2) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ جگہ اسلام آباد، راولپنڈی سے 30 منٹ کی ڈرائیو (50 کلومیٹر تقریباً) پر تحصیل راولپنڈی میں واقع ہے۔ کوہ خیری مُورت کے دامن میں واقع یہ علاقہ قدرتی مناظر سے مالا مال ہے۔ اس کا موسم اور نشیب و فراز اسلام آباد سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کے درمیان سے دریائے سِل بل کھاتا ہوا گزرتا ہے جس میں قدرتی چشموں کی وجہ سے سارا سال پانی کا بہاؤ رہتا ہے۔

شہری سہولیات و خصوصیات:

❀ تمام سہولیات جو ایک جدید شہر میں ہوتی ہیں ❀ شجر کاری اور اس کی مستقل دیکھ بھال گھروں کے معیاری نقشہ جات کی فراہمی۔
❀ قرطبہ سٹی کا اندرونی ٹرانسپورٹ کا نظام ❀ قرطبہ سٹی سے اسلام آباد، راولپنڈی تک ٹرانسپورٹ کی سہولت ❀ منصوبے کو آبادکاری کے دوران مالی لحاظ سے خود کفیل رکھنے کا نظام۔
❀ اسلامی معاشرتی اقدار کے فروغ کے لئے شہری زندگی اور ہمسائیگی کے خصوصی بائی لاز ❀ تمام شہری سہولیات کی فراہمی اور مستقل دیکھ بھال کا نظام۔

منصوبے کی خصوصیات:



❀ قرطبہ سٹی کے وسط میں وسیع و عریض بین الاقوامی قرطبہ یونیورسٹی کا قیام و انصرام۔ یہ یونیورسٹی جدید سائنسی اور معاشرتی علوم پر تحقیق اور اُن کو اسلامی قدروں میں ڈھالنے کا محور ہوگی۔ ❀ ایک عظیم الشان مرکزی جامع مسجد قرطبہ کا قیام و انصرام۔ یہ جامع مسجد یونیورسٹی سے ملحقہ ہوگی اور یونیورسٹی کے مقاصد کے حصول میں کلیدی کردار کی حامل ہوگی۔ ❀ خواتین کے لئے خصوصی کاروباری مراکز و تفریحی مقامات۔

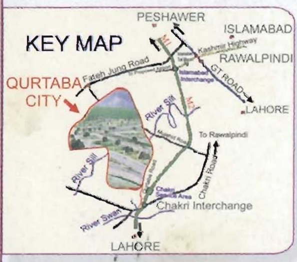
ترقیاتی کاموں کی صورتِ حال اور ماسٹر پلان:

❀ اس عظیم الشان منصوبے کے لیے 4 سے زائد ملحقہ موضع جات میں زمین کی خرید کی جا چکی ہے۔ اِن میں سے ایک موضع کی زمین کو یکجا کیا جا چکا ہے (الحمدُ اللہ)۔ اور بقیہ موضع جات میں یکجا کرنے کا عمل جاری ہے۔ منصوبے کے حجم کے پیش نظر اس کی منصوبہ بندی اور تکنیکی کام مُلک کے مشہور اور مایہ ناز تکنیکی منصوبہ ساز اور کنسلٹنٹ میسرز نیسپاک (نیشنل انجینئرنگ سروسز پاکستان) کو سونپا گیا ہے۔ نیسپاک نے ایک جامع شہری منصوبہ پیش کر دیا ہے۔ اور یکجا ہونے والے وسیع رقبہ کی منصوبہ بندی مکمل کر دی ہے۔ انجینئرز کا تیار کردہ ماسٹر پلان TMA کے پاس منظوری کے لئے جمع کروا دیا گیا ہے۔ اور تکنیکی مرحلوں سے گزر کر اب یہ ماسٹر پلان منظوری کے آخری مرحلہ میں ہے۔



پراجیکٹ آفس اور سائیٹ کا مشاہدہ:

❀ عظیم الشان منصوبے کی ضرورت کے مطابق تمام جدید سہولیات سے مزین پراجیکٹ آفس کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ اور جلد ہی انجینئرز اس آفس میں تعمیراتی کاموں کی نگرانی کا آغاز کر دیں گے۔ آپ سائیٹ کے مشاہدہ کے لیے چکری انٹرچینج موٹروے (M2) سے نکل کر اشارتی بورڈز کے مطابق پراجیکٹ آفس کا دورہ کر سکتے ہیں۔



پلاٹ بکنگ:

❀ ٹاؤن پلاننگ کی منظوری کے ساتھ ہی مزید پلاٹ بکنگ کے لئے پیش کر دیے جائیں گے۔
اور ساتھ ہی الاٹمنٹ کا طریقہ کار اور نئی قیمتوں کا تعین بھی کر دیا جائے گا۔

موجودہ پلاٹ ہولڈرز متوجہ ہوں:

❀ قرطبہ سٹی کے دفتر سے رابطہ کر کے اپنا ڈاک کا پتہ درست کروائیں تاکہ ڈاک کی ترسیل یقینی بنائی جا سکے۔ ایڈریس تبدیل کرنے کے لئے فارم دفتر سے حاصل کریں۔ اقساط پر بکنگ کروانے والے حضرات فوری طور پر اپنی بقایا اقساط جدول کے مطابق ادا کر دیں۔ بقایا جات جاننے کے لئے دفتر سے رابطہ قائم کریں۔
خواتین و حضرات اپنی رائے اور تجاویز سے مدینۃ العلم کے پتہ پر یا Email کے ذریعہ آگاہ کریں۔

مدینۃ العلم
Madina Tul Ilm
فلیٹ نمبر 4، فسٹ فلور، خیبر پلازہ، فضل حق روڈ، بلیو ایریا، اسلام آباد
فون: 92-51-2206380 فیکس: 92-51-2270411
info@qurtabacity.com

Rev. 4.0

L.R.L 99 Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE. Ph: 7587916 Fax: 7585590

